تعارف تہذیبِ مغرب

اور

فلسفہ جدید

- ★ عصرِ حاضر میں اسلام پر کفر کی نظریاتی وفکری یلغار ؟
- ★ اسلام پر کیے جانے والے جملہ اعتراضات کا حل
- ★ کفر کی بدلی ہوئی شکلیں لبرل ازم، سیکولرازم، ماڈرن ازم، جدیدیت، روشن خیالی، آزادی، مساوات، جمہوریت، سول سوسائٹی، ہیومن رائٹس کی وضاحت
- ★ تہذیب مغرب کی ابتداء وارتقاء
- ★ سائنس اور اسلام کی ہم آہنگی کا جائزہ

تصنیف

پروفیسر مفتی محمد احمد

تعارف تہذیبِ مغرب

اور

فلسفہ جدید

تصنیف

پروفیسر مفتی محمد احمد

انتساب

عصرِ حاضر میں جبکہ مادیت پرستی کا اس قدر غلبہ ہے کہ ہر فرد اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ مادیت کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ اسی ماحول میں چند افراد ایسے بھی ہیں جو ایک ایسی علمیت کو محفوظ کرنے میں صلاحیتیں صرف کررہے ہیں جس علمیت سے عالمِ کفر لرزہ براندام ہے۔ ہمیں تو شاید احساس نہ ہو مگر عالمِ کفر جانتا ہے کہ یہ افراد نظامِ کفر کے لیے کس قدر خطرہ ہیں اس کائنات میں کسی بھی فکر، تحریک، نظریات وتعلیمات خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی کسی میں اتنا دم نہیں کہ وہ مغربی نظامِ زندگی کے سامنے کھڑے بھی ہوسکیں چہ جائیکہ اس سسٹم کے مقابلے میں کوئی اور نظامِ زندگی (سسٹم) پیش کرسکیں۔

اس کائنات میں صرف ایک علمیت ایسی ہے جو اہلِ مغرب کے مبینہ سسٹم کے مقابلے میں کوئی دوسرا نظام زندگی (سسٹم) پیش کرسکتی ہے صرف اسی علمیت میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں رہنمائی موجود ہے۔ میری مراد اسلامی علمیت ہے یہ محض نظریاتی نہیں ہے بلکہ ایک طویل عرصہ تک اس کے مبیّنہ نظامِ زندگی پر عمل کیا جاتا رہا ہے۔ جس علمیت میں جمہوریت کی بجائے خلافت، سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے خاص احکام البیوع اور برٹش لاء کے مقابلے میں احکام القضاء تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

الغرض عصرِ حاضر کا کفر اس علمیت سے دہشت کھاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس علمیت کے

حاملین ہی کوئی ایسا نظام پیش کر سکتے ہیں جو موجودہ کفر کے لیے انہدام کا سبب بنے گا۔ان کی نظر میں یہی لوگ دہشت گرد ہیں کیونکہ اس علمیت سے متاثر افراد کبھی بھی کسی دوسرے نظامِ زندگی پر مطمئن نہیں ہو سکتے، ان کو اگر کبھی موقع ملا تو یہ اس علمیت سے پھوٹنے والے نظام کے احیاء کے لیے کوشاں ہوں گے۔ بلکہ اجتماعیت پر اس خاص نظام کو نافذ کرنا اپنے دین کا تقاضا اور اس کے نفاذ میں کوتاہی کرنے کو جرم سمجھتے ہیں۔ان کے علاوہ اس دنیا کی کسی فکر، خیال یا تعلیمات میں اتنا دم نہیں جو مغربی یلغار کا مقابلہ کر سکے۔اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا سسٹم پیش کر سکے۔

میں اپنی اس کاوش کو منسوب کرتا ہوں اسی علمیت کی حفاظت میں کوشاں افراد کے نام۔

ترتیب

الباب الثانی

الباب الثالث

الباب الرابع

الباب الخامس

الباب السادس

حصہ دوم

فلسفہ جدید

o……☆……o

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

عن عصمة بن قیسؓ قال : انه كان يتعوّذ من فتنة المشرق قيل فكيف فتنة المغرب قال تلك اعظم

ترجمہ:

”نبی کریم ﷺ فتنہ مشرق سے پناہ مانگا کرتے تھے آپ سے دریافت کیا گیا کہ مغرب کا فتنہ کیسا ہوگا۔آپ نے فرمایا کہ وہ تو بہت ہی بڑا ہے بہت ہی بڑا ہے“۔

معجم طبرانی میں یہ حدیث عصمہ بن قیس سلمی صحابی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

حدیث مبارک کے ظاہری الفاظ اس فتنہ کی سنگینی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں عین ممکن ہے جناب نبی اکرم ﷺ نے انہی فتنہ انگیز نظریات کے بارے میں فرمایا ہو جو اہل مغرب اپنائے ہوئے ہیں جن پر ان کی معاشرت قائم ہے اور جنکی دعوت لوگوں کو دے رہے ہیں۔کیونکہ نفس پرستی وعیش طلبی کی عالمگیر تحریک جس نے اقوام عالم کو اس قدر متاثر کیا ہو شاید اس سے قبل کبھی رونما نہیں ہوئی۔انبیاء ومرسلین کی ہمدردانہ دعوت جن لوگوں کے حق میں غیر موثر ثابت ہوئی یہ وہی لوگ تھے جو یہ نعرہ لگایا کرتے تھے”ان هی الا حیاتنا

الدنیا'' یہ لوگ صرف دنیا کی زندگی ہی کو معیار گردانتے تھے گزشتہ امتوں میں یہ نعرہ انفرادی طور پر تو بعض افراد لگایا کرتے تھے مگر کسی قوم نے اجتماعی طور پر اسے اصول زندگی کے طور پر نہیں اپنایا تھا مگر مغربی فکر کا ہدف اول و ہدف آخر صرف اور صرف دنیا کی عیش طلبی اور نفس پرستی ہے۔ مغربی سوچ و فکر کوئی پراپوگنڈہ نہیں ہے جو اہل مغرب نے اقوام عالم کے مذاہب کے خلاف گھڑا ہو اس لیے ایسا ہونا ناممکن ہے کہ محض مغربی فکر و فلسفہ کی حقیقت کو ظاہر کر دینے کے بعد لوگوں کے ذہن سے اس کا طلسم ٹوٹ جائے گا بلکہ یہ لذت پرستی و نفس پرستی اور دنیا میں عیش طلبی کی تحریک ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک ذاتی کشش رکھتی ہے اور نفس امارہ اس طرز زندگی اور انداز فکر کو تسلیم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا جس کی وجہ سے یہ روز افزوں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس فکر و فلسفہ کو اپنانے کے بعد اہل مغرب جس موڑ پر کھڑے ہیں اس سے کوئی بھی بے خبر نہیں۔ ان لوگوں کی اپنے مذہب سے ناآشنائی اور خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر جانا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لیکن پھر بھی ہماری قوم میں مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ بلا سوچے سمجھے مغربی فکر و فلسفہ کی اصطلاحات کی توجیہات پیش کی جاتی ہے اور ان نظریات اور نظامِ زندگی کو اپنے مذہب اور عقل کے ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس لیے بندہ نے ضرورت محسوس کی کہ اپنا مقالہ جو محترم و مکرم استاذی حضرت مولانا مفتی حماد اللہ وحید صاحب دامت برکاتہم کی نگرانی اور جناب ڈاکٹر خالد جامعی (ڈاریکٹر شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی یونیورسٹی) کی معاونت سے لکھا تھا اس میں کچھ تبدیلیاں اور ضروری مباحث کو شامل کر کے کتابی شکل دے دی جائے۔

تا کہ میرے مسلمان بھائی جو دین کی خدمت میں مصروف ہیں ان اصولوں کو جان لیں جن اصولوں کو بنیاد بنا کر مغربی دنیا یا وہ لوگ جو مغربی تہذیب سے متاثر ہیں اسلام اور مسلمانوں پر اعتراضات کرتے ہیں۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے کہ مغربی فکر

کی توضیح وتشریح وہی بیان کی جائے جو اہل مغرب مراد لیتے ہیں۔اور ان اصولوں کو اپنانے سے جو خرابیاں جنم لیتی ہیں ان کی وضاحت کی جائے۔اور اسلام میں اس فکر کی کیا حیثیت ہے اس کو ظاہر کیا ہے تا کہ ہر وہ سوال جو اس فکر وفلسفہ سے متاثر ہو کر کیا جائے اس کا جواب دینے میں کوئی الجھن پیش نہ آئے اور شرح صدر کے ساتھ اسلام کی بات سمجھائی جا سکے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم فلسفہ یعنی یونانی فلسفہ امام غزالیؒ کے نفیس کام کے بعد اپنی بنیادوں کے ساتھ منہدم ہو گیا تھا پہلے ایک عرصہ تک لوگ اس فلسفہ سے متاثر تھے اس یونانی فکر وفلسفہ کو بنیاد بنا کر دین اسلام کی جزئیات پر اعتراضات رقم کیا کرتے تھے۔

لیکن دور حاضر میں عوام یونانی فکر وفلسفہ سے مرعوب نہیں ہیں بلکہ سترھویں صدی کے بعد اس کی جگہ آہستہ آہستہ مغربی فکر وفلسفہ نے لے لی اور آج کل اسلام اور مسلمانوں پر کیے جانے والے اعتراضات کے پس منظر میں جو سوچ کارفرما ہوتی ہے وہ مغربی فکر وفلسفہ کی ہوتی ہے۔

مغربی فکر کو جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں استعمال کی جانے والی اصطلاحات ایسی پرکشش اور مبہم ہیں کہ ہر مذہب والا اپنے زعم کے مطابق تشریح کر سکتا ہے حالانکہ ان نظریات اور اصطلاحات کا تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد دہریت اور الحاد پر ہے۔جیسے

(Freedom) آزادی

(Enlightenment) روشن خیالی

(Human Right) انسانی حقوق وغیرہ

حق کو باطل سے الگ کرنے کی یہ چھوٹی سے سعی اس طفل مکتب کی ہے جو تحریر و بیان کے کمالات سے خالی اور کلام میں ادب و چاشنی ڈالنے والے اصولوں سے ناواقف ہے اس کم علم و بے مایہ کی اہل علم وفن اور اصحاب بصیرت سے گزارش ہے کہ اگر اس موضوع

کومزید مفصل، لطیف و پرکشش اور عام فہم انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے تو ضرور توجہ فرمائیں اور امت کی کشتی کو اس گرداب سے نکالیں۔

میں شکر گذار ہوں ان سب حضرات کا جنہوں نے اس کاوش میں میری مدد کی خاص طور پر میرے عزیز دوست مولانا مفتی مسعود الٰہی صاحب اور مولانا ابوبکر سعید صاحب کا۔ اللہ تعالیٰ اس سعی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور امت مسلمہ کی ہر نظری و عملی فتنہ سے حفاظت فرمائے۔ آمین!

محمد احمد
فاضل جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد
متخصص جامعہ انوار القران، کراچی
شب جمعہ 18 رمضان المبارک 1432ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین
الصلاۃ والسلام علی سیدالمرسلین

انسان کے کردار پراس کی سوچ کا گہرا اثر ہوتا ہے جس طرح کے عقائدونظریات ہوں گے اعمال اس کے مطابق ہوں گے جس شخص کے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں تو وہ اس کے اعمال ظاہرہ اور کردار پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک فرد کا معاملہ ہے اسی طرح کسی قوم کے اجتماعی رجحانات ایک اجتماعی سوچ وفکر ایک نیا تمدنی نقشہ قائم کرتے ہیں۔ درحقیقت سوچ ہی سے اعمال کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ خاص سوچ وفکر، نظریہ وعقیدہ جس کی بنیاد پر عمل وجود میں آتا ہے اس کو تہذیب کہتے ہیں۔ اوراس فکر کے نتیجے میں جو اندازِ زندگی اور رہن سہن کا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے اس کو تمدن کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اس تہذیب سے مراد وہ نظریات افکار اور خیالات ہیں جس کی وجہ سے اہل مغرب نے اپنا موجودہ تمدنی نقشہ (رہن سہن کا انداز) قائم کیا ہوا ہے۔

ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کے رہن سہن، بودوباش میں کیا خوبیاں یا خامیاں ہیں ان میں جرائم پیشہ کتنے ہیں؟ نشہ کرنے والوں کی شرح فیصد کیا ہے؟ اپنے تباہ شدہ خاندانی نظام سے کس قدر پریشان ہیں بلکہ ہم ان نظریات اورافکار کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے جن نظریات کی بدولت آج ان کی یہ حالت ہوگئی ہے۔

اکثر اوقات کسی کے رہن سہن اور بودوباش کو تہذیب سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ تو

تمدن ہے تہذیب کے مطالعے کا مطلب ہے ان خیالات وافکار کا جائزہ لیا جائے جن کی وجہ سے وہ ایک خاص سمت کی طرف عملی طور پر جارہے ہیں۔

دورحاضر میں اہل مغرب کی حیران کن ایجادات اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی سائنسی ترقی کی بدولت غیر مغربی اقوام اس قدر مرعوب ہیں کہ اہل مغرب کی طرف سے آیا ہوا ہر نعرہ بغیر سوچے سمجھے قبول کیا جاتا ہے ادھر سے اٹھنے والے نعروں کی اپنے زعم وگمان کے مطابق تشریح کر کے اس کی پرُ زور حمایت کی جاتی ہے۔

مثلاً آزادی کا نعرہ، مساوات کا فلسفہ یہ سب اہل مغرب کی اختراع ہے۔

غیر مغربی اقوام نے ان نظریات کو تنقید کی نظر سے دیکھے بغیر مسلمہ اصول کے طور پر قبول کرلیا۔ اوران نظریات کی تشریح اپنے گمان کے مطابق کرنے لگے مختلف قومیں اس بات پر مصر ہیں کہ اِن کا مذہب ان نظریات کی بھرپور حمایت کرتا ہے کہ یہ نظریات اہل مغرب نے انہی سے اخذ کیے ہیں بعض کلمہ گو مسلمان بھی دین اسلام سے ان خود ساختہ اصولوں کی توثیق پیش کرتے ہیں۔ اورقرآن وسنت سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ اسلام میں بھی آزادی ہے اسلام بھی مساوات کا حامی ہے، حالانکہ آزادی اور مساوات کا وہ مطلب جو اہل مغرب مراد لیتے ہیں اور ان کے مفکرین آزادی کی جو تشریح پیش کرتے ہیں اس طرح کا معنی مراد لینا اسلام تو کیا دنیا کا کوئی بھی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا آزادی ، مساوات اور دیگر نظریات جو اہل مغرب کی طرف سے آتے ہیں ان کی وہی تشریح وتعبیر معتبر ہوگی جو مغربی مفکرین بیان کریں۔ اس لیے کہ منشأ کلام متکلم خود بتایا کرتا ہے بات کرنے والا ہی اس چیز کا حق دار ہوتا ہے کہ بتائے میری مراد اس جملہ سے یہ ہے۔

جب اہل مغرب کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اسلام کو ناپنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اہل مغرب تو کجا مسلمانوں کو بھی اسلامی طریقہ زندگی قدیم، اجڈ اور فرسودہ نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب مذہب کو عقل کے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی جاتی ہے تو بہت سی چیزیں بالائے فہم ہونے کی وجہ سے عجیب معلوم ہوتی ہیں درحقیقت یہ کجی و نقص

اسلام میں نہیں بلکہ اس آئینہ میں ہے جس کے ذریعہ اسلام کو دیکھا جارہا ہے۔
نقص ان ناقص آلات میں ہے جن سے دین اسلام کے اضلاع کو ناپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
اس لیے اہل مغرب کے مختراع اصولوں کا نقص واضح ہونے سے وہ تمام اعتراضات جوان اصولوں سے جنم لیتے تھے ختم ہو جائیں گے۔
مثلاً: مساوات ایک مسلمہ اصول ہے۔ مغربی مفکرین مساوات کا جو معنی بیان کرتے ہیں اس کی وجہ سے مندرجہ ذیل اعتراضات اسلام پر کیے جاتے ہیں۔

1۔ میّت کا لڑکا اور لڑکی میراث میں برابر کے شریک کیوں نہیں؟
2۔ مردوزن کی دیت میں مساوات کیوں نہیں ہے؟
3۔ طلاق کا حق صرف مرد کو کیوں ملتا ہے؟
4۔ عورت جمعہ کا خطبہ اور امامت کیوں نہیں کرواسکتی؟
5۔ چار شادیاں مرد کرسکتا ہے عورت کو یہ حق کیوں نہیں ہے؟
6۔ طلاق کی عدت کے احکام صرف عورت پر لگتے ہیں مرد پر کیوں نہیں؟

یہ اعتراضات اس وقت ہوتے ہیں جب مساوات کو قدر یعنی حق و ناحق، خیر وشر اچھائی و برائی جاننے کے آلے کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔
احکام شریعت میں صحیح وسقم، ٹھیک اور غلط کا اندازہ لگانے کیلئے صرف اور صرف وحی الٰہی (قرآن سنت) پیمانہ بن سکتی ہے جو کچھ احکامات ان میں آ گئے وہ حق اور سچ ہیں۔
باقی رہا فلسفہ مساوات تو حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام مساوات کا نہیں عدل کا حامی ہے احکامِ اسلام میں عدل ہی عدل ہے۔
نظریہ مساوات اور عدل میں فرق آنے والے ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔

اہمیتِ موضوع

جب قومیں مغلوب ہوتی ہیں تو صرف شمشیر وسنان تیر وترکش ہی مغلوب نہیں ہوتے بلکہ پوری قوم کی سوچ وفکر، ذہنیت، اندازِ فکر، زاویہ نظر تک متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں بھی غلامی کی جھلک نظر آتی ہے۔

مغل بادشاہوں کی حکمرانی کے بعد پاک وہند میں مسلمانوں کی جگہ انگریزوں نے لے لی اور تقریباً 200 سال تک برصغیر پاک وہند انگریزوں کے زیر اثر رہا۔ 1947ء کے بعد اگرچہ خودمختار ریاستیں قائم کر دی گئیں۔ مگر آزادی کے باوجود سوچ وفکر پر مغربی اقوام سے مرعوبیت کا بھوت سوار رہا اس مرعوبیت کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔

1۔ اپنی تاریخ سے ناواقفیت۔
2۔ سائنس وٹیکنالوجی میں حیران کن ترقی۔
3۔ انگریز کا تیار کردہ نظام تعلیم وذہن سازی۔
4۔ مغربی تہذیب (فکر وفلسفہ) سے ناواقفیت۔

ان سب میں سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مغربی تہذیب کے فکر وفلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اگر سنجیدگی سے اس کے اساسی افکار وعقائد مقاصد زندگی اور تصور حیات کو سمجھ لیتے تو یہ بات مغربیت کے غبارے سے ہوا نکال دینے کے لئے کافی ہوتی اور ہم اپنی روایات، اسلامی انداز زندگی وطرز معاشرت کو کبھی بھی ترک نہ کرتے۔

بہت سے حضرات مغربی تہذیب کو عیسائیت کے مترادف خیال کرتے ہیں، یا مغربی تہذیب (فکر وفلسفہ) کو یورپی تہذیب کے مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں حالانکہ مغربی فکر ان دونوں سے الگ ایک جداگانہ تصور ہے۔ جداگانہ نظریہ حیات ہے۔ مغربی فکر وفلسفہ (تہذیب) کی کئی شاخیں ہیں۔

ماڈرن ازم	Modernism
پوسٹ ماڈرن ازم	Post Modernism
سیکولرازم	Secularism
لبرل ازم	Liberalism
روشن خیالی	Enlightenment

مغربی تہذیب نہ تو عیسائیت کی روادار ہے نہ ہی یورپی تہذیب کی پابند ہے بلکہ اس کے اپنے اصول ومبادی ہیں اپنے خاص نظریات وتصوراتِ زندگی ہیں جس میں کسی مذہب کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا اژدھا ہے جس نے تمام مذاہب سماویہ وغیر سماویہ کو نگلنے کی کوشش کی ہے جس میں کسی بھی مذہب خواہ وہ عیسائیت ہو یا یہودیت ہو ہندو مذہب ہو یا اسلام اس کو صرف ایک فرد کا نجی معاملہ سمجھ کر برداشت کیا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کا مختصر خلاصہ صرف یہ نکلتا ہے کہ یہ انسانوں کا تیار کردہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں اعلیٰ اتھارٹی خدا کی بجائے انسان کے پاس ہے۔ کیا چیز خیر (اچھی) ہے؟ یہ خود بتائے گا کیا چیز شر (بری) ہے؟ اس کی تعیین بھی بندہ خود کرے گا اس تہذیب کا ماخذِ قانون قرآن یا کوئی اور کتاب مقدس کی بجائے انسانی حقوق کا عالمی منشور (Human Rights charter) ہے۔

جس میں بنیادی عقائد خدا، رسول اور کتاب پر ایمان لانے کی بجائے بنیادی عقائد آزادی مساوات اور ترقی کو قدر (یعنی اچھائی اور برائی جاننے کا پیمانہ) کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے۔ جو ان بنیادی عقائد کو تسلیم نہیں کرتا یا انسانی حقوق کے عالمی منشور کو بطور قانون نہیں مانتا وہ انسان کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ اس تہذیب کی بنیادیں انہی ملحدانہ عقائد پر ہیں مگر آج بہت سی اقوام اس کی رنگینیوں سے اس قدر متاثر ہیں کہ الفاظ کو ادا کرنے اور لباس کو پہننے تک میں انہی کی نقل اتاری جاتی ہے حتیٰ کہ بچوں کو امی ابو کی بجائے ممی ڈیڈی کہنا سکھایا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ چھوٹی سی بات ہے مگر اس سے ہمیں اپنے معاشرے کا رخ معلوم ہوتا

ہے اوران کے آئیڈیل کی شناخت ہوتی ہے۔ جس طرح مٹی کی ایک چٹکی کو ہاتھ دراز کر کے ہوا میں چھوڑا جائے تو ہوا کا رُخ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں مثلاً روز بروز بدلتے الفاظ لباس میں کثرت سے ان کی مشابہت اختیار کرنا۔ اپنے طریقہ زندگی کو فرسودہ، قدیم اور غیر مہذب سمجھ کر چھوڑ دینا اور مغرب سے آنے والی ہر چیز کو حق سمجھ کر قبول کرنا نشاندہی کرتا ہے کہ ہماری قوم کا ذہن کس زاویہ سے سوچتا ہے۔

حتیٰ کہ بعض ہمارے بھائی مغرب کے حیران کن سائنسی انکشافات اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی ترقی سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ مداحین کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اوران کی تہذیب کی روشن خیالی اور نظم وضبط کے قصیدے پڑھتے ہیں اور مـــا بـــہ الا شتـــراک چیزیں (جو چیزیں آپس میں مشترک ہیں) فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ یہ اسلام میں بھی ہے جو چیزیں مغربی فکر وفلسفہ اور اسلام میں یکساں نظر آتی ہیں ان کو بیان کر کے فخر کرتے ہیں کہ یہی عالی شان بات اسلام سے بھی ثابت ہوگئی۔ اور اعلان کرتے پھرتے ہیں اسلام میں بھی یہ چیز ہے اسلام بھی اس کا درس دیتا ہے اسلام کا بھی منشاء یہ چیزیں ہیں اہل مغرب نے فلاں فلاں چیزیں اسلامی تعلیمات سے اخذ کی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایسی باتیں کرنے والا یا تو مغربی فلسفہ سے (تہذیب مغرب) سے ناواقف ہے یا پھر انتہائی درجہ کی مرعوبیت کا شکار ہو چکا ہے۔

حالانکہ یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ جب کوئی گروہ کسی اصطلاح کو استعمال کرتا ہے تو اس کا ایک اپنا پس منظر ہوتا ہے۔ اس کی مابعد الطبعیات ہوتی ہیں جس کا اثر اصطلاح کے مفہوم پر پڑتا ہے اس پس منظر کے آئینہ میں اگر اس اصطلاحی لفظ کو دیکھا جائے گا تو متکلم کی مراد تک صحیح رسائی ہوگی وگرنہ متکلم کی مراد واضح نہ ہو سکے گی اسی طرح مغرب میں جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے مثلاً آزادی، مساوات، ترقی تو اس کا ایک پس منظر ہے مابعد الطبعیات ہیں اگر وہ سامع کے پیشِ نظر نہ ہوں گی تو آزادی کا مفہوم مساوات کا معنی اور ترقی کی منشاء صحیح نہ سمجھ سکے گا۔ اوران الفاظ کی اسلامی تشریح کرنے کی کوشش کرے گا کیونکہ ہمارے علاقوں میں ان الفاظ کی مابعد الطبعیات

اور ہیں۔اجمال کے ساتھ مثال ذکر کرتا ہوجس سے بات واضح ہو جائے گی انشاءاللہ۔

مثال نمبر 1:

لفظ (عدت) کا معنی ہے شمار کرنا' گننا' لیکن جب مطلقہ عورت سے کہا جائے کہ اپنی عدت پوری کرنے کے بعد تم شادی کرسکتی ہو اس سے پہلے جائز نہیں تو اس وقت لفظ عدت سے مراد تین حیض کی مقدار ہوگی اگر حیض اس کو نہیں آتا تو عدت سے مراد تین مہینے ہوں گے غرضیکہ اس وقت لفظ (عدت) ایک خاص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔اس لئے شمار کرنا یا گننے والا معنی مراد لینا صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح مغربی دنیا میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

آزادی	Freedom
مساوات	Equality
ترقی	Development
انسانی حقوق	Human Right

ان کے اپنے مابعد الطبعیات ہیں اگر یہ الفاظ اسلامی دنیا میں استعمال ہوں تو اس سے مراد کچھ اور ہوتا ہے اور اگر مغربی دنیا استعمال کرے تو اس کا کچھ اور معنی و مفہوم ہوتا ہے کیونکہ مابعد الطبعیات (پس منظر) الگ الگ ہے۔

مغربی فکر و فلسفہ میں مساوات اس وجہ سے ہے کہ تمام انسانوں کو عقل ودیعت کی گئی ہے لہٰذا حقوق میں سب مساوی ہوں گے عورت اور مرد برابر ہوں گے حق نکاح حق طلاق حق میراث میں بھی برابر ہوں گے جو حق مرد کو ملے گا وہی عورت کو ملنا چاہیے۔

مگر اسلام میں مساوات اس بنیاد پر نہیں ہے کہ عقل میں سب برابر ہیں بلکہ اسلام میں مساوات اس وجہ سے ہے کہ اللہ کے محکوم اور عبد ہونے میں سب مساوی ہیں اللہ نے جو قانون جس کیلئے جیسا نافذ کردیا ہے اس کے نفاذ میں سب مساوی ہیں سب برابر ہیں۔جب اصطلاحات کی بنیادوں میں فرق ہے تو اس کا نتیجہ بھی الگ الگ نکلے گا۔ان مختلف نظریات سے تشکیل پانے والا عملی کردار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔

اسلامی تصور مساوات سے اخوت قائم ہوگی کیونکہ سب ایک ایسے قانون کے پابند ہیں جس کی پابندی کرنا وہ عبادت سمجھتے ہیں اور نتیجتاً حفظِ مراتب بھی بحال رہیں گے ایسی فضاء قائم ہوگی جیسی مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی۔

دورحاضر میں جب بھی بین الاقوامی سطح پر یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس وقت مساوات سے مراد وہ معنی ومفہوم ہوتا ہے جو مغربی فکر وفلسفہ میں ہے اسی طرح باقی تمام اصطلاحات کا بھی یہی حال ہے کہ مغربی فکر کا مفہوم ہی مراد ہوتا ہے اگر کوئی تاویل یا جہل کی وجہ سے دوسرا معنی مراد بھی لے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ کلام میں منشأ ومراد متکلم ہی طے کیا کرتا ہے نہ کہ کوئی دوسرا لہٰذا ضروری ہے کہ مغربی سوچ وفکر اور تصور زندگی کو مکمل پیچ وخم، تنقید وتشریح، نتائج وانجام کے ساتھ آپ کے سامنے آسان زبان میں بیان کر دیا جائے تاکہ ملحدانہ عقائد وافکار واضح ہو جائیں۔

جب مغربی تہذیب کا خبثِ باطن واضح ہو جائے گا تو مستقل طور پر رد کرنے کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ بحمد اللہ مسلمانوں میں اتنا ایمان موجود ہے کہ ان کی طبیعت ایسی مفسد چیز کو اسلام کے مقابلے میں کبھی بھی قبول نہ کرے گی۔

مغربی افکار کو جاننے کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام پر جو اعتراضات اٹھائے جا رہے ہیں اور جو شکوک وشبہات پیدا کئے جا رہے ہیں ان کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہ اعتراضات اہل مغرب اسلام پر کیوں کر رہے ہیں ان اعتراضات کی حیثیت کیا ہے؟ اعتراض کی نوعیت معلوم ہو جائے گی کہ اس اعتراض کا جواب اسلامی علمیت سے دیا جائے یا اعتراض ہی ہمیں تسلیم نہیں؟

اہل مغرب کی سوچ وفکر سے جو آدمی واقف ہے مغرب کی طرف سے آئے ہوئے ہر سوال کا جواب باآسانی دے سکتا ہے۔

کیونکہ جب ان کے بنیادی اصولوں کا نقص واضح ہو جائے گا تو ان اصولوں سے اٹھائے جانے والے اعتراضات بھی خود بخود زمین بوس ہو جائیں گے۔

یہ بات واضح رہے کہ مغربی تہذیب ایک سازش نہیں ہے جسے اہل مغرب نے تمام ادیان کو ختم کرنے کے لیے تیار کیا ہو۔

بلکہ یہ ایک فکری یلغار ہے دنیا میں لذت پرستی کی زندگی گزارنے کی ایک تحریک ہے اس فکر کا مقابلہ بھی فکر سے ہوگا وگرنہ علاقہ تو مسلمانوں کا ہوگا وطن بھی اسلامی پوری نسل کے نام بھی اسلامی مگر ذہن میں کفر بھرا ہوگا یہ کوئی اتنی مضبوط فکر وتحریک نہیں ہے جو اسلام کے سامنے کھڑی ہوسکے لیکن مسلمانوں میں سے بہت کم افراد ہیں جنہوں نے اس کے محاسبے کی فکر کی ہے جس دن اہل علم اس کے تعاقب کے درپے ہوگئے اسی دن اس کا آشیانہ بکھر جائے گا۔ بلکہ یہ اتنی ناپائے دار ہے کہ خود بخود اس کا طلسم ٹوٹ رہا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا تھا:

تمہاری تہذیب تمہارے خنجر سے خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب کی حالت تو یہ ہے کہ جن لوگوں (اہل یورپ) نے 300 سال قبل اس کو منقش ہار سمجھ کر گلے سے لگایا تھا مگر یہ دلکش وخوشنما نظر آنے والا ہار درحقیقت ایک ایسا اژدہا نکلا جس نے ان کی نسلوں کو تباہ کر دیا ان کے اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا خاندانی نظام بکھر گیا ہر فرد معاشرے میں تنہا ہو کر رہ گیا عورت کا مقام ہوس پورا کرنے والے آلہ کے سوا اور کچھ نہ رہا تمام تر مادی ترقی ہونے کے باوجود افراد بے قرار نظر آتے ہیں تمام تر عیش وعشرت کے باوجود اپنی زندگی سے تنگ ہیں اور خودکشیوں کی طرف ان کا رجحان بڑھ رہا ہے دنیاوی زندگی اپنی وسعتوں اور آزادیوں کے باوجود ان پر اس قدر تنگ ہے کہ یہ موت کو حیات پر ترجیح دینے پر مجبور ہیں بیٹا باپ کا وفادار نہیں بیٹی خاندان کے کسی فرد کی بات قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم ہے اطمینان قلب کا تو جنازہ نکل گیا ہے۔

اور آج ہماری مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ ہماری آنکھیں چندھیا گئی ہیں ہزار ہا خامیوں کے باوجود مغرب سے آنے والی ہر بات ہر طریقہ ہر کلچر ہمیں اچھا لگتا ہے۔ ان کا طرز زندگی معزز معلوم ہوتا ہے۔ مرعوبیت کا سحر اس وقت تک نہ ٹوٹے گا جب تک ہم مغربی نظر وفکر کو اس کی حقیقی شکل میں نہ دیکھ لیں۔

باب اوّل

تخلیق انسان اوّل

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات سے صرف نظر کر کے جب عقل و وجدان پر نظریات کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو قدم قدم پر انسان ٹھوکریں کھاتا ہے۔

انسان اول کون تھا؟ اس کی تخلیق کیسے ہوئی؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ اس نسل انسانی کا طرزِ زندگی کیا ہونا چاہیے؟

ان سوالات کا جواب تقریبا ہر تہذیب کے دانشوروں نے دینے کی کوشش کی ہے اور مختلف نظریات قائم کئے ہیں۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ایسے مضحکہ خیز نظریات سامنے آتے ہیں کہ انسانی عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ اہل عقل و دانش عقل کی ہزاروں الجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر جب اس مسئلہ کو حل کرتے ہیں تو کوئی کہتا ہے کہ انسان حشرات میں سے تھا پھر ترقی کر کے یہ شکل اختیار کر لی۔ کوئی کہتا ہے کہ انسان شروع سے ایسے ہی چلا آ رہا ہے۔ پھر اپنے دعووں کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں کئی مقامات پر بتایا کہ انسانیت کا آغاز انسان ہی سے ہوا ہے اول انسان سیدنا آدم علیہ السلام تھے ان کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے مٹی سے پیدا کیا تھا حضرت آدم علیہ السلام سے یہ نسل انسانی چلی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ:

خلق الانسان من صلصال کالفخار و خلق الجآن من مارج من نار (سورۃ الرحمٰن: 13,14)

ترجمہ: ”اسی نے انسان کو مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی پیدا کیا اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا“۔

قال اللہ تعالیٰ:

واذ قال ربک للملٰئکۃ انی خالق بشراً من صلصال من حماٍ مسنون (سورۃ حجر:28)

ترجمہ: ''جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں''۔

قال اللہ تعالیٰ:

قال انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین (سورۃ الزمر:76)

ترجمہ: (ابلیس) کہنے لگا میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور ان کو مٹی سے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت خاص سے ایسی مٹی سے پیدا کیا جو سخت کھنکھنانے کی صفت رکھتی تھی اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کی تین صفات بیان کی ہیں۔

صلصال	حماء مسنون
سوکھا گارا	خمیر شدہ
بجنے والا	سیاہ کیچڑ

اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ گیارہ سورتوں میں ملتا ہے مختلف اور لطیف انداز میں آپکا نام مبارک قرآن میں پچیس مرتبہ آیا ہے۔

☆۔ سورۃ البقرہ آیت: 37,35,34,33,31

☆۔ آل عمران آیت: 59,33

☆۔ المائدہ آیت: 27

☆۔ الاعراف آیت: 172,35,31,27,26,19,11

☆۔ الاسراء آیت: 70, 61

☆۔ الکہف آیت: 50

☆۔ مریم آیت: 58

☆۔ طٰہٰ آیت: 121,120,117,116,115

☆۔ یٰس آیت: 60

☆۔ حجر آیت: 33,26

☆۔ ص آیت: 74,71

ارتقاءِ نسلِ انسانی

جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لے آئے تو ان کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور سات دانے گندم کے پیش کیے حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا یہ کیا ہے انہوں نے کہا یہ وہی درخت ہے جس کے کھانے سے آپ کو منع کیا گیا تھا اور آپ نے کھا لیے حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا اب میں ان کو کیا کروں؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا آپ اس کو زمین میں کاشت کریں یہ ایک لاکھ گُنا زیادہ ہو جائیں گے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے دانوں کو زمین میں بو دیا وہ اُگ آئے پھر ان کو بھوسے سے الگ کیا پھر پیسا اور آٹا بنا کر گوندھا اور پھر روٹی بنا کر کھائی یہ بہت مشقت والا کام تھا جنت میں تو بغیر کسی مشقت کے جو دل چاہتا تھا میسر آ جاتا تھا دنیا میں یہ معاملہ نہ تھا اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ:

فلا یخر جنکما من الجنة فتشقی (سورۃ طٰہٰ: 117)

ترجمہ: (وہ ابلیس) تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔

اس قصہ کو صاحب البدایہ والنھایہ نے ذکر فرمایا ہے:

البدایہ والنھایہ : ان اول طعام اکلہ آدم فی الارض ان جاء ہ جبریل بسبع حبات من حنطة فقال ماھذا؟ قال: ھذا من الشجرة التی نھیت عنھا فاکلت منھا فقال! وما اصنع بھذا؟قال! ابذرہ فی الا رض فبذرہ وکان کل حبة منھا زنتھا ازید مں مائة الف فنبتت فحصدہ ثم درسہ ثم زراہ ثم طحنہ ثم عجنہ ثم خبزہ فاکلہ بعد جھد عظیم وتعب ونکد وذلک قولہ تعالیٰ! فلایخرجنکما من الجنة فتشقیٰ. (البدایہ والنھایہ:ص:147ج:1)

زمین پر آنے کے بعد طعام کا مسئلہ حل ہوگیا دوسرا بنیادی مسئلہ لباس کا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی انتظام فرمادیا سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے جو لباس استعمال کیا وہ بھیڑ کی اون کا تھا جسے حضرت آدم علیہ السلام نے کاتا تھا پھر اس کو بُنا اور اپنے لئے جبّہ تیار کیا اور حضرت حوا علیہا السلام کیلئے اوڑھنی اور چادر تیار کی تھی۔

کمافی البدایہ والنھایہ: وکان اول کسو تھما من شعر الضان جزّاہ ثم غزلاہ فنسج آدم لہ جبّة و لحواء درعًا وخماراً (البدایہ والنھایہ:ص:147ج:1)

الغرض حضرت آدم علیہ السلام کومختلف الصفات مٹی سے ایک خوبصورت پتلا بنایا گیا اور پھر اس میں روح داخل کی گئی تو وہ گوشت پوست کے انسان ہوگئے اور عقل وہوش قوت وارادہ، دیکھنے، بولنے، سننے سمجھنے اور چلنے پھرنے کے اوصاف کے مالک انسان بن گئے۔

تمام انبیاء علیھم السلام کا یہی عقیدہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالی نے خاک سے پیدا کیا ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ افضل آدمی کون ہے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں مٹی لی اور فرمایا کون سی افضل ہے؟ پھر اس کو ملا دیا اور کہا تم سب برابر

ہو مٹی میں سے پیدا کئے گئے ہو عزت اور اکرام کے قابل وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔

کما ذکرہ فی الروح البیان:

سئل عیسیٰ علیہ السلام ایّ الناس اشرف فقبض قبضتین من تراب ثم قال ای ھذین اشرف؟ ثم جمعھما وطرحھما وقال! الناس کلھم من تراب واکرمھم عنداللہ اتقاھم. (تفسیر روح البیان: ج9 ص91)

تخلیق حضرت حوا علیہا السلام

حضرت حوا علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت خاص کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا جیسا کہ صاحب جلالین ذکر فرماتے ہیں:

وفی التفسیر جلالین:

الذی خلقکم من نفس واحدۃ آدم وخلق منھا زوجھا حوا بالمد من ضلع من اضلاعہ الیسریٰ (تفسیر جلالین: ج1 ص69)

حضرت آدم وحوا علیہما السلام زمین پر آباد ہو گئے انہی سے نسل انسانی کا آغاز ہوا حضرت حوا کے بطن سے ایک حمل میں لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے تھے پھر دوسرے حمل سے بھی ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوتے تھے پہلے حمل کے لڑکے کی دوسرے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی سے شادی کردی جاتی اسی طرح دوسرے حمل کے لڑکے کا پہلے حمل سے پیدا ہونے والی بچی سے عقد کردیا جاتا اس طرح آبادیاں تیزی سے بڑھنے لگیں ویران اور بنجر زمینیں آبادیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

کما فی البدایۃ:

وذکروا انہ کان یولدلہ فی کل بطن ذکر وانثی وامران یزوج کل ابن اخت اخیہ التی ولدت معہ والاخر بالاخریٰ (البدایہ والنھایہ: ج1، ص138)

حضرت حوا علیھا السلام کے بطن سے ایک سو بیس حمل ہوئے جن میں ایک بچہ اور بچی ہوتی اول حمل سے جو بچہ پیدا ہوا اس کا نام قابیل تھا اور اس کے ساتھ جولڑکی پیدا ہوئی تھی اس کا نام قلیما تھا اور آخری حمل میں جو بچہ پیدا ہوا اس کا نام مغیث تھا اور اس کی بہن کا نام ام مغیث تھا۔اس تحقیق کو بھی صاحب البدایہ والنھایہ نے ذکر کیا ہے۔

کمافی البدایہ والنھایہ:

وقیل مائة وعشرین بطنا فی کل واحد ذکر وانثی اولهم قابیل واخته قلیما وآخرهم المغیث واخته ام المغیث (البدایہ والنھایہ: ج1 ،ص153)

دنیا کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا جو بچے پیدا ہوتے ان کی آگے شادیاں کردی جاتیں ان کی آگے اولاد ہوتی پھران کا بھی عقد کرادیا جاتا چونکہ سارے نبی کی اولاد تھے توحید سے آشنا تھے اس لیے حضرت آدم علیہ السلام پر تشریعی احکام نازل نہیں ہوتے تھے بلکہ اس زمین کو آباد کرنے کے طریقے ان کو سکھائے جاتے۔حضرت آدم علیہ السلام جب اس دنیا سے رخصت ہوئے اس وقت اس دنیا کی آبادی تقریباً 4لاکھ تھی جو حضرت آدم علیہ السلام کی بالواسطہ اولاد تھی۔

کمافی البدایہ:

وقد ذکر اهل التاریخ ان آدم علیه السلام لم یمت حتی رأی من ذریته من اولاد واولاد اولاده اربعمائة الف نسمه والله اعلم (البدایہ والنھایہ: ج1 ،ص153)

شب وروز یونہی گزر رہے تھے دنیا کی ویران زمینیں لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو رہی تھیں فرد سے قبیلے اور قبیلوں سے بستیاں تشکیل پارہی تھیں نسل انسانی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور آبادیاں بنتی چلی جارہیں تھیں۔

یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آ گیا آپ پہلے تشریعی نبی ہیں آپ سے پہلے انبیاء تو آئے مگر کسی پر احکام شرعیہ نازل نہیں ہوئے بلکہ زمین کو آباد کرنا اور اس

کے نظم وضبط اور خواص وغیرہ جن کا تعلق امور دنیا سے تھا ایسے احکام آتے تھے۔

حضرت نوح کے زمانے میں ہر سو جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا چکے تھے لوگ اپنے رب سے نا آشنا تھے کلمہ توحید ان کے لئے ایک اجنبی نعرہ بن چکا تھا حضرت نوح علیہ السلام نے جب ان کو کلمہ توحید کی طرف بلایا تو تمام لوگ یکسر آپ کے مخالف ہوگئے۔ علی الاعلان آپ کا انکار کرتے اور کہتے اگر تمہارا رب سچا ہے تو عذاب لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی تیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا جب ہم حکم دیں تو اپنے ماننے والوں کو لے کر اس میں سوار ہو جانا بالآخر قوم نوح پر عذاب کا وقت آ گیا۔ نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ مع اپنے مصاحبین کے کشتی میں سوار ہو جاؤ۔

ان پر آسمان برس پڑا اور زمین نے بھی اپنے چشمے جاری کر دیئے پوری روئے زمین پر پانی ہی پانی تھا سب صحرا وجنگل پہاڑوں اور وادیوں میں ہر طرف پانی کی لہریں تھیں۔ اس پانی نے سب کو ہلاک کر دیا صرف وہی افراد بچ سکے جو حضرت سیدنا نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں تھے۔

وقتِ مقررہ تک پانی کی طغیانی رہی پھر جب اللہ نے چاہا پانی اس زمین سے ختم ہو گیا آسمان بھی تھم گیا حضرت نوح علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو لے کر زمین پر اترے پھر دوبارہ نسل انسانی زمین پر آباد ہونے لگی۔

لیکن صرف حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے ہی نسل انسانی دوبارہ چلی باقی کشتی والوں میں سے کسی کے بھی اولاد نہ ہوئی اسی لئے نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہا جاتا ہے کیونکہ انہی کے تین بیٹے سام، حام، یافث سے نسل انسانی چلی۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

عن سمرةؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال سام ابو العرب وحام ابو الحبش ویافث ابو الروم۔ (ترمذی: ج2، ص158)

ترجمہ: حضرت سمرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ سام

عرب والوں کے باپ ہیں اور حام حبشہ والوں کے باپ ہیں اور
یافث روم والوں کے باپ ہیں۔
ایک حدیث مبارک میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان تین بزرگوں سے نسل انسانی کس طرح چلی۔
ارشاد نبوی ﷺ ہے:

عن ابی هريرة h قال! قال رسول الله ﷺ ولد لنوح سام وحام ويافث فولد لسام العرب وفارس والروم والخير فيهم وولد ليافث ياجوج وماجوج والترک والسقالبه ولا خير فيهم وولد لحام القبط و البربر والسودان.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ جناب نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔
نوح علیہ السلام سے سام حام اور یافث پیدا ہوئے سام سے عرب وفارس اور روم پیدا ہوئے اور ان میں بھلائی قدرے زیادہ ہے اور یافث سے یاجوج ماجوج ترک اور سقالبہ والے پیدا ہوئے ان میں بھلائی نہیں ہے اور حام سے قبط و بربر اور سوڈان پیدا ہوئے۔
غرضیکہ اقوام عالم کی تمام قومیں تمام بستیاں اور قبیلے اور شہرا نہی کی نسل میں سے ترقی کر کے آباد ہوئے ہیں چین وعرب ہندوسندھ یا جوج ماجوج ترک وفارس تمام قومیں، نسلیں، قبیلے حضرت نوح علیہ السلام کے ان تین بیٹوں کی اولاد میں سے ہیں۔

قبیلوں اور بستیوں کا قیام

جب آبادیاں بڑھ گئیں تو لوگوں نے مختلف علاقوں کا رخ کیا مختلف جگھوں پر جا کر آباد ہو گئے۔ حالات، ماحول اور طبیعت کی وجہ سے بعض کا بعض سے مزاج مختلف ہوتا ہے

جس بزرگ سے جو نسل چلی اس کی تمام اولاد اسی کی طرف اپنی نسبت کرنے لگی اسی طرح کوئی اپنے کو ہندی کوئی سندھی کوئی ترکی کوئی ایرانی و عربی کے لقب سے پکارنے لگا۔ یہی چیز ان کے باہم تعارف کا سبب بنی اللہ جل شانہ قرآن پاک میں اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:

یایھا الناس انا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوبًا وقبائل لتعارفوا (سورۃ الحجرات:13)

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔

اللہ جل شانہ نے بھی قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی شناخت کرسکو ایک دوسرے کو پہچان سکو اس لئے نہیں کہ تم ایک دوسرے پر فخر کرو یا متکبرانہ القاب لگا کر اتراتے پھرو۔

تمام انسان اور قبیلے ایک درخت کی شاخوں کی مانند ہیں جن کی جڑ ایک ہے تنا بھی ایک ہے جس سے مختلف قسم کی شاخیں پھر شاخوں سے بھی آگے شاخیں نمودار ہوئی ہیں۔

کمافی الروح المعانی:

لان القبائل تشعب منھا کتشعب اغصان الشجرہ وسمیت القبائل لانھا یقبل بعضھا علی بعض من حیث کونھا من اب واحد (تفسیر روح المعانی:ص90ج9)

ترجمہ: بلاشبہ ان تمام قبائل کی شاخیں درخت کی شاخوں کی طرح ہیں ان کا نام قبائل رکھا جاتا ہے اس لئے کہ ان میں سے بعض کو بعض اس حیثیت سے قبول کرتے ہیں کہ ان سب کا باپ ایک ہے۔

مختلف قبائل مختلف علاقوں میں آباد ہوتے گئے موسم‘ حالات اور مزاج کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے اندازِ بود و باش اور رہن سہن ایک دوسرے سے قدرے مختلف

ہو گئے اس طرح دنیا میں مختلف کلچر رونماء ہوئے اور یہ اٹل حقیقت ہے کہ انسان کی ابتداء انسان سے ہی ہوئی ہے جسے اللہ جل شانہ نے پیدا فرمایا تھا انسان کسی بندر یا حشرات الارض سے ترقی کر کے اس طرح کا انسان نہیں بنا۔

نظریہ ڈارون

اس نظریے کو مغربی دنیا میں بہت سراہا گیا ہے۔اور یہ نظریہ مغربی دنیا میں بہت مشہور ہوا کہ انسان کی ابتداء بندر سے ہوئی ہے۔اس بے بنیاد اور حقیقت سے کوسوں دور مفروضے کو اتنی شہرت کیسے مل گئی ؟اور یہ نظریہ اتنا عام کیوں ہو گیا؟اس بحث کو ذکر کرنا میرا موضوع نہیں۔میں اس نظریے کی چند خامیاں ذکر کرنے پر اکتفاء کرتا ہوں۔جس سے اس کا غلط ہونا واضح ہو جائے گا۔

☆ اس نظریے کو نام دیا جاتا ہے ''ارتقاء'' کا یہ نام دینا ہی غلط ہے کیونکہ ڈارون نے تو فطرت کے مشاہدے سے صرف یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس میں تبدیلیاں رونماء ہوتی رہتی ہیں۔تبدیلیاں رونماء ہونے کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔

1۔ چیز اپنی اصل حالت سے ترقی کر کے اس سے اچھی حالت اختیار کر لے۔

2۔ اپنی اصل حالت کو بھی برقرار نہ رکھ سکے اور اس اصل سے بھی کوئی بری حالت میں چلی جائے۔

جب اس نظریے میں ترقی اور تنزلی دونوں امکان ہیں تو انسان کے لیے ایک امکان کو ترجیح دینے کی کیا وجہ ہے؟اور اس نظریے کا نام ارتقاء صرف ترقی کی جہت کو دیکھ کر رکھ دیا گیا۔اور یہ لفظ اپنی ذاتی کشش کی وجہ سے عوام میں مشہور ہو گیا۔

☆ کہا جاتا ہے کہ انسان شروع شروع میں بندر تھا پھر اس کی کمر کی ہڈی تھوڑی سیدھی ہوئی پھر ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد کچھ اور سیدھی ہو گئی پھر ایک طویل عرصہ بعد کچھ اور سیدھی ہو گئی اور آخر کار اس کی کمر کی ہڈی جسے ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے بالکل سیدھی ہو گئی۔

سوال یہ ہے کہ دنیا میں مختلف جگہوں سے کھدائی کے دوران زمانہ قدیم میں ہلاک ہو جانے والے لوگوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے ملتے ہیں جن کے ڈھانچے بالکل موجودہ انسان

کے ڈھانچے کی طرح ہوتے ہیں اگر انسان بندر سے بنا ہے تو بندر اور انسان کے درمیان جو منزلیں انسان نے طے کی ہیں اس کا ایک ڈھانچہ بھی آج تک کسی کو نہیں ملا حالانکہ ان ڈھانچوں کی تعداد موجودہ انسانی ڈھانچوں سے پانچ گنا زیادہ ہونی چاہئے تھی کیونکہ ایک تبدیلی سے دوسری تبدیلی کے درمیان نامعلوم ہزاروں صدیوں کا فاصلہ ہوگا۔ مگر آج تک کوشش کے باوجود ان کو انسان اور بندر کے درمیانی حالتوں کا ایک نمونہ بھی نہیں مل سکا۔

☆ اگر واقعی یہ بات ہے کہ انسان روز بروز ترقی کرتا ہوا اس شکل تک پہنچا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہزاروں سال سے اس نے موجودہ شکل سے آگے ترقی کیوں نہیں کی۔

صدیوں سے انسان کی خواہش ہے کہ وہ ہوا میں اڑ سکے مگر آج تک اس کے پر نہیں نکلے انسان جس طرح اپنے سامنے کی چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے اسی طرح اس کی خواہش ہے کہ اس کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بھی اس کو خبر ہو۔ اور وہ چیزوں کو دیکھ سکے مگر آج تک کسی کی بھی ایک آنکھ پیچھے نہیں لگی۔

معلوم ہوا کہ یہ ارتقاء کا نظریہ محض اہل مغرب کا دماغی خلل ہے جس کا حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں۔ جب انسان وحی کے علوم سے نظر پھیر کر نظریات کی بنیاد عقل اور وجدان پر رکھتا ہے تو ایسی ہی ٹھوکریں کھاتا ہے۔

تہذیب کا مفہوم

تہذیب کا مطالعہ کرنے سے قبل اس کے مفہوم و معانی کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، اطوار، معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست یہ اس کی تہذیب ہے حالانکہ یہ چیزیں تہذیب کا نتیجہ اور مظہر ہوتے ہیں نفس تہذیب نہیں ہوتیں۔ تہذیب وہ فکر و فلسفہ وہ سوچ و خیال ہے جس کی بنیاد پر یہ تمدنی نقشہ قائم ہوتا ہے اور عملی صورت حال اس تہذیب کا اثر ہوتا ہے یعنی یہ شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔

تہذیب کے معانی اہل لغت کی نظر میں

صاحب مصباح اللغات کی رائے: تہذیب کا اصل مادہ ہے ہ۔ذ۔ب۔
هَذَبَ (ض) باب ضرب سے استعمال ہوتا ہے هَذَب الشجر شاخ تراشی کرنا' پا کیزہ کرنا' درست کرنا۔ هَذَب النخلة درخت کی چھال اتارنا۔ (مصباح اللغات: ص985)

هَذَب النخلة۔ کھجور کے درخت کی شاخوں کو تراش کر ٹھیک کرنا' چھال وغیرہ اتار کر صاف کرنا المهذب۔ پاکیزہ اخلاق صاف وشائستہ۔ (القاموس الوحید: ص1753)

صاحب المنجد کی رائے: هَذَب (ض) هَذَبًا الشجر وغیرہ درخت وغیرہ کی شاخ تراشی کرنا' صاف کرنا' درست کرنا هَذَب النخلة کھجور کے درخت کی چھال وغیرہ اتارنا (المنجد: ص1121)

صاحب لغات سعدی کی رائے: تہذیب درست کرنا آراستہ کرنا پاکیزہ کرنا' اصلاح کرنا' بیکار حصہ کو نکال دینا' تعلیم وتربیت کرنا' شائستگی (لغات سعدی: ص204)

صاحب نور اللغات کی رائے: تہذیب پاک کرنا' اصلاح کرنا' آراستگی' پاکیزگی' تہذیب یافتہ' تربیت یافتہ' تعلیم یافتہ۔ مثلاً: یہ دشنام کس طرح آئی تمہیں۔ یہ تہذیب کس نے سکھائی تمہیں (نور اللغات: ص326 ج1)

صاحب المنجد فی الاعلام کی رائے: هَذَب' هذبًا' الشجر وغیرہ
قطعة ونقاه اصلحه : تهذيب مطاوع هَذَب الرجل كان هذبًا الهذب' المطهر الاخلاق. (المنجد فی الاعلام: ص820)

تہذیب اور تمدن کا آپس میں تعلق:

تہذیب تعلیم وتربیت عقائد وافکار کا نام ہے اور اس کے نتیجے میں جو عمل وجود میں آتا ہے اس کو تمدن کہتے ہیں۔

تمدن کے لغوی معانی:

صاحبِ المنجد کی رائے:

مـدن (ن) مـدونا بالمكان اقامت كرنا المدينه شهر تمدن شائستہ ومہذب ہونا (المنجد: ص952)

صاحب المصباح اللغات کی رائے: **مَـدَن مـدونـا بـالمكان اقامت كرنا مَدَّن المدائن** شہر آباد کرنا تمدن شائستہ ومہذب ہونا (مصباح اللغات: ص 811)

صاحب القاموس الوحید کی رائے: **مَـدَن فَـلان مـدونـا** شہر میں ہونا کسی جگہ قیام کرنا تمدن شہری بننا' مہذب وشائستہ بننا (القاموس الوحید: ص1533)

صاحبِ لغاتِ سعدی کی رائے: تمدن شہر میں رہنا' شہر کا انتظام کرنا پیشہ وروں کو یکجا کرنا' شہر والوں کی تہذیب اختیار کرنا۔ (لغات سعدی: ص188)

صاحبِ معجم لغوی عصری کی رائے: **مَدَن' يمدَن مدونًا بالمكان' اقام به** (ص1349)

صاحبِ نور اللغات کی رائے:

تمدن شہر میں بودوباش اختیار کرنا' شہر کا انتظام کرنا' طرز معاشرت (نور اللغات: ص2699 ج4)

تہذیبوں کے بنیادی عناصر

جب کوئی عمارت قائم ہوتی ہے تو اس میں دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں (1) اس عمارت کا بنیادی ڈھانچہ جس پر وہ عمارت قائم ہوتی ہے مثلاً اس عمارت کے ستون دیواریں چھت وغیرہ۔ (2) رنگ وروغن جو اس عمارت کی زینت کے لئے استعمال ہوا ہے ان دونوں قسم کی چیزوں کی حیثیت مختلف ہوتی ہے ایک تو بطور اصل استعمال ہوتی ہے اور دوسری بطور زینت کے استعمال ہوتی ہے۔

یہی حال تہذیبوں کا ہے کچھ تو اس میں اصول ومبادی ہوتے ہیں اور کچھ چیزیں بطور زینت کے ہوتی ہیں جو کہ مختلف تہذیبیں دوسروں سے متاثر ہو کر اخذ کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ہر زمانے میں انسان کا حال اس کے ماضی سے متاثر ہوتا ہے ہر نئی تعمیر میں پچھلی تعمیرات کے مواد سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح مختلف تہذیبوں نے دوسری

تہذیبوں سے طریقہ زندگی کچھ نہ کچھ اخذ کیے ہوتے ہیں لیکن اصول ومبادی یکسر مختلف ہوتے ہیں اور اکثر اوقات مشابہت رنگ روغن، نقش ونگار اور زیب وزینت میں ہوتی ہے۔

ہر تہذیب کے کچھ بنیادی عناصر ہوتے ہیں جن سے وہ تہذیب تشکیل پاتی ہے اور دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ دنیوی زندگی کا تصور۔

2۔ زندگی کا نصب العین۔

3۔ اساسی عقائد وافکار۔

4۔ تربیت افراد۔

5۔ نظام اجتماعی۔

دنیوی زندگی کا تصور:

سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے متعلق اس کا کیا تصور ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان اس دنیا کو استعمال کرے تو کیا سمجھ کر استعمال کرے؟ تصورِ حیات کا سوال اس قدر اہم ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔

مختلف تہذیبوں میں انسان کا تصور دنیوی مختلف رہا ہے ایک صحیح الفطرت اور وسیع النظر آدمی جب دنیا پر نظر ڈالے اور دنیا کی نسبت اپنی حالت پر غور کرے تو اس کی نگاہ میں بہت سے پہلو آئیں گے۔

نوع انسانی نے اس دنیا کو مختلف انداز سے دیکھا اور اکثر ایسا ہوا کہ جس کو جو پہلو نمایاں نظر آیا اس نے حیات دنیا کے متعلق اسی پہلو کے لحاظ سے ایک نظریہ قائم کر لیا اور دوسرے پہلو پر نگاہ ڈالنے کی کوشش بھی نہ کی۔

مثال کے طور پر ایک گروہ نے انسان کی کمزوری اور بے بسی اور اس کے مقابلے میں

فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کی شوکت و جبروت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دنیا میں ایک نہایت حقیر ہستی ہے اور یہ نافع اور ضار قوتیں جو نظر آتی ہیں وہ کسی عالمگیر قانون کی تابع نہیں بلکہ خود مختار ہیں یہ تخیل ان کے ذہن پر اس قدر غالب ہوا کہ وہ پہلو جس میں انسان کو شرف حاصل ہے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اپنی ہستی کے روشن پہلو کو بھی بھول گیا۔ اور اپنی عزت و آبرو کے احساس کو اپنی کمزوری و ناتوانی کے مبالغہ آمیز اعتراف پر قربان کر دیا۔ بت پرستی، شجر پرستی، ستارہ پرستی، اور دوسرے نظائر فطرت کی پرستش اسی نظریہ کی پیداوار ہے۔

☆ ایک دوسرے گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں بس فساد ہی فساد ہے۔ تمام کارخانہ ہستی اس لئے چل رہا ہے کہ انسان کو تکلیف اور رنج پہنچائے اور دنیا میں جتنے تعلقات ہیں اور روابط قائم ہیں سب انسانوں کو پریشانیوں اور مصیبتوں میں پھانسنے والے پھندے ہیں۔ ایک انسان ہی کیا پوری کائنات افسردگی اور ہلاکت کے پنجے میں گرفتار ہے جہاں جو کچھ بنتا ہے بگڑنے کے لئے بنتا ہے بہار اس لئے آتی ہے کہ خزاں اس کے چمن کو لوٹ لے زندگی کا شجر اس لئے برگ و بار لاتا ہے کہ موت کا عفریت اس سے لطف اندوز ہو بقاء کا جمال سنور کر اس لئے بار بار آتا ہے کہ فنا کا دیوتا اس کو ہلاک کر دے اس تصور نے لوگوں کے لئے دنیا اور اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ چھوڑی انہوں نے اپنے لئے نجات کی راہ اس میں دیکھی کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں نفس کشی اور ریاضتوں سے اپنے تمام احساسات کو باطل کر دیں اور فطرت کے اس ظالم قانون کو توڑ دیں جس نے محض اپنے کارخانے کو چلانے کے لئے انسانوں کو آلہ کار بنایا ہوا ہے۔ پنڈت کی نفس کشی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

☆ ایک اور گروہ ہے اس نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس دنیا میں انسان کے لئے لذت و عیش کا سامان موجود ہے اور ایک تھوڑی مدت ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے ملی ہے۔ تکلیف اور الم کا احساس ان لذتوں کو بدمزہ کرتا ہے اگر انسان اس احساس کو باطل کر دے اور کسی چیز کو اپنے لئے موجب تکلیف اور باعث الم نہ رہنے دے تو جہاں پھر لطف ہی لطف ہے آدمی کے لئے جو کچھ ہے یہی دنیا ہے جو کچھ مزے اڑانے ہیں اسی دنیا

میں اڑانے ہیں موت کے بعد یہ سب کچھ نسیا منسیا ہو جائے گا۔

☆ اس کے مقابلے میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس دنیا اور اس کی لذتوں اور مسرتوں بلکہ خود دنیوی زندگی کو سراسر گناہ تصور کرتا ہے اس کے نزدیک انسانی روح کے لئے دنیا کی مادی آرائش ایک نجاست کا حکم رکھتی ہے جو زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے آسمان میں بادشاہی کے لئے اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

☆ ایک اور گروہ نے کائنات کا قانون ہمہ گیری دیکھ کر انسان کو مجبور محض خیال کیا اس نے نفسیاتی عضویاتی حیاتیاتی شہادتوں کو دیکھا کہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان ہرگز کوئی مرید و مختار ہستی نہیں ہے فطرت نے اسکو ایک قانون میں جکڑ دیا ہے نہ یہ اپنے ارادے سے سوچ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے نہ کسی حرکت پر قادر ہے لہٰذا اس پر اس کے فعل کی ذمہ داری نہ آئے گی۔

☆ اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان نہ صرف ایک صاحب ارادہ ہستی ہے بلکہ وہ کسی بالاتر ارادے کے ماتحت اور کسی اعلیٰ طاقت کا فرمانبردار نہیں ہے اور اپنے اعمال وافعال میں انسانی حکومت کے قانون کے علاوہ کسی اور کے سامنے جواب دینے کا پابند نہیں ہے۔ وہ اس دنیا کا مالک ہے اور دنیا کی تمام چیزوں کو اس کے لئے مسخر کیا گیا ہے اسے اختیار ہے اسے جس طرح چاہے استعمال کرے اس نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اپنے اعمال وافعال میں ایک نظم وضبط پیدا کرنے کے لئے اپنی انفرادی زندگی پر خود ہی پابندیاں عائد کرنی ہیں مگر اجتماعی حیثیت سے بالکل مطلق العنان ہے اور کسی بالاتر ہستی کے آگے مسئول ہونے کا تخیل سراسر لغو ہے۔ مغربی مفکرین اسی خیال کے حامی ہیں۔ ان کے دیگر عقائد وافکار اسی سوچ سے جنم لیتے ہیں مغربی انداز زندگی انہی باطل خیالات کی مرھون منت ہے۔

یہ دنیوی زندگی کے متعلق مختلف مذاہب کے مختلف تصورات ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر مختلف تہذیبوں کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں ہر تہذیب کی عمارت میں جو مختلف طرز و انداز ہمیں نظر آتا ہے ان کی ایک مخصوص اور جداگانہ ہئیت اختیار کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کی بنیاد میں دنیوی زندگی کا ایک خاص تصور ہے جو اس مخصوص ہئیت کا مقتضی ہوتا ہے۔

زندگی کا نصب العین:

تصور حیات کے بعد دوسرا اہم سوال جو تہذیب کے حسن و قبح کو جاننے کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے' یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کے سامنے کون سا نصب العین پیش کرتی ہے؟ اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انسان کے ارادوں اور اس کی عملی کوششوں کا رخ فطری طور پر اسی منتہا اور اسی مقصود کی طرف پھرتا ہے۔ اس کے صحیح اور غلط ہونے اور اس کی اچھائی یا برائی کی زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی درستی یا نادرستی کا انحصار اس کے نصب العین کے ساتھ ہوتا ہے۔

بالجملہ نصب العین ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت انسان فکر و عمل کی بہت سی راہوں کو اختیار کرتا ہے۔ اپنی ذہنی اور روحانی قوتوں کو اور اپنے مادی وسائل کو اسی راہ میں صرف کر دیتا ہے ۔لہٰذا جب ہم کسی تہذیب کو غلط اور صحیح کے معیار پر جانچنا چاہیں تو ہم اس کے نصب العین معلوم کرنے کی جستجو کریں گے کیونکہ جس طرح کا نصب العین ہوگا اس کی باقی زندگی عملی اعتبار سے اس کے حصول میں خود بخود ڈھلتی چلی جائے گی۔ اور اس سوچ کے مطابق اعمال تشکیل پائیں گے۔

دنیا کی مختلف تہذیبوں نے جو مختلف نصب العین پیش کئے ہیں انہیں بھی اگر جزئیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں بہت کچھ اختلافات پائے جائیں گے جن کو تفصیل سے بیان کرنا یہاں مقصود نہیں اور نہ ہی ممکن ہے لیکن اصولی حیثیت سے ان سب تہذیبوں کو دو قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

1۔ جن تہذیبوں کی بنیاد کسی مذہبی یا روحانی تخیل پر نہیں انہوں نے اپنے متبعین کے سامنے تفوق اور برتری کا نصب العین پیش کیا ہے۔ یہ نصب العین متعدد اجزاء سے مرکب ہوتا ہے جن میں سے خاص اور اہم اجزاء ترکیبی یہ ہیں۔

☆ سیاسی غلبہ و استعلیٰ کی طلب۔

☆ دولت و ثروت میں سب سے آگے بڑھ جانے کی خواہش قطع نظر اس سے کہ وہ فتح ممالک کے ذریعے سے ہو یا تجارت و صنعت پر حاوی ہونے کی بدولت ہو۔

☆ عمرانی ترقی کے مظاہر میں سب پر برتری لے جانے کی خواہش خواہ وہ علوم وفنون کے اعتبار سے ہو یا آثارِ مدنیت وتہذیب کے اعتبار سے ہو۔(اسلامی تہذیب اوراس کے اصول ومبادی:ص20)

دنیا میں تفوق اور برتری کا نصب العین رکھنے والی صرف ایک ہی قوم نہیں بلکہ ایک زمانے میں متعدد قومیں اپنے سامنے یہی نصب العین رکھتی ہیں۔اور سب اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں شدید سیاسی ومعاشی وتمدنی کش مکش برپا ہوتی ہے۔

2۔ جن تہذیبوں کی بنیادیں مذہبی یا روحانی تخیل پر رکھیں گئی ہیں انہوں نے عموماً اپنا نصب العین نجات کو قرار دیا ہے۔بلاشبہ اس نصب العین میں وہ روحانی عنصر موجود ہے جو انسان کو سکون اور اطمینان قلب بخشتا ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ نجات جس طرح ایک قوم کا نصب العین بن سکتی ہے۔اسی طرح ہر ہر فرد کا بھی نصب العین بن سکتی ہے۔

جس قوم کا جو نصب العین ہوگا اس کی عملی سرگرمیوں کا اس کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی حرکات وسکنات' ادب اور فنون لطیفہ اور دیگر اشیاء اسی نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہوں گی۔نصب العین کی تبدیلی کیوجہ سے اعمال وآداب میں فرق آجائے گا۔

اساسی افکار وعقائد:

انسان کے جملہ اعمال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔مبدأ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں ایک حالت یہ کہ اس میں خاص قسم کے خیالات راسخ نہ ہوں مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں اور ان میں سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کے لئے متحرک بن جائے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالات کی آماجگاہ نہ رہے بلکہ چند مخصوص خیالات اس طرح راسخ ہوجائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر آجائے اور اس سے منتشر اعمال صادر ہونے کی بجائے مرتب اور منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔

پہلی حالت کو ہم سڑک سے تشبیہ دیتے ہیں جو ہر آنے والے کے لئے کھلی ہوئی

ہے کسی کو کوئی خاص تخصیص نہیں۔

دوسری حالت ایک ایسے سانچے کی سی ہے جس میں ہمیشہ ایک متعین شکل و ہیئت کے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں جب انسان کا ذہن پہلی حالت میں ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیرت نہیں ہے وہ شیطان بھی ہوسکتا ہے فرشتہ بھی ہوسکتا ہے کسی بھی وقت کس طرح کے اعمال اس سے صادر ہوں کوئی تعین نہیں کی جاسکتی۔

اسکے برخلاف ہم اس دوسری ذہنیت والے آدمی کے بارے میں کہیں گے کہ یہ بندہ ایک طریقہ زندگی رکھتا ہے اس کی ایک سیرت ہے اس کی عملی زندگی میں ایک نظم ہے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کن حالات میں یہ کیا فعل کرے گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں خیالات جتنے راسخ ہوں گے اس قدر اس کی سیرت مضبوط ہوگی اور اگر مخصوص خیالات اتنے مضبوط نہیں تھے کہ وہ اس کے علاوہ خیالات کو روک سکتے تو ان زائد خیالات کے ذہن میں بیٹھنے کی وجہ سے سیرت کمزور ہوگی یعنی عملی زندگی بے نظم اور ناقابل وثوق ہوجائے گی۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ مختلف تہذیبوں کا ان راسخ خیالات یعنی (ایمان) کے اعتبار سے کیا حال ہے۔ ایمان سے مراد ہے اساسی تخیل ایمان کا وہ معنی جو مذہب میں مراد ہوتا ہے صرف ان تہذیبوں کی اساس بن سکتا ہے جس کی بنیاد ہی مذہب پر ہے۔

اور جو تہذیبیں انسانی تخیلات یا فلاسفہ کے اقوال پر قائم ہیں ان کے اساسی افکار وعقائد اور ہوتے ہیں اور اسلام کے بنیادی عقائد ان سے قدرے مختلف ہیں۔ چونکہ ہمارا موضوع مغربی تہذیب ہے لہٰذا مندرجہ ذیل خاکے میں اسلام کے بنیادی واساسی افکار کا مغربی افکار سے فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔

مغرب اور اِسلام کے اساسی نظریات میں فرق

اسلام کا اساسی نظریہ

1۔ اعلیٰ اتھارٹی

اللہ جل شانہ

یعنی کونسا کام صحیح ہے کونسا غلط ہے کیا حلال ہے کیا حرام ہے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ حکم نازل فرمائیں گے۔ انسان خود کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دینے میں آزاد نہیں ہیں ۔زنا حرام ہے یا حلال اللہ جل شانہ بتائیں گے۔

لواطت جائز ہے یا ناجائز؟

مرد سے نکاح کرنا صحیح ہے یا غلط؟

سود لینا اور دینا کیسا ہے؟

صحیح کیا ہے غلط کیا ہے حرام کیا ہے حلال کیا ہے اس کی تعین اللہ جل شانہ کریں گے۔

2۔ رہنمائی

شریعت سے لیں گے

مغربی اساسی نظریہ

1۔ اعلیٰ اتھارٹی

انسان

یعنی کون سی چیز درست ہے کونسی غلط ہے اس کا فیصلہ انسان اپنی عقل سے کرے گا۔

کسی بھی چیز کو غلط یا صحیح سمجھنے میں انسان آزاد ہے۔

زنا کرنا صحیح ہے یا غلط انسان خود طے کریں گے۔

لواطت انسانی حق ہے یا قبیح ترین عمل ہے۔ پارلیمنٹ (انسانوں کا گروہ) طے کرے گی۔ سود لینا صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ بھی انسان کریں گے۔

2۔ رہنمائی

رہنمائی حاصل کرنے کے لئے انسان عقل کے سوا کسی کا محتاج نہیں ۔ نہ ہی رسولوں کا نہ کسی کتاب کا۔

3۔ قانون انسانوں کا منتخب کردہ گروہ (پارلیمنٹ) بنائے گا۔	3۔ قانون شریعت سے اخذ کیا جائے گا۔

یہ دونوں الگ الگ نقطہ نظر ہیں ان عقائد وافکار پر جن اعمال کی بنیاد پڑے گی وہ اعمالِ زندگی اور ان کی نظم وترتیب مختلف ہوگی۔

تربیت فرد:

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت کرتی ہے جس سے وہ انسان کو اپنے نظریہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرتی ہے؟ وہ کون سے خصائل واوصاف اور نفسی خصائص ہیں جنہیں وہ انسانوں میں بیدار کرنے اور نشو ونما دینے کی کوشش کرتی ہے؟ اور اس کی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا بنتا ہے گو تہذیب کا اصل مقصد نظام اجتماعی کی تعمیر ہوا کرتا ہے لیکن افراد ہی وہ میٹیریل ہیں جس سے جماعت کا قصر بنتا ہے اور اس قصر کا استحکام اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ اس کا ہر پتھر اچھا تراشا ہوا ہو۔ ہر اینٹ خوب پکی ہوئی ہو کسی جگہ بے جان میٹیریل استعمال نہ کیا جائے۔ لہٰذا افراد سے ہی قوم بنتی ہے جس نے فرد کی تربیت نہ کی قوم کی تربیت بھی نہ کر سکے گا۔

اقبال مرحوم نے کہا تھا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

نظام اجتماعی:

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ اس کا تعلق اس کے خاندان سے کیسا ہے ہمسایوں سے اپنے بالا دستوں سے اور ماتحتوں سے تعلق کس قسم کا رکھے۔ اس کے حقوق

دوسروں پر اور دوسروں کے اس پر کیا حقوق قرار دیئے گئے ہیں اسے کن حدود کا پابند کیا گیا ہے؟ اگر آزادی اسے دی گئی ہے تو کس حد تک؟ اس سوال کے ضمن میں اخلاق' معاشرت ' قانون' سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں اور اسی سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

یہ وہ پانچ بنیادی عناصر ہیں جن کی مدد سے تہذیب کی اصلیت جانی جائے گی باقی تہذیبوں سے ایک تہذیب کا فرق معلوم ہوگا دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ بنیادی عناصر شامل ہوتے ہیں اگر آپ نے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں تو گویا آپ نے اس تہذیب کے فوائد ونقصان' نفع وضرر' صحیح وسقم کی شناخت کرلی۔ انہی بنیادی عناصر کی طرف غور کریں تو اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا فرق بالکل واضح ہوجائے گا۔ مغرب میں دنیوی زندگی کا تصور کیا ہے اور اسلام دنیوی زندگی کا تصور کیا پیش کرتا ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک زندگی کا نصب العین صرف اس دنیا کی لذت ہے اور اسلام نصب العین آخرت کو قرار دیتا ہے۔ اہل مغرب کے اساسی افکار اور اسلام کے اساسی نظریات وافکار بالکل مختلف ہیں مزید تفصیل انشاء اللہ اگلے ابواب میں آئے گی۔ لہٰذا مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی شکل جدید قرار دینا بالکل غلط ہے حقائق کا انکار ہے۔

مختلف تہذیبوں کا قیام:

تہذیبوں کے قیام کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تہذیبوں کا آغاز چار ہزار سال قبل مسیح سے ہوا تھا۔ جیسا کہ مصر وغیرہ کی شہری آبادی کو جب فروغ ملا تو سب سے اولین تہذیب رونما ہوئی۔ باقی تہذیبیں اس طرح وجود میں آئیں کہ جب لوگ قبیلوں اور بستیوں میں تقسیم ہوچکے تو مختلف معاشرے وجود میں آئے۔ ایک معاشرہ مختلف انسانی برادریوں کے لئے ایک مشترکہ میدان مہیا کرتا ہے جہاں مختلف پیشوں سے وابستہ لوگ مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ وہی معاشرہ جب بلند ہوکر ایک خاص سطح پر پہنچ جائے اور اس معاشرے کا میدان عمل دوسرے قبیلے یا معاشرے بھی اختیار کرلیں تو وہ تہذیب کہلاتا ہے اور کبھی وہی تہذیب عالمی سطح اختیار کرلیتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیا عروج وزوال کے

مرقع جملوں سے عبارت ہے کبھی ایک قوم کا تسلط ہوتا ہے تو دوسری مغلوب ہوتی ہے پھر زمانے کی گردش اس کی ترقی کو ماند کردیتی ہے۔اور ایک زمانہ آتا ہے کہ مغلوب قومیں سر اٹھانا شروع کرتی ہیں حتیٰ کہ غلبہ حاصل کرلیتی ہیں اور ہمیشہ سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ غالب قومیں مغلوبین کو مکمل اپنے قانون، افکار و نظریات اور طرز زندگی سے متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

تاریخ کے پانچ دَور

یوں تو دنیا میں بہت سی تہذیبیں گزری ہیں ان میں سے کچھ تو ایسا عالی شان تمدنی نقشہ پیش کرتی تھیں کہ ان کے بارے میں گمان کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ بھی کبھی صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی اوران کا تذکرہ تاریخ کے انبار تلے گم ہوجائے گا مگر ایسے ہی ہوا زمانے کی گردش میں بہت سے عالی شان نظام ٹوٹ گئے بہت سی منظّم تہذیبیں بکھر گئیں پھر ان کی جگہ دوسری تہذیبوں نے لے لی بالآخر وہ بھی اپنی مدت پوری کر کے تاریخ کا حصہ بن گئیں پھر کچھ اور طریقہ ہائے زندگی متعارف ہوئے وہ بھی ایک زمانہ تک چلے پھر اس تہذیب وتمدن کا ڈھانچہ بھی زمین بوس ہوگیا۔

ان تہذیبوں کی خصوصیات ان کے مسائل و وسائل فوائد و نقائص بیان کرنا میرا موضوع نہیں اور نہ ہی تفصیلی تعارف کروانے کا موقع ہے۔

بلکہ ایک طویل زمانے کے حالات و واقعات، پیش آنے والے مادی مسائل اور لوگوں کا طرز زندگی اور فکر و انداز دیکھا جائے تو ایک طویل عرصہ میں نمودار ہونے والی تہذیبیں ایک ہی رخ کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر ایک زمانہ بعد حالات و واقعات مادی مسائل و وسائل اپنا رخ بدلتے نظر آتے ہیں اوراس زمانے میں نمودار ہونے والی تہذیبیں ایک مختلف جانب سفر کرتی ہیں۔

تہذیب کا آغاز چار ہزار سال قبل مسیح سے ہوا تھا۔ پہلی تہذیب کے عروج تک چار عالمی سلطنتیں قائم ہوچکی تھیں۔ دوسری صدی قبل مسیح تک پرانی دنیا پر ان کی بالادستی تھی یہ

چار سلطنتوں پر مشتمل تھیں ۔ یہ روما' فارس' کشن اور ہس چینی سلطنتوں پر مشتمل تھیں پھر یہ ہوا کہ مہذب سلطنتوں پر حملہ کر کے ان کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ (انسانی تہذیب کے 5 دور:ص 8)

دوسرا تاریخی دور پہلے ہزار سال قبل مسیح کے وسط سے شروع ہوا یہ دور فلسفیوں پیغمبروں اور مذہبی مفکرین کے گروہ سے عبارت تھا یہیں سے فلسفے کے مکاتیب فلسفیانہ متعلقات پر مبنی مذاہب وجود میں آئے اس دور کی تاریخ تین عالمی مذاہب کی مقبولیت سے عبارت ہے بدھ مت' مسیحیت اور اسلام اور دوسرے مذاہب جن کی تخلیق ان کے باہمی میل جول سے ہوئی آخر میں یہ عالمی مذاہب فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ نظریاتی طور پر بھی سیاسی سلطنتوں کی طرح ایک دوسرے سے متصادم ہوئے دوسرے ہزار کے وسط میں یہ دور بھی اختتام کو پہنچا۔

تیسرا دَور یورپی تہذیب کے علاقائی اور تہذیبی فروغ سے شروع ہوا جس کا تعلق نشأۃ ثانیہ سے تھا ۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں جدید کاروباری ادارے قائم ہوئے یونیورسٹیوں میں سیکولر علم کے نئے طریقے نئی معلومات کو رواج ملا اور دنیا بھر میں پھیلے معاشرے سمندروں کے راستے سے ایک دوسرے سے مل گئے ابتدائی زمانے میں نئے سمندری راستے دریافت ہوئے جن کی بدولت بحر اٹلانٹک سے متصل قوموں سے سیاسی وتجارتی روابط قائم ہوئے سائنسی صنعتی اور جمہوری انقلابات رونما ہوئے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی بدولت نئے جنگی اسلحہ کے ساتھ جنگیں ہوئیں اس کا انجام پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی صورت میں سامنے آیا۔

تہذیب نے چوتھے دور میں نہایت سنجیدہ مقاصد کو قدرے سکون اور عافیت سے حاصل کرنے کے لئے عام تفریح کی طرف اپنا رخ کیا محنت کش مرد وعورت جو صنعتی معاشرے میں مشینوں کے اندر جکڑے ہوئے تھے ان میں فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فرصت کے اوقات میں اعصاب کو سکون دینے کے لئے ہلکی پھلکی تفریح کر لیں۔

الیکٹرانک کی بنائی ہوئی چیزوں نے لطیف جمالیاتی چیزوں کو مرقع کر کے نشر کرنا آسان کر دیا تو ایک نیا کلچر وجود میں آیا جو ابلاغ عامہ سے منسلک ہوا۔

زندہ ناچ گانے کی جگہ ٹیلی ویژن نے لے لی موسیقی کا بین الاقوامی کلچر پیدا ہوا

جو نو جوانوں کے ساتھ خاص تھا ذرائع سے خبروں کی ترسیل اور تفریح نے نظام سیاست کو اچانک بدل کے رکھ دیا۔

تہذیبوں کا تصادم

تہذیبوں کے درمیان سب سے اہم روابط وہ تھے جب ایک تہذیب کے افراد دوسری تہذیب کے لوگوں سے جنگ کرتے پھر اس کے نتیجے میں ان کو ختم کر دیتے یا اپنے محکوم بنا لیتے یہ روابط عام طور پر نہ صرف تشدد آمیز تھے بلکہ مختصر بھی تھے اور کبھی کبھار رونماء ہوتے تھے تاہم اس طرح کی صورت حال ساتویں صدی میں مستقل طور پر پیدا ہونے لگی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کے افراد مخالفین کو زیرِ شمشیر تو کر لیتے ہیں لیکن ایک قوت بن کر دوسروں پر مسلط ہونے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اپنے اندر بے اعتمادی اور انتشار اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ فاتح ہونے کے باوجود ایک سلطنت نہیں رکھ سکتے اس بے اعتمادی کی وجہ سے ریاست کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے غالب تہذیب مکمل طور پر اپنا اثر نہیں دکھا سکتی۔

ظاہر ہے جب غالب قومیں آپس میں ہی برسرِ پیکار ہوں تو مغلوب قومیں ان غالبین کے اثر سے محفوظ رہتی ہیں۔جیسا کہ اہل یونان کی آپس میں جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں اور جتنی تجارت آپس میں کرتے تھے اتنی جنگیں اور تجارتیں اہل فارس یا غیر یونانیوں سے نہ کرتے تھے۔

اسی طرح ہندوستان اور چین پر مغلوں اور منگولوں نے حملہ کیا مغل اور منگول فاتح بن کر ان علاقوں پر قابض ہو گئے۔مگر بہت طویل عرصہ ہند اور چین میں ایسا گزرا کہ یہ لوگ آپس میں برسر پیکار رہے اور مخالف ریاستوں کی بنیاد رکھی۔یہی وجہ تھی کہ فاتحین ایک طویل زمانہ تک حکمرانی کرنے کے باوجود وہاں کے کلچر کو تبدیل نہ کر سکے اور اپنا مکمل اثر نہ چھوڑ سکے۔

تہذیب مغرب کا تصادم:

یورپی عالم مسیحیت نے آٹھویں اور نویں صدی میں ایک الگ تہذیب کے طور پر ابھرنا شروع کیا کئی صدیوں تک یہ تہذیب باقی تہذیبوں سے بہت پیچھے تھی ٹانگ سنگ اور منگ

خاندانوں کے دور میں آٹھویں سے تیرھویں صدی تک اسلامی تہذیب ہر لحاظ سے غالب تھی۔ گیارھویں سے تیرھویں صدی کے اندر مغرب نے بھی ترقی کی طرف سفر شروع کیا۔ اور اس دور کی مہذب اور شائستہ تہذیبوں سے روشنیاں لے کر اہل مغرب اپنے گھروں کو دیوں سے مزین کرنے لگے اور ایک نئی تہذیب لے کر ابھرے جس کی بنیادیں یونانی فلسفہ پر تھیں۔ مسلمانوں کے مسلسل زوال اور علاقائی حکومتوں کے عدم استحکام کی وجہ سے مغربی دنیا کے لئے ایک موقع تھا کہ وہ اپنا سکہ جمائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے اختلافات سے بے حد فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تمام سلطنتیں ۱۹۲۰ء تک انگریزوں کے زیر اثر آ گئیں سوائے دو چھوٹے سے خطوں کے مسلمانوں کے پاس کوئی حکومت نہ تھی اس مادی تسلط سے مسلمانوں کے اندر مغربی اثرات چھوڑنے کا ان کو موقع مل گیا صرف سیاسی میدان میں ہی نہیں بلکہ فکری طور پر بھی مسلمان اپنے کو کمزور خیال کرنے لگے۔

بہر حال تاریخ فتح وشکست غلبہ اور مغلوبیت کی داستانوں سے بھری پڑی ہے قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم سیاسی ومعاشی طور پر غالب آ جائے تو مغلوب اقوام کو لاشعوری طور پر ان کا طرز زندگی اچھا لگنا شروع ہو جاتا ہے اور وہ اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ جب مسلمانوں کا غلبہ تھا تو اہل یورپ شاہان اندلس جیسا لباس پہننے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ان کا طرز و انداز اختیار کیا جاتا تھا مگر آج وہی مسلمان ہیں ان کا طرز و انداز زندگی جس تعلیم سے ماخوذ ہے وہ تعلیم بھی باقی ہے لیکن ان کو اہل یورپ کے لباس اچھے لگتے ہیں بولنے میں ان کی نقل کی جاتی ہے انہی کے طریقہ زندگی کو مہذب وشائستہ گمان کیا جاتا ہے آخر چند صدیوں میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی۔

اہل مغرب پہلے سیاسی ومعاشی طور پر مغلوب تھے بدحال تھے پھر غالب آ گئے ان کے وہ طریقے جن کو وہ خود حقیر خیال کرتے تھے غلبہ کے حصول کے بعد مغلوب قوموں نے ان کو اپنے لئے فخر کا باعث گمان کیا اور انہی میں اپنی عزت وشان سمجھی۔

اہل مشرق کے کچھ دانشور بھی اپنی تہذیب وروایات کو ترک کرتے نظر آئیں تو اس کا

یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اسلامی تہذیب کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی کوئی اہمیت ہے۔

بلکہ یہ ایک مرض ہے جس میں افراد کی بجائے اقوام مبتلا ہوتی ہیں کسی کی مادی ترقی اور غلبہ کو دیکھ کران کے دماغوں پر سحر چھا جاتا ہے پھر سب کے دماغ ایک ہی طرح سوچنے لگتے ہیں غالب قوم کا ہر نعرہ بلا سوچے سمجھے مغلوب قومیں اپنی زبانوں پر بھی جاری کر لیتی ہیں بعض حضرات کا دماغ اس سحر سے اس قدر مجروح ہو جاتا ہے کہ ان کو اپنی تہذیب اور روایات میں فرسودگی دیہاتی پن اور اجڈ نظر آنے لگتا ہے۔

یاد رکھیں کسی قوم کا ایک تہذیب کو دل وجان سے قبول کرنا اس تہذیب کے اعلی اور صحیح ہونے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔

1۔غلبہ　　　2۔مرعوبیت　　　3۔خوف

جب تہذیبوں کا تقابل کریں گے تو اصل میں اس علم کی طرف جائیں گے جس کی وجہ سے یہ تہذیب قائم ہوئی ہے ان افکار ونظریات کا جائزہ لیں گے جس کی وجہ سے وہ تمدن قائم ہوا ہے پھر ان دونوں تہذیبوں کے افکار وعقائد کا تقابل کریں گے ان افکار ونظریات کے فضائل ونقائص اچھائی اور برائی واضح کر دی جائے گی کہ کون سا تہذیبی نقشہ اعلی وارفع ہے۔

اس طریقہ سے کسی تہذیب کے بلند پایہ افکار کا علم ہوتا ہے اور اس کی شان کھل کر سامنے آتی ہے۔

گذشتہ تہذیبوں کا تعارف:

اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ جو بھی نئ عمارت بنتی ہے اس میں پہلے بنی ہوئی عمارتوں کا نقشہ ہوتا ہے یہی حال اکثر تہذیبوں کا ہے کہ ان کے ڈھانچوں میں ایک دوسرے سے مدد لی جاتی ہے خاص طور پر مغربی تہذیب جو ہمارا موضوع ہے اس میں تو بنیاد ہی یونانی فلسفہ پر ہے اور رومیوں کی اس فلسفہ میں قطع وبرید اساسی حیثیت کی حامل ہے لہٰذا مغربی فکر وفلسفہ کو جاننے سے قبل ایک نظر گذشتہ تہذیبوں پر ڈالنی ہوگی۔

دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں

قبل شیلاں تہذیب:

یہ ایک لاکھ 50 ہزار سال پرانی تہذیب ہے اس میں چقماق کے پتھر جلائے گئے ہیں وہ ان کو ناتراشیدہ اصلی حالت میں استعمال کرتے تھے لیکن بہت سے ایسے پتھر بھی ملے ہیں جو مٹی کی طرح تھے۔

شیلاں تہذیب:

یہ ایک لاکھ سال پرانی تہذیب ہے۔

آسیلین تہذیب:

تقریباً 75 ہزار سال پرانی تہذیب ہے۔

سویوترین تہذیب:

20 ہزار سال پرانی تہذیب ہے۔ چقماق کے پتھر فلسطین میں بہت بڑی مقدار میں کھود کر نکالے گئے ہیں۔

اوک لاھوما اور میگسیلو:

ان مقامات پر نیزوں کی نوکیں ملی ہیں جن کے متعلق ڈھونڈنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ 3 لاکھ 50 ہزار سال قبل مسیح کی ہیں۔ ٹیبر اسکا کے مقام سے کچھ ایسی چیزیں دریافت ہوئی ہیں جنہیں 5 لاکھ سال قبل مسیح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ (انسانی تہذیب کا ارتقاء: ص 147)

یونانی تہذیب:

یونان یورپ کے جنوب میں بحیرہ روم میں واقع ہے اس خطہ کی آب وہوا گرمیوں میں خشک اور سردیوں میں یہاں پر بارشیں ہوتی ہیں۔ سال بھر تقریباً بیس انچ کے قریب بارشیں ہوتی ہیں اور مغربی حصہ میں ایک طویل سلسلۂ کوہ ہے جو کہ کوہ ایلپس کی شاخ

ہے سب سے اونچا پہاڑ اولمپس ہے جس کی چوٹی کو یونانی اپنے دیوتاؤں کا مسکن خیال کرتے ہیں اس پہاڑ کی بلندی نو ہزار سات سو چون فٹ ہے۔

قدیم یونان کے مذہب کو کثرت بت پرستی کا نام دیا جاسکتا ہے ان کا سب سے بڑا دیوتا زوس تھا وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ یہ بادلوں کو اکٹھا کرتا ہے اور برق ورعد کے نیزے سے انہیں چھید کر مینہ برساتا ہے اس دیوتا کے دو بھائی تھے پیڈلیس اور پوزی دون اس دیوتا کی بیوی کا نام ھیرا تھا اس دیوتا کی اولاد بھی تھی تین مذکر اور چار مؤنث لوگوں نے عہدے ان پر تقسیم کئے ہوئے تھے ان میں سے ایک کو جنگ کا دیوتا خیال کیا جاتا تھا اور کسی کو صداقت کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور اس بڑے دیوتا کی ایک بیٹی کو عشق وحسن کی دیوی کہتے تھے یہ دیوتا اور دیویاں کوہ المپس کی چوٹی پر رہتے تھے۔

مؤرخین اہل یونان کے دیوتاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> قدیم یونان کے مذہب کو کثرت پرستی کا نام دیا جاسکتا ہے ان کا سب سے بڑا دیوتا زوس تھا جو بادلوں کو اکٹھا کرتا اور برق ورعد کے نیزے سے انہیں چھید کر مینہ برساتا اس کے دو بھائی بیڈلیس اور پوزی تھے اس کی بیوی کا نام ھیرا تھا زوس کی اولاد نرینہ میں اریس' اپالوٗ ہرلیس اور ہی فیسٹس تھے ایتھینا' افروڈائٹی اور آرٹیمس اس کی بیٹیاں تھیں زوس مختار مطلق تھا البتہ تقدیر کی تین دیویوں پر اس کا بھی تصرف نہیں تھا ان میں ایک دیوی قسمت کا دھاگا کاتتی ہے دوسری ہر شخص کو اس کا مقسوم دیتی اور تیسری اس دھاگے کو کاٹ دیتی ہے۔ سمندروں پر پوزی دون کی حکومت تھی اور زمین دوز مملکت پر بیڈس کا راج تھا اپالو نور اور صداقت کا دیوتا تھا۔ (روایات تمدن قدیم: ص127,126)

یونانیوں کا مذہب دیومالا کے قصوں اور رسومِ عبادت پر مشتمل تھا اس میں الہام کا معروف تصور نہیں تھا نہ کوئی خاص دستور اخلاق اس سے وابستہ تھا ان کے دیوتا انہی کی طرح انسان تھے جو ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے تھے یا معاشقے کیا کرتے تھے دراصل یونانی

اخلاق کو مذہب سے جدا سمجھتے تھے انہوں نے اخلاق کا باقاعدہ فلسفہ تیار کیا وہ ذاتی نجات کے قائل نہ تھے۔ اپنی بہترین کوششیں ریاست کی بہبود کے لئے وقف کر دیتے تھے۔

سقراط کا فلسفہ الہامیات پر مشتمل نہ تھا بلکہ اخلاقیات اور سیاسیات پر محیط تھا اواخر عمر میں اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ قومی دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا ہر بات میں تجسس سے کام لیتا ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے اس پر اسی عنوان سے مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا سنائی گئی اسی فیصلہ کی رو سے موت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

یونانی فلاسفہ کے افکار اور ان کا فلسفہ اور ہمارے زمانے میں اس کے اثرات کا بیان انشاء اللہ باب ثالث میں ہوگا۔ یونانی تہذیب میں بھی باقی تہذیبوں کی طرح ایک خاندانی نظام تھا۔ وہ اپنی بیویوں کو پردہ میں رکھتے تھے اور ان کے لیے پڑھنا لکھنا غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا صرف اربابِ نشاط کو ہی فنی تربیت اور حصولِ علم کے مواقع میسر آتے تھے۔

اربابِ نشاط کے سب سے بڑے حریف سادہ خوبصورت لڑکے تھے جن سے اظہار عشق کرنا آداب معاشرہ میں داخل تھا اہلِ یونان میں ہم جنس محبت کو ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے بلکہ شیوہ مردانگی قرار دیتے تھے۔ (روایات تمدن قدیم: ص 47)

قدیم یونانی ریاستوں میں اولمپک کے کھیل بڑے مقبول تھے ان میں شرکت کیلئے بڑے دور دور سے لوگ آتے تھے اور بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے۔ دوڑوں کے علاوہ ڈسکسی پھینکنے، نیزہ پھینکنے اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے تھے جیتنے والے کو جنگلی لارل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں کا تاج پہنایا جاتا تھا بظاہر یہ معمولی سا انعام تھا لیکن اہل یونان کے نزدیک اس سے بڑا کوئی اعزاز نہ تھا ہمارے زمانے میں دوبارہ ان کھیلوں کا احیاء ہوگیا ہے اور آج پھر دوبارہ لوگ اسی طرح شوق سے شرکت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ علمِ فلسفہ میں ان لوگوں نے خاص مقام حاصل کیا آج تک جو کچھ فلسفہ میں لکھا گیا یا آج لکھا جا رہا ہے وہ تمام یونانی افکار کی تشریح ہے فلسفہ کے مبادیات انہوں نے ہی مرتب کیے تھے۔ فن تعمیر اور سنگ تراشی میں ان کے حسین شاہکار صدیوں سے اربابِ نظر سے

خراج تحسین وصول کرر ہے ہیں مغربی تہذیب مکمل طور پر یونانی تہذیب کا عکس تو نہیں مگر مغربی تہذیب کے بہت سے اصول فلسفہ یونان سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً مذہب کو ہر فرد کا نجی معاملہ قرار دینا' مذہب اور اخلاقیات کے عملی کردار کو الگ الگ سمجھنا یعنی مذہب کو صرف عبادت کے ساتھ خاص کرنا اور مذہب کو روزمرہ کی زندگی میں مداخلت نہ کرنے دینا عبادت کے علاوہ شب وروز گزارنے کے لئے عقل وخرد سے اصول بنا کر عمل کرنا۔

یونانی فلاسفر

تقریباً چھ سو سال قبل مسیح سے یونان میں علم وحکمت کی طرف توجہ دی جانے لگی تھی' ایشیائے کوچک اور مصر کے لوگوں سے تجارتی تعلقات قائم ہونے کے علاوہ یونانیوں نے فن تحریر اور دیگر علوم بھی حاصل کئے تھے۔ پرکلیز کے عہد میں 429,459 قبل مسیح یونان میں تعلیم کو بہت عروج حاصل ہوگیا تھا اور معلمین کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا تھا جنہوں نے کائنات کے وجود اور انسان کی تخلیق کے متعلق ان نئے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا جو مذہبی روایات کے خلاف تھے۔

وہ یونانی دیوتاؤں کے وجود میں شک کرنے لگے تھے اور ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا کوئی تعلق دیوتاؤں سے نہیں تھا ان معلمین کے علاوہ یونان میں ایسے معلمین کی بھی تعلیم عام ہورہی تھی جو ارضیات اور فلکیات کے متعلق تحقیق کرر ہے تھے اور کائنات کے وجود کو سائنس کے نقطہ نظر سے ثابت کرر ہے تھے فیثا غورث نے پہلی مرتبہ فلاسفر کا لفظ استعمال کیا تھا جس کا معنی ہے عقل ودانش سے محبت پیدا کرنے والا' یونانیوں کے نزدیک فلسفہ کے معنی دنیا اور انسان کا مطالعہ کرنا اور زندگی کا صحیح راستہ متعین کرنا تھا عقل ودانش کا تقاضا یہ ہی تھا کہ انسان اپنے وجود سے کائنات کی اہمیت سے اور زندگی کے مقاصد سے واقف ہو یونان کے فلسفیوں نے کائنات کے وجود کو اور انسانی زندگی کو عقل کا پابند بنایا۔

یونان کے مشہور فلسفی سقراط، افلاطون اور ارسطو ہیں جنہوں نے یونانی فلسفہ کو انتہائی کمال تک پہنچا دیا ان تینوں میں سقراط کی تعلیمات دنیا میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوئیں۔

سقراط:

کا زمانہ (469 سے 399) قبل مسیح کا تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے ایتھنز کے شہریوں کو تعلیم دینی شروع کی اور شاگردوں کا ایک گروہ تیار کرلیا۔ سقراط اگرچہ خوبصورت نہ تھا مگر اس کی تعلیمات نے اس کے شاگردوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اس کا طریقہ تعلیم دوسروں سے مختلف تھا وہ اپنے سننے والوں سے سوال کرتا تھا اور چونکہ وہ ان سوالات کے جواب نہیں دے پاتے تھے اس لئے انہیں اپنی کم علمی کا احساس ہوتا تھا پھر سقراط خود ہی ان سوالات کے جوابات دے کر ان کے علم میں اضافہ کرتا تھا اور انہیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتا تھا اس کے شاگرد افلاطون نے مقالوں کی صورت میں اس کی تعلیمات کو جمع کیا جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانیت کا صحیح مطالعہ انسان کے ذریعے کیا جاسکتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ خود اپنے آپ کو پہچانے اور اپنی اصلاح کرے۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں جب کبھی کسی غلط فیصلے پر پہنچتا ہوں تو میری اندرونی آواز میری رہنمائی کرتی ہے اور مجھے سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔ سقراط کے یہاں تصور ملتا ہے کہ اس کے نزدیک ریاست کی اصلاح اور بقاء کے لئے ضروری ہے کہ ریاست کے افراد کی اصلاح کی جائے اور انہیں اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ اچھائی اور برائی کی تمیز کرسکیں۔ اس کے نزدیک انسان کا جسم فانی ہے لیکن روح فانی نہیں ہے وہ ایک ایسی ہستی پر یقین رکھتا تھا جو تمام کائنات پر حکمران ہے اور انسان کے اخلاق کی اصلاح اس وقت ممکن ہے جب وہ علم کی جستجو میں لگا رہے۔

سقراط نے اچھائی اور علم کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق بتایا ہے اس کے نزدیک انسان اچھائی کو صرف اس وقت حاصل کرسکتا ہے جب وہ علم کو حاصل کرے سقراط نے اپنے فلسفہ کی بنیاد اچھائی کے حصول اور سچائی کی تلاش پر رکھی مگر سچائی کو تلاش کرنے کے لیے آلہ اپنی ذات کو بنایا کہ وہ اپنی عقل سے اور وجدان سے حق تلاش کرے گا۔ اس لئے گمراہ ہوگیا اگر حق تلاش کرنے کیلئے وحی اور پیغمبروں کی تعلیمیات سے مدد لیتا تو کامیاب ہوجاتا۔

ایتھنز کے لوگ سقراط کی تعلیمات کو برداشت نہ کرسکے جوان کے قدیم مذہب سے انہیں منحرف کراتی تھیں۔ انہوں نے سقراط پر بے دینی اور نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے کا

الزام لگا کر اس پر مقدمہ چلایا۔ ایتھنز کی عوامی عدالت نے سقراط کو سزائے موت دی۔

افلاطون:

سقراط کے بہت سے شاگرد تھے مگر ان میں زیادہ ممتاز شاگرد افلاطون تھا۔ سقراط کی موت کے بعد اس نے ایتھنز میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھا اس لئے وہ ایتھنز سے باہر چلا گیا تقریباً دس سال اس نے مغربی ممالک اور مصر میں گزارے بعد میں اپنے وطن واپس لوٹا اور یہاں پر آ کر ایک تعلیم گاہ قائم کی جس کو اکیڈمی کہا جاتا تھا۔ فلسفہ سکھاتا تھا۔ اس کی اکیڈمی سے کئی مشہور لوگوں نے کسب فیض کیا مگر ارسطو کا ذکر سب سے نمایاں تھا افلاطون کی تعلیمات عام طور پر مقالات کی شکل میں ملتی ہے وہ زیادہ تر اپنی تعلیم کو سقراط سے وابستہ کرتا تھا لیکن اس کے مقالات میں اس کے اپنے نظریئے اور تعلیمات شامل ہیں وہ نہ صرف ایک فلسفی تھا بلکہ ایک شاعر بھی تھا اس نے نظریہ تصورات پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی تھی سقراط کی طرح وہ سچائی کے وجود کا قائل تھا اور وہ ساتھ ہی ساتھ یہ یقین رکھتا تھا کہ سچ غیر فانی ہے لیکن اس کے نزدیک اس طبعیاتی دنیا میں کوئی چیز مستقل نہیں ہے حتی کہ سچ بھی مستقل نہیں ہے استقلال صرف تصورات کی دنیا میں ملتا ہے اور اس تصورات کی دنیا میں حسن، سچائی، انصاف اور اچھائی کو بقاء و دوام حاصل ہے اس کے نزدیک تصورات کی دنیا جسمانی نہیں ہے بلکہ روحانی ہے اور چونکہ تصورات کی دنیا غیر فانی ہے اس لئے انسان کی روح بھی غیر فانی ہے۔ افلاطون کے مقالات کو اور در سیاست کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ افلاطون جمہوریت کے خلاف ہو گیا تھا کیونکہ اس کے استاد کو ایتھنز کی جمہوری حکومت نے موت کی سزا سنائی۔ افلاطون نظم ونسق کی ذمہ داری بجائے عوام کے ان لوگوں کے سپرد کر دینے کے حق میں تھا جو زیادہ منصف مزاج اور حق پسند ہوں۔ افلاطون نے پہلی بار ریاست کو ایک علم کی حیثیت سے پیش کیا کہ وہ خیالی جنت بن کر رہ گئی اس کے نزدیک ریاست انصاف پر قائم ہونی چاہئے کیونکہ انصاف ہی نظم ونسق کو باقی رکھ سکتا ہے۔ یہ ریاست نہ بہت بڑی ہونی چاہے نہ بہت دولت مند۔ اس ریاست میں سوسائٹی تین گروہوں میں تقسیم ہونی چاہیے۔

1۔ ایک کام کرنے والا جو لوگوں کی ضروریات زندگی مہیا کریں۔

2۔ سیاسی جو ریاست کی حفاظت کریں۔

3۔ فلسفی جو عوام کی بہتری کے لئے ریاست کا نظم و نسق چلائیں۔

افلاطون نے فرد کی آزادی کو ریاست کے تابع کرنا چاہا تھا اور افراد کی تمام حرکات پر ریاست کی نگرانی ضروری قرار دی وہ خاندان اور ذاتی جائیداد کا قائل نہ تھا بلکہ وہ جائیدادوں کو ختم کر دینا چاہتا تھا اس کی خیالی ریاست میں شعراء کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ ان کو معاشرے کے لیے غیر ضروری قرار دیتا تھا۔ اسی نے پہلی مرتبہ ایک ایسی ریاست کا تصور پیش کیا گیا جس کا قیام کسی مقصد کے پیش نظر تھا۔ غرضیکہ افلاطون نے فلسفہ اور اخلاقیات کے علوم میں ناقابل فراموش اضافے کئے اور فلسفہ سیاسیات کا بانی قرار پایا۔

ارسطو:

افلاطون کے شاگردوں میں جو اپنے استاد سے بھی نمایاں ہوا اور اس سے بھی بڑھ گیا وہ ارسطو تھا اس کا زمانہ تین سو بائیس سے تین سو چوراسی قبل مسیح تھا۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب' ص 158)

وہ ایتھنز میں ہی پیدا ہوا تھا لیکن افلاطون کی اکیڈمی میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی وہ یونان کا سب سے بڑا فلسفی تھا اور اس نے یونانی علوم کو انتہا تک پہنچا دیا تھا سکندر اعظم کے اتالیق کی حیثیت سے اس نے نہ صرف یونان کو اپنے فلسفے سے متاثر کیا بلکہ وہ تمام علاقہ جسے سکندر اعظم نے فتح کیا تھا ارسطو کے علوم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سکندر اعظم نے اس کی تحقیقات کے سلسلے میں لاکھوں روپے خرچ کئے اور ہر طرح سے اپنے استاد کی عزت افزائی کی ارسطو نے جن علوم کی تحقیقات کی اور اپنے نتائج اخذ کئے اور دنیا کو آگاہ کیا وہ علوم مندرجہ ذیل ہیں۔

o۔ منطق
o۔ طبعیات اور مابعد الطبعیات
o۔ نفسیات
o۔ سیاسیات
o۔ اخلاقیات
o۔ نباتات

اس نے ان علوم کو یکجا کر کے ان کی علیحدہ علیحدہ تشکیل کی کیونکہ ان علوم پر ارسطو کو مکمل قدرت حاصل تھی۔ صدیوں تک دنیا کے فلسفی، سائنسدان اور معلم ارسطو کو اپنا معلم مانتے

رہے اور اب تک ارسطو کی تحقیقات اور اس کے نتائج کا مطالعہ جاری ہے اور یورپ وایشیاء کے محققین اس کی تحریروں سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب' ص158)

حالانکہ ارسطوافلاطون کا شاگرد تھا لیکن اس نے افلاطون کے نظریات سے اختلاف کیا ہے خاص طور پر وہ نظریہ تصور کی بجائے حقیقت کا قائل تھا اس کے نزدیک حقیقت ٹھوس ہوتی ہے اور اس کا اپنا وجود ہوتا ہے اور علیحدہ تشخص ہوتا ہے ہر ٹھوس چیز کیلئے شکل اور مادہ کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح پتھر کے مجسمے میں پتھر مادہ ہوتا ہے اور سنگ تراش اس کو شکل دیتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک شکل اور مادہ لازم وملزوم ہیں ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور افلاطون کا نظریہ اس سے مختلف تھا اس کے نزدیک شکل اور مادہ لازم وملزوم نہیں ہیں بلکہ شکل مادہ کے بغیر بھی وجود رکھ سکتی ہے جیسا کہ شکل روحانی یا تصوراتی دنیا میں قائم کی جاسکتی ہے وغیرہ۔

اخلاقیات ارسطو:

اخلاقیات میں ارسطو نے جن خیالات کا اظہار کیا اس کا لب لباب اور خلاصہ یہ تھا کہ انسان کو عقلی دلائل کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے کیونکہ زندگی میں خوشی اور سکون اس وقت مل سکتا ہے جب زندگی کو عقل کے تابع کر دیا جائے۔ وہ انسانی جذبات وخواہشات کا قائل تھا وہ عام خواہشات کی تکمیل چاہتا لیکن خواہشات کی زیادتی کا قائل نہیں تھا بلکہ ہر قسم کی زیادتی کی مخالفت کرتا تھا اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔

منطق کے علم کو ارسطو نے دلائل اور نتائج کا پابند بنایا جو بات بھی کہی جائے وہ دلائل کے مطابق ہوتا کہ ان دلائل سے کوئی نتیجہ برآمد ہوسکے۔ اس نے دلائل اور نتائج کو تین حصوں میں تقسیم کیا دو حصے دلائل کے اور تیسرا حصہ نتائج کا مثال کے طور پر اگر یہ کہتا ہے کہ تمام یونانی فانی ہیں تو منطق سے یہ بات اس طرح ثابت ہوسکتی ہے۔

o۔ تمام یونانی انسان ہیں۔ o۔ تمام انسان فانی ہیں۔

اس لئے تمام یونانی فانی ہیں۔

افلاطون کی طرح ارسطو بھی سیاسیات میں کافی دلچسپی رکھتا تھا وہ انسان کو سیاسی

فرد سمجھتا تھا جو اپنی زندگی کی تکمیل دوسرے افراد کے ساتھ مل کر کرتا ہے۔ افلاطون کی طرح وہ خاندان اور ذاتی جائیداد کا مخالف نہیں تھا بلکہ معاشرے کے استحکام کیلئے وہ خاندان کو ضروری خیال کرتا تھا اور ہر فرد کو حق دیتا کہ وہ اپنی جائیداد بنا سکے یا حاصل کر سکے۔ ارسطو کے زمانے میں چونکہ ایتھنز اور تمام یونان میں جمہوریت دم توڑ چکی تھی لہٰذا ارسطو فرد واحد کی حکومت کا قائل تھا اس کی زندگی میں فلپ دوئم نے یونان کی ریاستوں کو متحد کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی اور ارسطو کو اپنے بیٹے سکندر کا اتالیق مقرر کیا تھا اس لئے ان سیاسی حالات سے ارسطو کا متاثر ہونا ضروری تھا وہ ایک مطلق العنان اور طاقت ور حکمران کو جمہوری نظام سے بہتر خیال کرتا۔ اس کے نزدیک تمام انسان برابر نہیں ہو سکتے ذہنی اور جسمانی قوتیں انسانوں میں مختلف ہیں لہٰذا کمزور لوگوں کو برتر لوگوں کے تابع ہونا چاہیے حتی کہ وہ غلاموں کو بھی معاشرے کے لیے ضروری قرار دیتا تھا۔

وہ شاعروں ادیبوں کو خاص طور پر ڈرامہ نگاروں کو معاشرے میں خاص مقام دیتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک شاعر اور ادیب عوام کے جذبات کو بہتر بنانے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اس نے ادب میں تنقید نگاری کی اہمیت پر زور دیا اور اب تک اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر تنقید کا معیار پرکھا جاتا ہے۔

اسی نے نباتات اور حیوانات کے علوم کی داغ بیل ڈالی غرضیکہ ارسطو نے انسانی علوم کے ارتقاء میں جتنا کام کیا اس کا مقابلہ کوئی ایک شخص نہیں کر سکتا۔ زمانہ قدیم میں ارسطو کو افلاطون کے بعد کا درجہ دیا جاتا تھا لیکن ازمنہ وسطی میں ارسطو کی اہمیت زیادہ ہو گئی ان تمام علوم میں جن پر ارسطو نے اپنی تحقیقات کیں اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس بارے میں ارسطو ہی کو سب سے زیادہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے ارسطو نے یونانی فلسفے کو انتہائی عروج تک پہنچایا اس کی شخصیت میں عقل و دانش سوچ و بچار اور تحقیقات اور تنقید اس طرح مجتمع ہو گئے تھے کہ صدیوں تک لوگ اس کی تحقیقات اور تحریرات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

ارسطو کی موت کے بعد یونانی فلسفہ پر بھی موت طاری ہو گئی اس نے بھی زوال کی

منزلوں کی طرف سفر شروع کر دیا لوگوں کی توجہ تحقیق سے ہٹ کر لذت کی طرف ہوگئی پہلے مشقت تحقیق کے لیے اٹھائی جاتی تھی اور پھر اس کے زمانے کے بعد لذت ہی مطمع نظر قرار پائی نظریہ لذت کا سب سے بڑا حامی اپی کیورس تھا اس کے نزدیک فلسفہ کا مقصد ہے انسانی دنیا میں تسکین پیدا کرنا وہ لذت کو سب سے بڑی خیر سمجھتا تھا اس لئے وہ انسان کو حصول لذت کی ترغیب دیتا۔ اور اس پر دلائل قائم کرتا۔ لذت کے فلسفے نے عیاشی کو فروغ دیا۔ حتی کہ اپی کیورس کا لفظ ہی لذت کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور یونانی فلاسفر جس نے اٹلی کو زیادہ متاثر کیا اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے چاہے اس کے لیے اس کو کتنی ہی مشقت برداشت کرنی پڑے یا مشکلات کا سامنا کرنا پڑے لیکن یہ فلسفی (Zeno) فرائض کو پورا کرنے میں زندگی کی مسرت کو پوشیدہ خیال کرتا تھا لذت اور روایتی فلسفہ کا اثر زیادہ تر اٹلی میں رہا زندگی کے متعلق ان دونوں نظریوں کی ترویج واشاعت تیسری صدی عیسوی قبل مسیح میں ہوئی روم کے لوگ ان دونوں نظریوں سے کافی متاثر ہوئے۔

<u>اہل یونان کے دیگر علوم:</u>

انسانی علوم کو سب سے زیادہ ترقی یونانیوں نے دی ہے علم منطق، فلسفہ، طبعیات، علم ریاضی، علم الحساب، علوم نفسیات، تنقید، اخلاقیات کے علوم کو کافی فروغ دیا۔ اسی دور میں اقلیدس نے جیومیٹری کے علم کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب، ص: 161)

اہلِ مغرب کی تاریخ

اہل یورپ اپنی تاریخ کا آغاز یونان سے کرتے ہیں اور اس کی ترتیب یہ بتائی جاتی ہے:

1۔ یونانی دور　　2۔ رومی دور　　3۔ عیسوی دور یا ازمنہ وسطی

4۔ نشأۃ ثانیہ　　5۔ عقلیت کا دور　　6۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی

دنیا کی سیاست پر تقریباً سات سو سال تک روم کے لوگ اثر انداز ہوتے رہے

۔انہوں نے ایک جمہوری شہر کو ایک ایسی وسیع سلطنت میں تبدیل کر دیا جس کے تحت یورپ' افریقہ اور ایشیاء کے علاقے تھے۔ تین سو سال قبل مسیح میں روم کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور کچھ ہی عرصہ میں رومن دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند قوم بن کر ابھرے رومن کی طاقت شہنشاہوں کے دور میں اپنے انتہائی عروج پر تھی جہاں جہاں رومن کی حکومت تھی وہاں انہوں نے انتظام بھی سنبھال لیے۔ اگسٹس کے زمانے میں روم ایک ایسا شہر بن گیا جو دنیا کا دارالحکومت بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

روم کے لوگوں نے عمل کے میدان میں اپنے حریفوں کو شکست دے دی لیکن ان کے علم اور تمدن کے سرمایہ سے خود فیض حاصل کرنے کے درپے ہو گئے۔ اور ایک ایسی تہذیب کی نشو ونما کی جس میں مختلف تہذیبیں جمع ہو گئیں۔

صنعت وحرفت:

رومیوں نے بحر روم اور کئی سمندری راستوں پر قبضہ کر لیا تھا جس کی وجہ سے دور کے ملکوں میں ان کے لیے تجارت سہل ہو گئی تھی اور اس کے علاوہ سڑکوں کا جال سارے ملک میں بچھا دیا تھا اور سفر کی تمام سہولتیں مہیا کر دی تھیں۔ سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے جگہ جگہ موجود تھے تا کہ سرکاری کارندے سلطنت کے تمام علاقوں سے خبریں اور اطلاعات حکمرانوں تک پہنچا دیں اور ان کے احکام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کریں اس کے علاوہ تاجروں کو بھی اس کا خاصہ فائدہ تھا بڑے بڑے زمینوں والے روم میں آ کر آباد ہو گئے اور اپنی زمینیں امراء کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ روم میں اکثر چیزیں باہر کی آبادیوں سے آتی تھیں اور لوگ کافی نفع کماتے تھے۔ دنیا بھر کی عمدہ سے عمدہ چیزیں روم کی منڈی میں سمٹ کر آ جاتیں مال کی فراوانی تھی لوگ بھی عیاشی میں مبتلا تھے اس لئے تاجر خوب نفع اٹھاتے۔

تجارت کے فروغ کے ساتھ ساتھ بعض صنعتوں کو بھی رومن سلطنتوں میں ترقی دی گئی تھی جن میں جہاز سازی اسلحہ سازی لکڑی پتھر اور شیشہ کا کام اور دیگر ضروریات زندگی کا بنانا شامل تھا۔ بادشاہوں کے دور میں امن وامان قائم تھا اس لئے صنعت وحرفت کی ترقی

کے امکان کچھ زیادہ تھے لیکن یونانیوں کی طرح انہوں نے ترقی نہیں کی جس طرح انہوں نے مشینیں ایجاد کی تھیں انہوں نے تیار نہ کیں بلکہ ان کی تیار کردہ پر ہی اکتفا کیا۔

بنک کا نظام:

تجارت اور صنعت کی بدولت ایسا متوسط طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو سود پر روپے کا لین دین کرتے تھے۔ روپے کا لین دین بازاروں اور عمارتوں میں ہوتا تھا جو کاروبار کا مرکز ہوا کرتی تھیں اور جنہیں بسیلیکا (Basilica) کہا جاتا تھا اس لئے ایک ایسا بینکاری کا نظام قائم ہو گیا تھا جو بعد میں یورپ کی تجارتی اور صنعتی ترقی کا باعث بنا جو لوگ صنعت اور تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے وہ خوش حال تھے۔

روم کی جمہوریت نے بادشاہت کیسے اختیار کی:

اس عنوان کے ضمن میں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جمہوریت یا جمہوری نظام آج کل کا ہی بنا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ نظام قبل مسیح سے ہی لوگوں میں متعارف ہو چکا تھا۔

روم پر دو دور گزرے ہیں بادشاہت اور جمہوریت۔ شہر کا نظم ونسق چلانے کے لئے اور امن وامان قائم کرنے کے لیے پولیس کا محکمہ قائم تھا جس میں ہزاروں سپاہی بھرتی تھے۔ روم کی اکثر آبادی غلام اور غریب عوام پر مبنی تھی۔ وہ کاشتکار جو اپنی زمین فروخت کر کے روم میں آباد ہوئے تھے ان کی حالت اچھی نہیں تھی وہ بے کار رہتے تھے حکومت کی طرف سے ان کو اتنا مل جاتا تھا کہ دو وقت کا کھانا کھا سکیں۔

جمہوریت کے دور میں لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہو رہے تھے عوام مختلف گروہوں کی شکلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جو لوگ سینٹ اور منبری کے خواہش مند ہوتے وہ لوگوں کے گروہوں کو اپنے ساتھ ملانے اور ان سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے روٹی اور تماشوں کا مفت انتظام کرتے۔ ان کی حالت سدھارنے کے لئے ان سے لمبے لمبے وعدے کرتے۔ عوام کی خستہ حالی حکومت کے لئے مضر ثابت ہوئی اور عوام کی حمایت حاصل کر کے ایسے لوگ برسر اقتدار آئے جو بعد میں اس ملک کے شہنشاہ بن بیٹھے۔ بہر حال

تاریخ گواہ ہے کہ شہنشاہی کے زمانے میں روم کے عوام کی حالت بہت بہتر ہوگئی۔

مذہب:

ابتدائی زمانے میں روم کے لوگوں کا مذہب ارواح پرستی تھا ان کے ہاں روحوں کا تصور موجود تھا۔ وہ مافوق البشر روحوں کی عبادت کرتے تھے۔ یہ روحیں زیادہ تر مقامی ہوتی تھیں۔ جو کسی پہاڑی جنگل یا موسم کی حفاظت کرتی تھیں رفتہ رفتہ ان روحوں کو ستاروں کے سے نام دیئے جانے لگے اس کے علاوہ دیگر مذاہب بھی تھے۔ غرضیکہ رومیوں کا مذہب مختلف مذاہب کا مجموعہ ہوگیا جو مذاہب لوگوں نے جلدی قبول کئے ان کا تعلق بت پرستی سے تھا اور جب عیسائیت پیش کی گئی تو وہ انکاری ہوگئے عیسائیوں پر ظلم کئے گئے مگر جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کرلی تو عیسائیت تیزی سے روم میں پھیل گئی۔

روم کے علوم:

شاعری اور نثر نگاری میں تو اہل روم یونان کا مقابلہ کرنے لگے۔ چونکہ وہ ایک باعمل قوم کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے اس لئے ان کو کائنات کی تحقیق اور زندگی کے مقاصد اور طبعی علوم کی تحقیق کا موقع نہ مل سکا لہٰذا رومیوں نے فلسفہ اور سائنس کے علوم میں قابل قدر اضافہ نہیں کیا بلکہ یونانیوں کے تجربات اور تحقیقات پر اکتفا کیا اور ان نظریات کو قبول کیا جو ان کی عملی زندگی کے مطابق تھے وہ افلاطون اور ارسطو کے علوم سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے بلکہ رواقی (Stocr) اور اپی کیورین (Epicurean) کے فلسفوں سے ضرور متاثر ہوئے ان کا فلسفہ بے حیائی اور عریانی پر مبنی تھا۔

گذشتہ تہذیبوں کے مشترکہ نظریات

دنیا کی بڑی تہذیبیں اکثر ایسی ہوتی ہیں جو ایک وقت میں صرف ایک یا صرف دو ہی موجود ہوتی ہیں لیکن مغربی تہذیب کے علاوہ جو بھی تہذیب گزری ہے اس میں ایک تصور خاندان نمایاں حیثیت کا حامل تھا کسی نہ کسی درجہ میں خاندانی نظام موجود ہوتا تھا۔

دوسرا مشترک عقیدہ یہ تھا کہ وہ تمام تہذیبیں کسی نہ کسی خارجی طاقت کی قائل

تھیں جو انسان کے علاوہ ہوتی تھیں ۔کوئی اس خارجی طاقت کو بتوں کے مجسموں میں سمجھتا تھا کسی نے اس کی کوئی اور تشبیہی شکل بنائی ہوئی تھی کوئی اس کا نام بھگوان رکھتا کوئی دیوتا سے پکارتا تھا۔

بہرحال وہ سب کسی ایسی طاقت کی قائل تھے جس کے سامنے سرنگوں ہوا کرتے تھے کسی نے تو اپنے جیسے انسانوں کو اعلی تھارٹی' اعلی طاقت کا سرچشمہ گمان کیا ہوا تھا اور ان کے سامنے سر جھکاتے اور اپنی حاجتیں انہی سے طلب کرتے اور ان کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے کام سرانجام دیتے ۔ایک خدائی طاقت کا تصور اگرچہ نہ کر سکے مگر یہ ضرور ہے کہ وہ کسی ماوراء انسانی طاقت کے قائل تھے۔ان دو مشترکہ نظریات کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی مشترک ہیں جس کو کتاب ﴿تہذیبوں کا تصادم﴾ میں ذکر کیا گیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب میں اعلی اتھارٹی کوئی خارجی طاقت نہیں جس سے حاجت طلب کی جائے اور رہنمائی لی جائے بلکہ اعلی اتھارٹی خود انسان ہے اور اس کی رہنمائی اس کی عقل کرے گی۔

گذشتہ تہذیبوں کی تباہی کے اسباب:

تہذیب کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ یہ عالی شان نقشہ رکھنے والے آخر کہاں گئے ان کی عالی شان عمارتیں ہزاروں من مٹی تلے کیسے دب کر رہ گئیں ۔ یہ بلند و بالا ڈیم بنانے والے ان کے ڈیموں کی خستہ دیواریں تو موجود ہیں لیکن بستی کے رہنے والوں کے نشان گم ہو گئے یہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنانے والے۔ان کے آثار بھی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے ۔ یہ موہن جودڑو اور ہڑپہ کی بستیاں کن اسباب وعلل کی وجہ سے اس دنیا سے غائب ہو گئیں کیا وجہ تھی کہ یہ اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکے۔

بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ قوموں کی ہلاکتیں ایک غیر فطری عمل نہیں تھا بلکہ کسی نے اپنی معیشت کو مضبوط نہ کیا تھا بلکہ اور کاموں میں زندگی گزار دی اور اپنی معیشت کو مضبوط نہ کر سکے اس وجہ سے دنیا میں اپنا وجود باقی نہ رکھ سکے اس لئے ہلاک ہو گئے اسی طرح دیگر اسبابِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان اسباب کی عدم موجودگی کی وجہ سے زمانے نے انہیں موت کے دہانے پر لا کر کھڑا

کر دیا۔اسی طرح کسی قوم نے اپنی سرحدوں کی اچھی طرح حفاظت نہیں کی کسی نے دشمن کے داؤ پیچ کو اچھی طرح نہ سمجھا اس لئے اس دنیا سے کنارہ کشی کرنی پڑی اس طرح مختلف اسباب وعلل اور مادی وجوہات کو نقل کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلاں قوم کے پاس فلاں وسائل ختم ہو گئے ۔اس لئے ہلاک ہو گئے اور فلاں قوم کے پاس فلاں مادی وسائل نہ تھے اس وجہ سے ہلاک ہو گئے اور بطور دلیل چند قوموں کے شواہد پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں قرار اس وجہ سے ختم ہو گیا۔

اقتباس:

ہِٹ کاٹرن جزیرے پر کون سی تبدیلیاں تباہی کا باعث بنیں اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں تاہم ویزلر کے تجربات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جزیرے پر بھی جنگلات کی حد سے زیادہ کٹائی بربادی کا باعث بنی تھی ۔(تباہ شدہ تہذیبیں:ص 117)

ایک جزیرے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف اس کی تباہی کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے ضمن میں لکھتے ہیں اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

اقتباس:

اس جزیرے پر پائی جانے والی سمندری خوراک بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی اس طرح ماحولیات کو پہنچنے والے نقصان کی وجہ سے سماجی اور سیاسی ابتری پھیل گئی پھر کشتیوں کے لئے حد سے زیادہ جنگلات کاٹے گئے یوں پولی نیشیا کے ان جزیروں کے درمیان صدیوں سے جاری تجارت اختتام پذیر ہوگئی۔اس کی وجہ سے مینگا ریوا کے رہنے والوں کے لئے بھی مشکلات کا اضافہ ہوا' دیگر جزیروں سے ان کا رابطہ کٹ چکا تھا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ربٹ کاٹرن اور ینیڈرس پر تباہی مینگا ریوا کو حد سے زیادہ تجارت کی وجہ سے آئی ہے احتیاط سے کام لیا جاتا تو اس تباہی سے بچا جا سکتا تھا۔(تباہ شدہ تہذیبیں:ص 117)

اسی طرح جناب مصنف (تباہ شدہ تہذیبیں) نے مختلف جزیروں قبیلوں' تہذیبوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تباہی کے اسباب بیان کئے ہیں اور جناب کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ مادی وسائل کی وجہ سے یہ سب اجتماعی طور پر ہلاک ہوئے ہیں لیکن اسلامی نقطہ نظر اس سے

بالکل مختلف ہے اسلامی فکر وسوچ میں تباہی کا سبب کبھی بھی مادی وسائل کی عدم موجودگی نہیں ہوسکتا بلکہ جب کسی قوم پر اجتماعی ہلاکت طاری ہوتی ہے تو اس کی وجہ ایک ہی ہے اپنے رب کی نافرمانی جس کی وجہ سے بہت قومیں ہلاک ہوگئیں۔

قرآنی تعلیمات کے آئینہ میں:

قرآن کریم اصلار شدو ہدایت کا سرچشمہ ہے اس کے ساتھ ساتھ ان واقعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے جو قبل از تاریخ گزر چکے انسانی تخیل اور تصوران واقعات کے حقائق تک رسائی پر قادر نہ تھا قرآن کریم نے اسے واضح طور پر بیان کردیا مثلاً واقعہ پیدائش آدمؑ عذاب نوح اس طرح کے سینکڑوں واقعات ہیں جن سے قبل از تاریخ کے واقعات کا بھی علم ہوجاتا ہے اور کئی تاریخ کی الجھنیں بھی حل ہوجاتی ہیں وگرنہ انسان ہمیشہ تجسس میں رہتا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آبی جانوروں کے ڈھانچے کیونکر آ گئے قصہ نوح سے اس طرح کے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔

تمام فنا شدہ تہذیبیں اسباب کی کمی کی وجہ سے صفحہ ہستی سے نہیں مٹائی گئیں بلکہ اس کے پیچھے ان کے وہ اعمال بد ہیں جن سے ان قوموں کو ان کے رب نے منع کیا تھا مگر وہ باز نہ آئے پھر اسی جرم کی پاداش میں کسی کو زمین کی تہوں میں دھنسا دیا گیا کسی قوم پر ایک چیخ ﴿سخت آواز﴾ مسلط کردی گئی جس کی وجہ سے اچانک سب کے سب مر گئے اور کسی پر پتھروں کی بارش کی گئی اور کسی قوم پر بطور عذاب ان جیسے دوسروں لوگوں کو مسلط کردیا گیا جنھوں نے ان نافرمانوں کو تہ تیغ کردیا جیسا کہ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:

ولوان اھل القرای امنوا واتقوالفتحنا علیھم برکت من السمآء والارض ولکن کذبوافاخذنٰھم بما کانو یکسبون (سورۃ الاعراف:96)

ترجمہ: اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے

پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے انکو ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے پکڑا۔

یہ آیت مبارکہ اس تخیل کو رد کرتی ہے کہ محض مادی اسباب کی عدم موجودگی کی وجہ سے قومیں ہلاک ہوگئیں بلکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کی تباہی کا سبب میری نافرمانی بنی ہے اگر یہ لوگ میری اطاعت کرتے تو ہم ان کے مادی وسائل کو زیادہ کردیتے اگر اعمال صالحہ اختیار کرتے تو ان پر برکتیں نازل کرتے برکتوں کا نازل نہ ہونا اور اسباب میں کمی آجانا یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں ہلاک ہونے والی بستیوں کی ہلاکت کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قال اللہ تعالیٰ:

فكلا اخذ نابذ نبه فمنهم من ارسلنا عليه حاصباً ومنهم من اخذته الصيحة ومنهم من خسفنابه الا رض ومنهم من اغرقنا وما كان الله ليظلمهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون (سورۃ العنکبوت آیت:40)

ترجمہ: ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کی سزا میں پکڑ لیا سو ان میں سے بعض پر تو ہم نے تند ہوا بھیجی اور بعض کو ہولناک آواز نے آدبایا اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو ہم نے پانی میں ڈبو دیا۔ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن یہ لوگ اپنے اوپر خود ظلم کرتے تھے۔

اسلوب قرآن سے استدلال

قرآن کریم قصوں اور کہانیوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ رشد و ہدایت کے لیے رب العالمین نے نازل کی ہے اس میں اگر صرف احکام ہوتے جیسا کہ حاکم جب قانون بناتا

ہے اور عوام کے لیے دستور العمل تیار کرتا ہے تو ہر ایک ایک شق جامع ہوتی ہے کوئی قصہ' دلیل یا ترغیب نہیں ہوتی یہ حال تو دنیا کے حاکموں کا ہے جن کی حکمرانی بھی ناقص ہے اور اقتدار بھی ناپائیدار حکومت بھی زوال پذیر۔

رب العالمین جو کہ حاکم مطلق ہے جس کی بادشاہی مسلّم ہے اور دائمی وابدی ہے اگر وہ بھی صرف حکم دیتے کہ یہ کام لازم اور ضروری ہے اسے کرو۔ یہ کام ہرگز نہ کرو تو کافی تھا کیونکہ حاکم اپنے غلاموں کو یوں ہی حکم دیتا ہے اور یہ کافی سمجھا جاتا ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اسلوب اس انداز سے قدرے مختلف ہے اس کا ایک حصہ توحید پر مشتمل ہے تو ایک حصہ آخرت کے تذکروں پر مشتمل ہے اور آیاتِ احکام پر ایک حصہ ہے اور اسی طرح ایک حصہ قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے جس میں گزشتہ قوموں کے حالات بتائے ہیں فلاں کے ساتھ کیا ہوا فلاں قوم کیوں ہلاک ہوگئی۔

ان قصوں کا ہدایت سے کیا تعلق ہے جو کتاب ہدایت میں ذکر کردیئے گئے ہیں؟

یہ حاکم وحکیم جل شانہ کا شاندار اسلوب ہے جس میں اس امت کی رہنمائی فرمائی ہے اور بہت سی جزئیات اور انسانی معاشرے میں پیش آنے والے مسائل سے نکلنے کا حل بتایا ہے اور قوموں کی نظریاتی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور اس سے اجتناب کا طریقہ بالکل سہل انداز میں بیان کردیا کہ فلاں قوم یوں کرتی تھی تم یوں نہ کرنا۔

مثلاً فرعون کے قصے میں اس امت کے اعلیٰ اقتدار والوں کو خصوصی نصیحت ہے کہ اے امت مسلمہ کے سربراہو! تم سے اعلیٰ اقتدار والی قوم جس کو تم آل فرعون کے نام سے یاد کرتے ہو جب اپنے نبی کے طریقے چھوڑ کر مخالفت پر آئی تو اس کا انجام تمہارے سامنے ہے کہ ہلاک ہوگئی تم ایسی حرکت سے باز رہنا تکبر نہ کرنا۔

اسی طرح قوم شعیب کے قصہ میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو مکمل رہنمائی کردی۔ تجارت میں دھوکہ اور فریب کے جتنے امکانات اور حیلے بہانے تھے ان کو رد کردیا۔ اس قصہ سے واضح ہوجائے گا کہ اگر مقصود زندگی اسی تجارت کو بنالیا تو وہ حال ہوگا

جوقوم شعیب کا ہوا تھا۔

اسی طرح قوم عاد وثمود کے قصے بیان کر کے انسان کی زندگی کے نہج کو درست کیا ہے اور قوم لوط کے قصہ کو بیان کر کے معاشرتی برائیوں میں مبتلاء ہونے کا انجام ذکر کر دیا غرض ان قصص میں بتایا کہ قوموں کی ہلاکتیں ان اسباب وعلل کی وجہ سے ہوئی ہیں اگر تم ان کو اختیار کرو گے تو تم بھی فتنوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اسی طرح امت محمدیہ کے کاشتکاروں کے لئے قوم سباء کا حال بیان کر دیا کہ تم سے اچھی کھیتیاں اگانے والے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں ان کی کھیتیاں ان کو تباہی سے بچا نہ سکیں لہٰذا تم بھی ان سر سبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی وجہ سے اپنے رب کی نافرمانی نہ کرنا غرضیکہ ہر قصہ میں رہنمائی ہے محض کہانی نہیں۔

باب الثانی

تہذیب مغرب کا تعارف

تہذیبِ مغرب یا مغربی فکر وفلسفہ ایک سوچ وفکر کا نام ہے جس سے غیر شعوری طور پر مذاہبِ عالم کافی متاثر ہوئے ہیں یہ کوئی سازش نہیں ہے کہ جس سے واقفیت کے بعد اس کا طلسم ٹوٹ جائے گا بلکہ ایک فکری یلغار ہے جس نے تمام مذاہب کو روندنے کی کوشش کی ہے۔

اس فکری یلغار سے عیسائیت اور ہندومت حد درجہ متاثر ہو چکے ہیں ان میں الحاد اور بے دینی کی لہر دوڑ چکی ہے حتی کہ مذاہب کا اثر لوگوں کے ناموں تک رہ گیا ہے باقی سب رسومات وعبادات اخلاقیات ومعاشرت اس فکری یلغار کی نظر ہو چکے ہیں۔

حالانکہ تمام مذاہب وہ آسمانی ہوں یا غیر آسمانی ان میں اور مغربی فکر میں دور کی بھی کوئی نسبت یا مماثلت نہیں جس سے اس فکری اثر کو قبول کرنے کا جواز فراہم کیا جا سکتا ہو۔

کیونکہ مغربی نقطہ نظر میں سب سے اہم چیز انسان خود ہے دنیا میں عیش ولذت طلبِ فرحت اس کا حق ہے سب سے اعلیٰ اتھارٹی خود انسان ہے اپنے عمل کا کسی دوسرے کے سامنے جواب دہ نہیں یہ آزاد مطلق العنان ہے۔

لہٰذا اسی نقطہ نظر سے باقی چیزوں کا موازنہ کیا جائے گا جو چیز انسان کی لذت کو بڑھائے اس کی مطلق العنانی کو زیادہ کرے وہ تمام چیزیں جائز ہوں گی اور جو انسان کو فائدہ دیں فرحت پہنچائیں سب جائز اور حق ہوں گی۔ اور جو امر اس کی مطلق العنانی کو ختم کرے اس کی آزادی کو کم کرے اس کی ترقی کو مجروح کرے اس کو ناحق قرار دیا جائے گا اور اسی کو شر کہا جائے گا۔

چونکہ اصل اور سب سے اہم انسان خود ہے لہٰذا اس کے لئے مناسب نہیں کہ کسی کے سامنے جھکے اور کسی کی عبادت کرتا پھرے۔ ہاں! عبادت میں چونکہ ایک قسم کی لذت بھی ہوتی ہے اس لذت کے حصول کے لیے وہ اگر عبادت بھی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے باقی رہا اپنے معبود کو خوش کرنے کے نظریہ سے اس کی عبادت کرنا تو یہ ایک فضول خیال ہے۔ مغربی فکر میں خدا کوئی شے نہیں ہے بلکہ انسان خود خدا ہے کانٹ کا مشہور جملہ ہے۔

میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں۔ I think therefore I am.

اپنے علاوہ ہر شے پر شک کیا جاسکتا ہے کہ اس کا وجود اس کائنات میں ہے بھی یا یہ میری آنکھوں کا دھوکا ہے البتہ صرف میری ذات ایسی ہے جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ میں ہوں یعنی صرف میری اپنی ذات کا وجود یقینی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ میں کسی ایسی ہستی کے سامنے جھکوں جس کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ ہے بھی یا نہیں۔

لہٰذا عابد و معبود ساجد و مسجود میں خود ہی ہوں کیونکہ مجھے اپنی ذات کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ہوں یا نہیں بلکہ میرا وجود یقینی ہے۔

اس لئے دنیا میں جو کچھ بھی میں کروں اس کا جواب دہ کسی کے سامنے نہ ہوں گا مجھے کیا کھانا چاہیے کیا بولنا چاہیے کیا دیکھنا چاہیے کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہیے میں خود بتاؤں گا۔ خیر وہ ہے جسے میں خیر کہوں اور شر وہ ہے جسے

میں شر کہوں اور اس بارے میں بالکل آزاد ہوں جسے چاہوں خیر' اچھائی قرار دوں اور جسے چاہوں شر قرار دے دوں اور یہ آزادی ہر انسان کا حق ہے۔

اس کے برخلاف تمام مذاہب سماویہ اور غیر سماویہ میں انسان کے علاوہ کوئی دوسری طاقت ہوتی ہے جو بتاتی ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے پھر بندے کو اختیار رہوتا ہے وہ شر کو اپنائے یا خیر کو اپنے دامن میں لے۔ خیر کو اپنانے کی ترغیب ہوتی ہے اور شر اختیار کرنے پر ترہیب ہوتی ہے۔

آسان لفظوں میں یوں کہیں گے کہ عصر حاضر کا خدا انسان خود ہے۔ اپنی آزادی کو لامتناہی ترقی دے کر بڑھاتے رہنا اس کا ایمان ہے اور چونکہ اس جیسی خدائی میں سب انسان برابر کے شریک ہیں لہٰذا سب میں مساوات ہے مرد وعورت کے حقوق برابر ہیں بیٹا اور باپ برابر ہیں۔

ان سب خداؤں نے چونکہ ایک معاشرے میں رہنا ہے اور سب کو مطلق آزادی مطلوب ہے اور لامتناہی ترقی کرنا مطمعِ نظر ہے اس لیے کہ جتنی ترقی ہوگی اتنا ہی آزادی میں اضافہ ہوگا جب ایسی صورت حال پیدا ہو تو چھینا جھپٹی کی فضاء بنتی ہے لہٰذا ان تمام خداؤں کو ایک جگہ رکھنے کے لئے قانون ہونا چاہیے جو ان کی انفرادی زندگی کو آزاد سے آزاد تر کرنے کا ضامن ہو بایں طور کہ کسی دوسرے کی آزادی اس کے عمل کی وجہ سے مجروح نہ ہو۔

مغربی فکر وفلسفہ میں تین چیزیں ایمانیات کا درجہ رکھتی ہیں آزادی، مساوات' ترقی انہی تین اصولوں پر تمام معاملات پرکھے جائیں گے اگر کسی عمل سے آزادی' مساوات اور ترقی میں اضافہ ہو تو اس کو اپنانے پر زور دیا جائے گا اور اگر کسی عمل سے آزادی' مساوات اور ترقی میں کمی واقع ہو تو اس عمل کو قانوناً روکنے کی کوشش کی جائے گی۔

انہی اصولوں کو مدنظر رکھ کر ایک عالمگیر قانون تیار کیا گیا ہے جس کو کہتے ہیں ''انسانی حقوق کا عالمی منشور''۔

اس کی پاسداری کرنا تمام ممبر ممالک کے ذمہ ضروری ہے وہ اپنے نجی قانون بھی اس عالمگیر قانون کو مدنظر رکھ کر بنانے کے پابند ہوں گے۔ اس کا مطالعہ کر کے اندازہ کرلیا

جائے کہ مغربی فکر وفلسفہ اور اسلامی تہذیب وروایات کا کتنا فرق ہے ثابت ہوجائے گا کہ ان میں کسی قسم کی کوئی مماثلت نہیں ہے۔

مغربی فکر وفلسفہ کی ابتداء:

مغربی فکر اور فلسفہ کو اگر بنیاد کے اعتبار سے دیکھیں تو اس کی ابتداء ارسطو وافلاطون کے خیالات سے شروع ہوجاتی ہے مگر ان مفکرین کے زمانے میں لوگ روایتی انداز سے سوچتے تھے اور منطقی انداز کو ثانوی حیثیت دیتے تھے۔ مذہبی جکڑ بندیوں کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اسی وجہ سے تو افلاطون کے استاد سقراط کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اس پر الزام تھا کہ یہ نوجوان نسل کو ان کے مذہب سے دور کرتا ہے۔ اور خود بھی ہمارے معبودوں کی عبادت نہیں کرتا اگرچہ یہ فلاسفر حضرات خدا کے تصور کو خود بھی تسلیم کرتے تھے مگر اپنی زندگی کا نظم ونسق عقل سے چلانے کے قائل تھے یعنی اگر خدا ہے بھی تو وہ معبد اور مندر میں رہے زندگی کے باقی شعبوں میں اس کی مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔

سقراط، افلاطون اور ارسطو تک فلسفہ کا عروج تھا مگر ارسطو کی وفات کے بعد یونانی فلسفہ نے ترقی نہیں کی آج تک اسی فلفسہ کی تشریح ہورہی ہے اس کے بعد عیسائیت کا دور شروع ہوگیا اور فلسفہ نے عیسائیت کو کافی متاثر کیا اس کے اساسی عقائد تک فلسفہ کی زد میں آگئے اور عیسائیت اس حد تک فلسفہ یونان پر موقوف ہوگئی کہ یونانی فلسفہ کی شکست ہی عیسائیت کی شکست تسلیم ہوتی تھی۔ محمد حسن عسکری اپنی کتاب مغرب کے ذہنی انحطاط کی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

اقتباس:

یونانی فلسفہ اس دور میں بھی پڑھایا جاتا تھا البتہ یہ لوگ فلسفے کو اپنے دین کے تابع رکھنا چاہتے تھے بارہویں صدی میں مغرب پر سب سے شدید اثر ابن رشد کا تھا عیسوی دنیا کا سب سے بڑا دینی مفکر سینٹ ٹامس اکواٹناس سمجھا جاتا ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ تیرھویں صدی میں اس نے ابن رشد کے فلسفے کو شکست دے کر عیسوی الٰہیات کو ارسطو کے فلسفے کی بنیاد پر قائم کیا۔

بہرحال فلسفہِ یونان مذہب کی شکل میں سفر کرتا رہا مگر اس کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ اس فلسفہ نے اسلام کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی لیکن حق تعالیٰ شانہ نے دینِ مبین کی حفاظت فرمائی جو افراد ان عقلی الجھنوں میں پڑ کر دین سے دور ہونے لگے وہ فرقہ معتزلہ کی شکل میں سوادِ اعظم اہل سنت والجماعت سے الگ ہوگئے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اپنی ناپائیدار بنیادوں سمیت تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے آگے نہ چل سکے۔ اور فلسفہ یونان کی کوئی چیز بھی اسلام کی اساسی تعلیمات وافکار کو متاثر نہ کر سکی۔

یونانی فلسفہ عیسائیت کے روپ میں زندہ رہا جب عیسائیت کمزور پڑی جدید سائنس اور عیسائیت کی کشمکش شروع ہوگئی اور پادریوں کی پاپائیت سے لوگ تنگ آ گئے اور مذہبی گرفت بھی کمزور پڑ چکی تھی لوگ قدرے دین سے دور تھے تو عقل پرستوں نے ایک دفعہ پھر سر اٹھایا اور نظام مذہب سے اختلاف کیا اور پاپائیت کے خلاف بغاوت کردی اس تحریک کو اصلاح دین کا عنوان دیا گیا۔ جس میں مطالبہ یہ تھا کہ ہم پاپائیت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر بندے کا حق ہے کہ وہ تورات کو خود پڑھے سمجھے اور اپنے رب سے رہنمائی لے اور ہر ایک کو تفسیر بالرائے کا حق ہے۔

دین میں فرد کی خود مختاری اور آزادی کا اصول قائم ہو گیا تو مغرب میں گمراہیاں بڑھتی ہی چلی گئیں اور خود رومن کیتھولک بھی ان سے متاثر ہونے لگے۔

تہذیب مغرب کا ارتقاء:

مغربی تہذیب کی موجودہ شکل وموجودہ نظریات کسی خاص تہذیب کا عکس نہیں ہیں جس کی بنیاد پر ہم یوں کہہ سکیں کہ اہل مغرب نے یہ اصول وضوابط اور طرز زندگی فلاں کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔

بلکہ یہ ایک مستقل جداگانہ تصور زندگی ہے جس کی مثال پہلی روایتی تہذیبوں میں نہیں ملتی اگرچہ اس تہذیب کی جزوی مشابہت کچھ دوسری تہذیبوں کے ساتھ ہے اور کچھ نظریات دوسری تہذیبوں کے اس میں مدغم ہیں مشابہت جزوی کی وجہ سے کل کا حکم لگا دینا کہ انہوں نے سارے اعمال زندگی فلاں سے اخذ کیے ہیں مناسب نہیں ہے۔

اور یہ بات حق کے زیادہ قریب ہے کہ ہم اس تہذیب کو ایک مستقل جداگانہ تصور حیات تسلیم کریں اس تہذیب کا ارتقاء تقریباً چھ ادوار پر مشتمل ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تہذیب مغرب کا گھونسلہ بہت سے قدیم وجدید فلسفیوں کے تخیلاتی خس وخاشاک کو اکٹھا کر کے تیار کیا گیا ہے۔ یورپ کے لوگ عموماً اپنی تہذیب کی تاریخ کا آغاز یونان سے کرتے ہیں چنانچہ یورپ کی تاریخ کا خاکہ کچھ یوں ہوگا:

1۔ یونانی دور　　2۔ رومی دور　　3۔ عیسوی دور یا ازمنہ وسطی

4۔ نشاۃ ثانیہ　　5۔ عقلیت کا دور　　6۔ انیسویں صدی

7۔ بیسویں صدی

یونانی دَور

پانچویں صدی قبل مسیح قدیم یونان میں مشہور فلسفی حضرات پیدا ہوئے جنہوں نے تاریخ پر گہرا اثر چھوڑا عیسائیت جب تحریف کا شکار ہوگئی' پاپائیت کے ظلم و جبر سے عوام تنگ آ گئے تو لوگوں میں مذہب کے خلاف جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ عقل پرستی کی فضاء قائم ہونے لگی۔ دین میں اصلاح کی تحریکیں منظر عام پر آئیں جس سے دین میں خودرائی کا دروازہ کھلا اور ہر عام وخاص دین کو تحقیق کا تختہ مشق بنانے کیلئے ذہناً تیار تھا۔

ان حالات نے کانٹ، ڈیکاٹ، ہیگل اور لاک جیسے افراد کی فلسفیانہ بحث کو مزید ترقی کا موقع دیا اور ان کو مقبولیت عامہ حاصل ہوگئی ان حضرات کے نظریات اگرچہ ارسطو اور افلاطون کے نظریات کو رد کرتے تھے مگر کچھ خرابیاں مغربی تہذیب میں ایسی ہیں جو یونانی فکر کو اخذ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں

1۔　ارسطو پر لوگوں کا الزام تھا کہ وہ خالص عقل پر اعتماد کرتا ہے اور تجربہ کا طریقہ استعمال نہیں کرتا مگر مشاہدے اور تجربے کو آخری اور فیصلہ کن ماننے کا رجحان خود ارسطو کے یہاں بھی موجود تھا اور مغرب میں بھی آج یہی رجحان ہے۔

2۔ یونانی فلسفہ کی توجہ کا مرکز انسانی معاشرہ تھا نہ کہ مبدأ اور معاد یعنی دنیاویت ان یونانی فلسفیوں میں اچھی طرح جڑ پکڑ گئی تھی اور یہی کچھ مغرب میں ہو رہا ہے کہ اصل توجہ کا مرکز انسان ہے۔

3۔ یونانی ہر چیز کو انسان کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے جو اس کے فائدہ میں نظر آئے اس کے حق ہونے کے قائل ہوتے جب ہر شے کو انسانی نقطہ نظر سے تحقیق کے میدان میں دیکھتے تو اصل حقیقت تک رسائی میں ناکام ہو جاتے اور مسئلہ کی تہہ تک نہ پہنچ سکتے۔ یہ تو اجمال کے ساتھ چند نظریات کی نشاندہی کی ہے جس میں اہل مغرب اور اہل یونان فکری اعتبار سے مساوی ہیں اس کے علاوہ دیگر نظریات بھی مشترک ہیں جن کے بیان کا موقع نہیں۔

اہل یونان کی ثقافتی سرگرمیاں:

اہل یونان کے نظریات تو کیا کئی اعمال بھی اہل مغرب سے ملتے ہیں بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب مغرب کا بہت سا حصہ اہل یونان سے ماخوذ ہے اور تہذیب مغرب میں تہذیب یونان کا رنگ نظر آتا ہے۔

اہل مغرب کے کئی نظریات و اعمال اہل یونان کا عکس پیش کرتے ہیں فیثا غورس ایک مشہور فلسفی اور حساب دان تھا وہ پہلا شخص تھا جس نے کرہ ارض کو گول کہا اور سورج گرہن کی پیشین گوئی کی تھی اس نے علم موسیقی کو سب سے پہلے حسابی بنیادوں پر مرتب کیا۔

اسکے ریاضی کے مقرر کردہ اصول آج تک سکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

اس کے مکتب میں عورتیں مرد مل کر تعلیم حاصل کرتے تھے اس طرح افلاطون سے دوسو برس پہلے اس نے عملی طور پر مرد و عورت کی مساوات کا درس دیا اس کے خیال میں مرد وزن کے حقوق یکساں ہیں کسی کا حق کسی سے زیادہ نہیں ہے فیثا غورس کروٹونا کا شہری تھا اس کا زمانہ افلاطون کے زمانے سے دوسو برس پہلے کا تھا اس کے بارے میں سید علی عباس جلال پوری اپنی کتاب روایات تمدن قدیم میں لکھتے ہیں۔

اقتباس:

''فیثا غورس کروٹونا کا شہری تھا اس کے مکتب میں عورتیں
اور مرد مل کر تعلیم پاتے تھے اس طرح افلاطون سے دو سو برس پہلے اس
نے عملی طور پر مرد و عورت کی مساوات کا درس دیا اس کے خیال میں
مرد و عورتوں کے حقوق یکساں ہیں''۔ (روایات تمدن قدیم: ص 131)

پروتاغورس سوفسطائی یونانی فلسفی کا ایک مقولہ ہے جس سے یونانی فلاسفہ کی فکر کا منہاج معلوم ہوتا ہے۔

اقتباس:

''انسان ہر شے کا پیمانہ ہے انسان ہی صداقت اور خیر کا
معیار قائم کرتا ہے بری شے وہ ہے جسے انسان برا سمجھے اور اچھی وہ
ہے جسے انسان اچھا سمجھے''۔ (روایات تمدن قدیم: ص 134)

حتیٰ کہ کھیلوں اور الفاظ میں بھی اسی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جیسا کہ آج کل مغرب میں درسگاہ کو اکیڈمی کہا جاتا ہے اور آج سے تقریباً 2400 سو سال قبل افلاطون جس درسگاہ میں تعلیم دیتا تھا اس کو بھی اکیڈمی کہا جاتا تھا۔

اقتباس:

''نوجوان کھلاڑی ناچوں اور کھیلوں میں برہنہ ہو کر حصہ
لیتے تھے مقصد اس کا یہ تھا کہ ہر شخص اعضاء اور رعنائی خطوط کو برقرار
رکھنے کے لئے ورزش کرتا تھا''۔ (روایات تمدن قدیم: ص 140)

اس کے علاوہ تھیٹر ڈرامے آج کل کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ یہ بھی یونانی دور سے شروع ہیں ان کے اول موجد یہی لوگ ہیں ۷۰ھ قبل مسیح سے ۳۸۰ تک ۲۰۰۰ ڈرامے تھیٹر پر کئے جا چکے تھے یہ لوگ اس طرح کے کھیل تماشے اس لیے کیا کرتے تھے کہ ان کا اعتقاد

تھا کہ ان کے معبود اس طرح کے تماشوں سے خوش ہوتے ہیں لیکن مغرب کی تہذیب میں یہ ڈرامے اور کھیلیں اس لئے رائج ہیں کیونکہ یہ تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

لڑکیوں کی کھیلوں میں شرکت:

لڑکے اور لڑکیاں دونوں دوش بدوش کھیلوں میں حصہ لیتے تھے خاص خاص تہواروں پر وہ برہنہ حالت میں اجتماعی ناچ میں حصہ لیتے تھے۔

اقتباس:

''نوجوان لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے دوش بدوش ورزشی کھیلوں میں حصہ لینا پڑتا تھا' خاص خاص تہواروں میں برہنہ حالت میں اجتماعی ناچوں میں حصہ لیتی تھیں''۔(روایات تمدن قدیم:ص 145)

ہم جنس پرستی:

یونان میں ہم جنس پرستی کو عار نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کو شیوہ مردانگی خیال کیا جاتا تھا اس قسم کے معاشقے کا اظہار برملا کرتے تھے مندرجہ ذیل اقتباس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ لوگ ہم جنس پرستی میں مبتلا تھے۔

اقتباس:

''یونانی ہم جنس محبت کو باعث ننگ وعیب وعار نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کو شیوہ مردانگی خیال کرتے تھے بلکہ شیوہ مردانگی قرار دیتے تھے اس قسم کے معاشقوں کا اظہار برملا کیا جاتا تھا''۔(روایات تمدن قدیم:ص 147)

وطن پرستی:

وطن پرستی بھی یونان کے فلسفہ سے مغربی فلسفہ میں آئی ہے جب ایک سردار نے عہد کے باوجود تھیبا کے قلعہ پر قبضہ کرلیا تو کسی نے کہا یہ بات تو نہایت غیر مناسب ہے جواب ملا۔ جو بات میرے ملک کے حق میں مفید ہے وہی حق ہے۔

یونان کے کھیل:

قدیم یونان میں اولمپک کھیل بہت مقبول تھے لوگ دور دور سے شرکت کے لیے آتے اور بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے دوڑوں کے علاوہ ڈسکس پھینکنے اور کشتیوں کا مقابلہ ہوتا تھا جیتنے والے کو ایک لارل (جنگی درخت) کا تاج دیا جاتا تھا اگرچہ دیکھنے میں یہ ایک بے قیمت شے تھی مگر یونان میں اس سے زیادہ اعزاز والا اور کوئی تاج وعہدہ نہ تھا۔ دور حاضر میں دوبارہ ان کھیلوں کا احیاء ہو چکا ہے جو اولمپکس گیمز کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ تو چند مثالیں تھیں اس کے علاوہ بھی کئی نظریات اور کئی روایات اہل مغرب نے اہل یونان سے سیکھی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اہل مغرب نے ان کی مابعد الطبعیات کو تسلیم نہیں کیا جیسے وہ لوگ کھیلوں کو اس لئے اہمیت دیتے تھے کہ ان کے معبود اس سے خوش ہوتے تھے اس غرض سے وہ ذوق وشوق سے حصہ لیتے مگر اہل مغرب کھیلوں کو اہمیت تو دیتے ہیں لیکن مقصد صرف اور صرف لذت وتفریح ہے کسی معبود کی خوشی مطلوب نہیں ہوتی۔

رومی دور

تہذیب مغرب رومی دور سے بھی قدرے متاثر ہوئی ہے رومی تہذیب جو مختلف تہذیبوں کا مرقع تھی اس سے بھی مغربی افکار نے کچھ چیزیں اخذ کی ہیں۔ رومی تہذیب مختلف تہذیبوں کا مرکب اس طرح بن گئی کہ روم کا اپنا ایک نظام زندگی تھا اس نے یونان کو فتح کر لیا فتح کرنے کے بعد یونانی افکار روم میں منتقل ہونے لگے۔ انھوں نے افلاطون اور ارسطو کے افکار کو قبول نہیں کیا لیکن ایپی کیورس کے فلسفے کو عزت دی اور اس کو قبول کیا کیونکہ اس کا فلسفہ لذت انسانی پر مبنی تھا اور ان کی پرتعیش زندگی کے ہم آہنگ تھا۔ یونانی فکر اور رومی نظریہ زندگی اور اس کے نواہی علاقوں کی تہذیبی زندگی ایک جگہ جمع ہوگئی تو ایک خاص تہذیب وجود میں آئی جسے تہذیب روم کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب نے کچھ سیاہ چراغ اس سے بھی وصول کیے ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

تن پروری:

روم کے لوگ غالبًا دنیا کی تاریخ میں واحد قوم ہے جنہوں نے تن پروی اور عیش پرستی کو اصول کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ (مغرب کے ذہنی انحطاط کی تعریف)

ظاہر پرستی:

ظاہر پرستی کا مرض بھی مغربی تہذیب میں رومن تہذیب کو آئیڈیل سمجھنے کی وجہ سے آیا ہے اور یہ بات حقیقت ہے کہ رومیوں نے فلسفہ میں ترقی نہیں کی بلکہ یہ لوگ اس معاملہ میں یونانیوں کے مقلد تھے حسن عسکری کی تحریر سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ یونانی فلسفے کا تعلق فرد یا معاشرے کی صرف ظاہری زندگی سے تھا باطنی سے نہیں۔

اقتباس:

> ''روم کے لوگوں نے فلسفہ میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا اس معاملے میں وہ یونان والوں کے مقلد تھے یونانی فلسفہ میں انہوں نے صرف خارجی اور ظاہری پہلو کو لیا صرف وہ اصول اخذ کیے جن کا تعلق معاشرے کی ظاہری زندگی سے تھا اگر مغرب میں ظاہر پرستی اتنی بڑھ گئی ہے تو اس میں روم کے لوگوں کی ذہنیت کا بڑا دخل ہے''۔ (مغرب کے ذہنی انحطاط کی تعریف)

نفس کشی:

رومیوں کا خیال تھا کہ انسان کی اصل مصیبت اس کی خواہشات ہیں اگر انسان خواہشات سے بے نیاز ہو جائے اور خوشی کے وقت خوش نہ ہو اور رنج کے وقت رنج محسوس نہ کرے تو اسے مکمل سکون مل سکتا ہے مگر یہ نفس کشی محض نفس کشی تھی کسی قوم کی خدمت کی خاطر یا کسی اعلیٰ ترین جزا و انعام کے لئے نہیں تھی۔ جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایسی نفس کشی کے بارے میں فرماتے ہیں...... نفس کشی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

تمدن روم:

جس طرح نظریات میں اہل مغرب اور اہل روم مشترک ہیں اسی طرح کچھ ادارے اور شعبے جو اولاً روم میں قائم تھے۔ اہل مغرب نے بھی ان کو شعبہ ہائے زندگی میں شامل کرلیا مثلاً جمہوریت کا نظام، بینکاری کا نظام پہلی تہذیبوں میں یہ نظام رائج تھے مغربی فکر وفلسفہ نے وہاں سے اخذ کیے ہیں۔

اہل روم نے جب یونان کو فتح کرلیا تو انہوں نے اپنی سلطنت میں سڑکوں کا جال بچھا دیا اور سمندری روابط بھی دور دور تک قائم ہوگئے پوری دنیا کی اعلیٰ ترین اشیاء سمٹ کر روم کی منڈی میں آجاتیں یہاں پران اشیا کا ریٹ بھی اچھا لگتا تاجروں کو خوب نفع ہوتا روم کی صنعتی اور تجارتی ترقی میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا۔ بینکاری نظام بھی پہلے تہذیب روم سے چلا پھر مغرب نے اسی نظام کو اختیار کرکے صنعتی ترقی حاصل کی۔ ایک اقتباس پیش نظر ہے۔

اقتباس:

> ”صنعتی اور تجارتی ترقی کی بدولت متوسط طبقہ کے اندر ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا جو سود پر روپے کا لین دین کیا کرتا تھا روپے کی لین دین ان بازاروں میں یا ان عمارتوں میں ہوتی تھی جو کاروبار کا مرکز تھیں جنہیں بسلیکا کہا جاتا تھا اس لیے ایک ایسا نظام قائم ہوچکا تھا جو بعد میں یورپ کی تجارت اور صنعتی ترقی کا باعث بنا“۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب: ص212)
>
> اصلاً یہ نظام اہل روم نے تیار کیا تھا پھر اہل مغرب نے اس کو اخذ کیا۔

جمہوریت:

پانچویں صدی قبل مسیح میں دو بڑی سلطنتیں تھیں ان دونوں میں جمہوری حکومت تھی یونان میں جب سقراط کو زہر کا پیالہ پلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا اس وقت یونان میں جمہوریت تھی اسی طرح روم میں بھی پہلے حکومت جمہوری تھی پھر بعد میں آمریت آئی ہے جیسا کہ

(قدیم تہذیبیں اور مذہب) میں ہے۔

اقتباس:

''رومن قانون کو وضع کرنے کے اختیار سینٹ یا سینٹ کی طرف سے نامزد کردہ کمیشن کو ملتے تھے''۔(قدیم تہذیبیں اور مذہب:ص215)

جمہوریت آج کل کا کوئی نیا نظام نہیں بلکہ اہل روم ویونان سے اخذ کردہ ہے اسی طرح دیگر امور زندگی جن کو اول نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ دور حاضر کے ذہنوں کا تخیل کردہ نظام ہے مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ نظام مثلاً بنک' جمہوریت' کھیلوں کے مقابلوں میں اس قدر رانہماک یہ روایات کسی اور تہذیب کی ہیں۔جن کو اہل مغرب نے اختیار کیا ہے۔یہ مختلف قسم کے نظریات اور زمانے میں رائج ہونے والے شعبہ جات جو مغرب نے اختیار کیے ہیں اور مسلمان ممالک بھی ان کو اپنا رہے ہیں مثلاً بنک کا نظام جمہوریت اور کھیلوں میں انہماک یہ طریقے اصلاً اسلامی نہیں ہیں۔

مغربی تہذیب سے آنے والا کوئی بھی نظریہ اور طرزِ زندگی اسلامی نہیں ہے بلکہ یونانی یا رومی ہوگا یا پھر بعد کے ادوار میں ان کے تمدن میں داخل ہوگیا ہے اسلام سے نہیں لیا گیا اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم ان کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں اور نظامِ کفر کی محض ظاہری قطع وبرید کر کے اسلام کے سانچے میں ڈھال لینے سے مطمئن نہیں ہوا جاسکتا کیونکہ کفر یہ تخم پھر بھی اپنا اثر ضرور رکھتا ہے اگر وہ نظام اپنی بنیاد وانجام اور طریقہ کار کے اعتبار سے اسلامی اصولوں پر پورے اتریں تو اپنانے میں کوئی حرج نہیں یا کچھ ردوبدل کر کے ہمارے اسلامی اصولوں کے مطابق وہ نظام بن جائیں تو تب بھی ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وگرنہ اصلاً ان کو نظامِ کفر ہی سمجھنا چاہیے اور محض ظاہری تبدیلی کو کافی خیال نہ کیا جائے۔

بلاوجہ ان کے طریقہ زندگی کو اسلام سے ماٴخوذ سمجھ کر اپنانا اور یہ فکر وسوچ رکھنا کہ اگر اس میں کوئی قباحت ظاہر ہوگی تو ترک کردیں گے یہ سوچ غلط ہے اور مغرب اور یورپ کے نظامِ زندگی کو اسلام سے ثابت کرنا لاحاصل سعی ہے اپنی تاریخ کا انکار ہے کیونکہ کافر تو

کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوسکتا ہے اس کو اسلام میں داخل ہونے کی اجازت ہے مگر نظام کفر (جس کی بنیاد ہی کفر پر ہو) کو کلمہ نہیں پڑھایا جاسکتا ہے وہ کفر کا کفر ہی رہے گا۔

ازمنۂ وسطیٰ یا دورِ عیسوی

مغربی افکار کی تاریخ میں یونانیوں اور رومیوں کے بعد عیسوی دور آتا ہے جسے ازمنۂ وسطیٰ کہا جاتا ہے یہ دور پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا تھا اس دور میں بھی یونانی و رومی فلسفہ زندہ تھا مگر وہ مذہب کے تابع تھا۔ ازمنہ وسطی کا فلسفہ دینیات کی ایک مستقل شاخ تھا بلکہ اس دور کے فلسفی پروفیسر اور سائنسدان راہب ہوا کرتے تھے اس ہزار سالہ دور میں یوں تو بے شمار مفکرین و فلاسفر آئے لیکن دو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

1۔ سینٹ اگسٹین ST.Augus Tine

2۔ سینٹ ٹامس اکوائناس ST. Thomas Aquinas

سینٹ اگسٹین کی فکر کا مرکز خدا سے قرب کا حصول تھا وہ خود لکھتا ہے۔

اقتباس:

”میں خدا کی معرفت اور روح کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں اس کے سوا کچھ نہیں“۔ (سرسید و حالی کا نظریہ فطرت:146)

یہ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کا مفکر ہے اس نے کئی نظریے پیش کیے جو افلاطون اور ارسطو کے فلسفے میں رنگے ہوئے تھے اگرچہ یہ خود مخلص تھا مگر کچھ ایسے نظریات بھی اس نے چھوڑے جو بعد میں سیکولرازم کے لیے مضبوط جواز فراہم کرتے تھے۔

مثلاً: City of men اور City of God کا نظریہ و فکر سب سے پہلے اسی نے عیسائیوں کو دیا۔

چونکہ عیسائی نظریات فلسفہ یونان و روم پر قائم تھے ابن رشد نے بارہویں صدی

میں فلسفہ کو بنیاد بنا کر فلسفہ عیسائیت پر ایسے اعتراضات قائم کیے کہ ساری عیسائیت متزلزل ہوگئی ان اعتراضات کی زد میں ان کے اساسی عقائد تک رد ہو رہے تھے۔

سینٹ ٹامس اکوائناس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے عیسائیت کو ابن رشد کے اعتراضات سے بچایا اور ابن رشد کے فلسفے کو شکست دی اور دوبارہ ارسطو کے فلسفے کو عیسائی عقائد کے ہم آہنگ کیا جیسا کہ محمد حسن عسکری لکھتے ہیں۔

اقتباس:

بارہویں صدی میں مغرب پر سب سے شدید اثر ابن رشد کا تھا عیسوی دنیا میں سب سے بڑا دینی مفکر سینٹ ٹامس اکوائناس سمجھا جاتا ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ تیرہویں صدی میں اس نے ابن رشد کے فلسفے کو شکست دے کر عیسوی الہیات اور دینیات کو ارسطو کے فلسفے کی بنیاد پر قائم کیا۔

ابھی ایک سو سال ہی گزرنے پائے تھے کہ بعض مفکرین نے ارسطو کے فلسفے پر اعتراضات شروع کر دیئے اس وقت ارسطو کے فلسفہ پر اعتراض کرنا عیسائیت پر اعتراض کرنے کے مترادف تھا اسی دن سے یورپ میں دینی انحراف اور تلبیس کا دروازہ کھل گیا:

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

شاخ نازک پہ جو آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سینٹ اکوائناس کے اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ارسطو پر کیا جانے والا اعتراض عیسائیت کی طرف لوٹتا اور عیسائیت کے ایمانیات کو رد کرتا جس کی وجہ سے مذہبِ عیسائیت کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

مغربی تہذیب کا ارتقاء عیسائیت کی شکست و ریخت کا نتیجہ ہے عیسائیت میں خدا اور بندے کے باہم تعلق کے لئے احکام موجود تھے لیکن بندے کا بندے کے ساتھ تعلق کیا ہوگا اس کے بارے میں احکام شرعیہ کیا ہیں حقوق العباد کیا ہوتے ہیں اس طرح کے احکام واضح نہ تھے لہٰذا سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل نو کے لئے جو قوانین مرتب کیے گئے وہ

بنیادی طور پر رومی قوانین سے اخذ کردہ تھے جو کہ بنیادی طور پر سیکولر نوعیت کے تھے عیسائی فکر میں ریاست اور معاشرہ کا تصادم بنیادی طور پر ابتداء ہی سے موجود تھا جس وجہ سے ایک عیسائی مفکر آگسٹین (Agustin) نے اس نظریے کا برملا اظہار کیا City of men کو City of God سے الگ کر دیا اس سے سیکولرازم کے لئے ایک مضبوط جواز فراہم ہوا۔

نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہب کی تحریک

مذہبی جوش وجذبہ لوگوں کے دلوں سے کم ہوتا چلا جا رہا تھا ایک نئی قسم کی انسان پرستی شروع ہونے کو تھی یہ انسان پرستی کا نیا ولولہ ازمنہ وسطیٰ کی دیرینہ ﴿عیسائیت کے عقائد﴾ مابعد الطبعیاتی روایتوں کا ایک طرح کا ردعمل تھا اب انسان اپنی نام نہاد عظمت پہچان چکا تھا اور ازمنہ وسطیٰ کی مذہبی بندشوں سے آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن ایک ایسے مذہبی تصور پر ایمان رکھتا تھا جس میں ازمنہ وسطی کے عیسوی عقائد کی بنیادیں تو قائم تھیں لیکن ان کو خاصی حد تک سہل اور آسان کر دیا گیا تھا۔ دین میں سہل پسندی اس بات کی طرف بھی نشاندہی کرتی تھی کہ جدید انسان کی مذہبی دلچسپی میں کمی آرہی ہے اور دنیاوی معاملات میں بے پناہ رغبت ہے۔ اصلاحِ مذہب کے نام پر جو تحریک اٹھائی گئی یہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی لادینیت کا پیش خیمہ تھا۔ اصلاح مذہب کی تحریکوں نے جو بیج بوئے ان کی بدولت آنے والی صدیوں میں لادینیت اور انسان پرستی کا ایسا دور دورہ ہوا کہ آخر کار مذہب اور دنیاوی معاملات کو جدا جدا سمجھا جانے لگا اور انسان کا جو زندگی کے بارے میں ایک مکمل اور مجموعی نظریہ تھا ٹوٹ کر رہ گیا انسان اپنے کو آزاد مطلق العنان (خدا) سمجھنے لگا اور اس کائنات کو مسخر کرنے کی فکر میں لگ گیا اور سائنسی ایجادات کو ہی اپنی فتح قرار دینے لگا۔

دوسری طرف عیسائیت میں مذہبی دھڑے کی ایک طبقاتی حیثیت کے واضح جواز موجود تھے مثلاً پادری شادی نہیں کرے گا رہبانیت اختیار کرے وغیرہ یہ ایسی چیزیں تھیں جو معاشرے سے کٹ جانے کا مذہبی تصور پیش کرتی تھیں اس غیر فطری طبقہ بندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ طبقاتی کشمکش بہت بڑھ گئی۔

عیسائی علماء نے مذہب کی من مانی تعبیر اور تشریح کرنی شروع کی ہوئی تھی اس سے عام افراد مذہب سے باغی ہوتے گئے کیتھولک چرچ (کٹر مذہبی طبقہ) سے پروٹسٹنٹ الگ ہو گئے۔

پروٹسٹنٹ گروہ کا بانی مارٹن لوتھر بذات خود ایک پادری تھا اس نے تحریک اصلاح دین کی بنیاد رکھی وہ پاپائیت کے خلاف کھڑا ہوا۔مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی افراد بھی سیکولر ہوتے چلے گئے کیونکہ سیکولرازم کی بنیادیں اسی تحریک کے اندر شامل تھیں۔

پروٹسٹنٹ ازم کے بنیادی نکات:

1۔ ہر عیسائی کو بائبل کی تفسیر کرنے کا مکمل، یکساں اور مساوی حق ہے۔

2۔ خدا اور بندے کا باہمی تعلق حضرت عیسیٰؑ کی آمد تک ختم ہو چکا ہے۔

3۔ کسی کو کسی کے معاشرتی مرتبے کے تعین کا کوئی مذہبی استحقاق حاصل نہیں۔

4۔ لہٰذا دنیوی کامیابی کو اخروی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا جائے۔

ان اصولوں کی بنیاد پر جو اقداری اجزاء معاشرتی طور پر ابھر کر سامنے آئے مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔	آزادی	Freedom
2۔	مساوات	Equality
3۔	عقلیت	Rationality

گو اس دور میں روایتی قدروں پر زیادہ انحصار تھا لیکن ڈیکاٹ کے خیالات اور دیگر سائنسی نظریات اور حیران کن دریافتوں نے اس عمارت کو جو قدیم قدروں، مفروضوں اور عقائد سے بنی تھی متزلزل کر دیا۔اس وقت جو سائنسی علوم ترقی کر رہے تھے اور نئی نئی دریافتیں اور ایجادات پیش کی جا رہی تھیں اس سائنس اور اس سے پہلے کی سائنس میں ایک فرق تھا موجودہ سائنس کے علوم سے مابعد الطبعیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور اس کو صرف دنیاوی مفاد اور بہبود کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھ لیا گیا تھا حالانکہ اس سے قبل سائنس حقیقت کو معلوم کرنے اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہتی

تھی۔لیکن اس دور میں یہ نظریہ تبدیل ہوگیا اور آج تک وہی مابعدالطبعیاتی تصور کے بغیر چلا آرہا ہے اس جدید سائنس کو سوشل سائنس کہتے ہیں جس میں بحث صرف مادے سے ہوتی ہے۔

سوشل سائنس کا مقصد نظام عالم کی تحقیق اور جانچ پڑتال کی بجائے نظامِ فطرت کو عقل انسانی کے زور سے اپنی خواہش کے تابع کرنا ہے۔مثلاً فطرت کے نظام میں ایک جگہ گرمی ہے مگر انسان کو خواہش ہے کہ فلاں جگہ گرمی کی بجائے سردی ہوتو اس خواہش کی تسکین کے لئے سوشل سائنس نے A.C تیار کیا۔اسی طرح نظام قدرت میں کسی جگہ سردی ہے مگر بندہ گرمی چاہتا ہے تو سوشل سائنس کی مدد سے ہیٹر ایجاد ہوا جس نے بندے کی چاہت کے مطابق گرمی کردی۔

سترھویں صدی

اب ہم مختصر ساخاکہ سترھویں صدی کے سائنسدانوں کا پیش کرتے ہیں اور فلسفیوں کے افکار پر ایک نظر ڈالتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ مذہب عیسائیت میں شکست وریخت کا جو کام سولھویں صدی میں شروع ہوا تھا اس کی تکمیل سترھویں صدی میں کس طرح ہوئی جس چیز کو دورجدید کہتے ہیں وہ کس طرح وجود میں آئی یہ وہ صدی ہے جب انسانی ذھن اور انسانی زندگی میں ایک بنیادی انقلاب واقع ہوا اور ایک نئے قسم کا انسان نمودار ہوا جو اپنے سے پہلے والے انسان سے ہر علاقہ منقطع کرنے پر مصر تھا یہ انقلاب پہلے تو یورپ میں آیا پھر انیسویں صدی میں اس کے اثرات مشرقی ممالک پر بھی پڑنے لگے۔

سترھویں صدی کے وسط تک لوگ یہ طے کرچکے تھے کہ انسان کی جدوجہد کا میدان یہ مادی کائنات ہے اور انسان کا مقصد حیات تسخیر فطرت یا تسخیر کائنات ہونا چاہیے اس دور میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انسان صرف عقل پر بھروسہ کرسکتا ہے اس کی ہر طرح کی رہنمائی کے لیے عقل کافی ہے۔کیونکہ یہی چیز انسانوں میں مساوی ہے اور سارے انسان

اس میں مشترک ہیں۔انسان کی مکمل رہنمائی انسان کی عقل کرسکتی ہے۔

عقلیت کے دور کے دو بڑے امام گزرے ہیں۔

1۔ڈیکاٹ　　　　2۔نیوٹن

یہ دونوں کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے ایک تو فرانس کا فلسفی اور ریاضی دان تھا جسے ڈیکاٹ کہا جاتا ہے(Dercarter)اور دوسرا انگلستان کا سائنسدان تھا جسے نیوٹن کہا جاتا ہے۔

ڈیکاٹ یوں تو رومن کیتھولک پادری تھا اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کے شکوک وشبہات کو دور کرکے دینِ عیسوی کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن نتیجہ الٹا نکلا مغرب کے ذہن کو مسخ کرنے کی جتنی ذمہ داری اس پر ہے شاید ہی اور کسی پر ہو۔فرانس کے ایک رومن کیتھولک مصنف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ فرانس نے خدا کے خلاف جو سب سے بڑا گناہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ڈیکاٹ کو پیدا کیا ہے۔اس نے انسان کی تعریف اور اس کی حیثیت کا تعین یوں کیا ہے۔

میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں　　　　I think therefore I am.

گویا کہ اس نے انسان کے وجود کا انحصار اس کے ذہن پر رکھا۔ ہر چیز میں صحیح وسقم الگ کرنے کا پیمانہ انسانی عقل کو قرار دیا۔

<u>نیوٹن کی گمراہی:</u>

عقل پرستی کا دوسرا بڑا امام نیوٹن ہے سائنس میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ کششِ ثقل کے قانون کی دریافت ہے لیکن مغربی ذہن پر اس کا اثر بہت گہرا پڑا۔ یہ قانون وضع کرکے اس نے گویا یہ کہہ دیا کہ کائنات کا نظام چند واضح قوانین پر چل رہا ہے اگر انسان اپنی عقل سے مدد لے کر ان قوانین کو جان لے تو ساری کائنات اور فطرت پر قابو پاسکتا ہے۔قوانین دریافت کرنے میں وقت لگے گا مگر انسان کو یہ امید رکھنی چاہیے کہ ایک دن فطرت کو فتح کرلے گا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ سائنس نیوٹن کے نظریات سے بہت آگے چلی گئی اور اس کا تصورِ کائنات کا نظریہ رد کردیا گیا۔مگر اس نے جو ذہنیت پیدا کردی تھی وہ آگے مزید بڑھتی چلی گئی

۔انسان فطرت کو فتح کرنے اور کائنات کو مسخر کرنے کی فکر میں آج تک سرگرداں ہے اور میدان عمل میں کوشاں ہے اپنی کامیابی کے لئے مطمع نظر اسی کو قرار دے رکھا ہے۔

نیوٹن کے نزدیک کائنات اور فطرت ایک بے جان مشین ہے اور انسان ایک انجینئر کی طرح ہے۔کائنات کے اس نظریے کو میکانیکیت کہتے ہیں۔انیسویں صدی میں بعض مفکرین نے اس کو رد کردیا اور یہ ثابت کردیا کہ کائنات یا فطرت بھی انسان کی طرح جان رکھتی ہے اور نمو بڑھوتری اس کی بنیادی خصوصیت ہے اور کائنات خود اپنی توانائی سے زندہ ہے۔

اس نظریے کو نامیاتی نظریہ کہتے ہیں۔

ایک گروہ میکانیکیت کا قائل ہے دوسرا نامیت کا قائل ہے۔

فرد اور معاشرے کی حیثیت:

عقلیت کے دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی اور انسانی فکر میں سب سے اونچی جگہ معاشرے کو دے دی۔ان کا خیال تھا کہ فرد ہر قول وفعل میں معاشرے کا پابند ہے یہ لوگ مذہب کو بھی اس حد تک قبول کرتے تھے جس حد تک مذہب معاشرے کے اندر ضم ہو سکتا ہو غرضیکہ معاشرے کو بالکل خدا کی حیثیت دے دی جس کو معاشرہ یعنی لوگوں کا گروہ صحیح کہے وہ صحیح ہے اور جس کو معاشرہ برا قرار دے وہ شے قابل عمل نہیں ہونی چاہیے وہ بری ہے۔

اس کے خلاف ردعمل انیسویں صدی میں ہوا اور معاشرے کی بجائے فرد کو اہمیت دے دی گئی پہلے خیر اور شر پہچاننے کا پیمانہ معاشرہ تھا یعنی خدا کا کام خدا کی حیثیت معاشرے کو حاصل تھی اور پھر ہر فرد کو دے دی گئی۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان کا مطمعِ نظر انسان ہے وہ بحیثیت فرد ہو یا معاشرہ اعلیٰ اتھارٹی وہی قرار پائے گا۔مغرب انسان پرستی کا دعوے دار ہے معاشرے کو اوپر رکھے یا فرد کو بات ایک ہی ہے۔

اٹھارھویں صدی

سترھویں صدی کے تمام قدیم بطلیموس اور ارسطو کے پیش کردہ مفروضے اور نظریے سرے سے رد کردیئے گئے اور نظام شمسی کا مرکز زمین کی بجائے سورج قرار پایا گلیلو نے جب

دور بین ایجاد کی تو نئے سائنسی نظریات اور ڈیکاٹ کے زیر اثر رہنے والے عقل پرستوں کو بہت فروغ ملا اٹھارھویں صدی میں دیگر نمایاں رجحانات پیدا ہوئے اگرچہ ان کا اثر مشرقی ممالک میں انیسویں صدی عیسوی میں پہنچا مثلاً ہر چیز میں تنقید اور تضحیک کی لت عقل اور معلومات عامہ پر زور، خدا خوفی کا فقدان، سائنس پر حد درجہ کا اعتماد، وحی و روحانی معاملات سے بددلی، لادینیت اور ایک فطری مذہب کی تلاش، اس کے علاوہ اخلاقیات پر زور بڑھتا گیا۔حتیٰ کہ عام خیال ہو گیا کہ مذہب کی بنیادیں اخلاقی قانون پر ہیں اس لیے اگر خدا اس اخلاقی دائرہ میں سرگرم ہے تو وہ ایک دانشمند اور پسندیدہ خدا ہے اور اگر وہ اپنی من مانی کرتا ہے تو وہ اچھا نہیں اور نہ ہی وہ دانشمند ہے اور اگر خدا کسی اخلاقی قانون کا پابند ہو جاتا تو اس کی منشأ گیری حق ہے۔انسان بہرحال اپنی عقل سے کسی دوسری مدد یعنی وحی وغیرہ کے بغیر صحیح وسقم درست وغلط میں امتیاز کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔اس قسم کا رجحان پیدا ہوا۔

انیسویں صدی

عقلیت کے دَور کے بعد انیسویں صدی مغربی تہذیب کے ارتقاء کا ایک جزو ہے یہاں سے پیچیدگیاں شروع ہو جاتی ہیں بعض لوگ اس صدی کو صنعتی انقلاب کا دور کہتے ہیں بعض اسے سائنس سے پیدا ہونے والے انقلاب کا زمانہ کہتے ہیں۔دین کے بارے میں زیادہ تر شکوک وشبہات اور دین سے بے نیازی اسی دور میں پیدا ہوئی۔

انیسویں صدی میں تقریباً یہ بات طے ہو گئی کہ مذہب حسی ومادی کائنات کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا نقطہ نظر صرف مادی دنیا قرار پائی۔

اس دَور میں بھی چند بنیادی نظریات نمایاں ہوئے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

آزادانہ اخلاقیات کا فلسفہ: اس دور کے مفکرین نے اخلاقیات کا ایک اور نظریہ پیش کیا دنیا میں ہر معاشرے میں اخلاقیات کا انحصار مذہب پر رہا ہے اور اخلاقیات کو مذہب کا ایک شعبہ سمجھا گیا ہے یہی حال مغرب کا بھی تھا لیکن اٹھارھویں صدی میں کوشش کی گئی کہ اخلاقیات کی بنیادیں وحی پر نہیں بلکہ انسانی عقل پر رکھی جائیں کئی مفکرین نے اخلاقیات

کے اصول تو وہی رکھے جو پہلے سے چل رہے تھے لیکن اخلاقیات کو مذہب سے الگ کر دیا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ ایسا نیک کام جو جنت کے لالچ میں یا جہنم اور خدا سے ڈر کر کیا جائے۔ وہ نیکی نہیں کہلائے گا بلکہ نیکی تو وہ ہے جس سے انسان کا دل خوش ہو چنانچہ انہوں نے اخلاقی اقدار کو اصول کے طور پر رکھا یہ لوگ کہتے تھے کہ انسان کی فطرت پاک ہے اور وہ خود بہترین اخلاقی اصول پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا انسان کی عقل ہی اخلاقی اصول وضع کرے گی۔

یہ لوگ اخلاقیات کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ مذہب کو بھی محض ایک اخلاقی نظام سمجھتے تھے یا پھر مذہب کو اخلاقیات کا شعبہ قرار دیا جاتا تھا۔ عقائد کے علاوہ عبادات سے بھی انیسوی صدی کے لوگ عموماً خفا تھے وہ ان کو غیر ضروری سمجھتے ان کا نام رسوم یا رسم و رواج رکھتے یہاں بھی پروٹسٹنٹ ذہنیت کام کر رہی تھی جس نے رومن کیتھولک عبادات کو ترک کر دیا تھا یہ لوگ کہتے تھے کہ خدا کے لئے مقرر شکلوں اور اشاروں سے عبادت کرنا ضروری نہیں بس خلوص کافی ہے۔

اس خلوص کو یہ لوگ اصل مذہب قرار دیتے تھے اس طرح انیسویں صدی میں مذہب کی بجائے ایک جعلی مذہب رائج ہو گیا۔ عبادات کو غیر ضروری رسوم و رواج کہنا اب ہمارے ہاں بھی چل پڑا ہے۔ اس عقیدے کا اظہار ڈھکے چھپے الفاظ میں کنایہ و تشبیہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

آزاد خیالی

اس کا مطلب ہے مذہب کی کھلم کھلا مخالفت کرنا یا مذہب میں شکوک و شبہات پیدا کرنا۔ انیسویں صدی میں جس چیز نے آزاد خیالی کو تقویت دی وہ ہے ڈارون کا نظریہ اس نظریے کی کوئی مضبوط دلیل اگرچہ نہ پہلے تھی اور نہ اب تک دی گئی اور دور حاضر میں تو شدت سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ نظریہ مذہبی عقیدے کی طرح لوگوں میں جڑ پکڑ گیا اس نظریے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی کے ذہن میں یہ سوچ راسخ ہو جاتی ہے کہ یہ دنیا اچانک سے وجود پذیر نہیں ہوئی اور انسان بھی موجودہ حالت میں ترقی کر کے پہنچا ہے اور مسلسل تبدیلی قانون فطرت کے بنیادی عوامل میں سے ہے۔

ڈارون نے اپنے اس نظریے کا نام ارتقاء رکھا یہ دراصل غلط عنوان دیا گیا کیونکہ

ڈارون نے تو صرف یہ دیکھا تھا کہ فطرت میں اندرونی اور بیرونی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔اس کے برخلاف لفظ ''ارتقاء'' کا ایک اخلاقی مفہوم ہے یعنی ''پہلے سے بہتر ہوتے چلے جانا'' چنانچہ یہ نظریہ غلط تھا یا صحیح اس بحث سے قطع نظر بہرحال لفظ ارتقاء نے جادو کا سا اثر دکھایا اور اپنے اخلاقیاتی یا فلسفیانہ مفہوم کی بناء پر یہ نظریہ فوراً مقبول ہوگیا اور ہر دلعزیز ہوگیا۔ پھر اس نظریے کا غیر منطقی نتیجہ لوگ یہ نکالنے لگے کہ فطرت نے تو ہزاروں قسم کے جانور پیدا کیے ہیں سب اپنے وقت پر فناء ہوگئے ۔بس انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو برابر ترقی کرتا چلا جا رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسان پر بہت مہربان ہے اور یہ مہربانی آئندہ بھی جاری رہے گی پھر یہ ترقی مادی ہی نہیں بلکہ اخلاقی ذہنی اور تہذیبی بھی ہوگی غرض انسان ہمیشہ سے ہر معنی میں ترقی کرتا چلا آ رہا ہے اور ہمیشہ اسی طرح ترقی کرتا رہے گا اس لیے انسان کا فرض ہے کہ اپنی طاقتیں ترقی کے کام میں لگا دے۔

بیسویں صدی

یہ دور بھی نہایت اہم اور پیچیدہ ہے اہم تو اس لیے کہ مغرب نے اس دور میں موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، مصنوعی سیارے اور اس قبیل کی چیزیں ایجاد کر کے اپنی مادی ترقی کا اظہار کیا ہے اور اپنی طاقت کا برملا مظاہرہ کیا ہے اور یہ بھی دکھایا ہے کہ مغرب کے پاس اپنے نفس کی تسکین کے لئے کتنا کچھ ہے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے کیا کیا اسباب مہیا کر لیے ہیں۔

ان وسائل اور مادی ترقی وسائنسی انکشافات کو دیکھ کر اہل مشرق کا ذہن بھی بہت زیادہ متاثر اور مرغوب ہوگیا مغربی اقدار کو اہمیت کی نظر سے دیکھنے لگے اور بڑی تیزی سے مشرق بھی مغرب بنتا جا رہا ہے۔

اہل مغرب کی شان کا بت اس قدر مضبوطی سے ان کے دلوں میں بیٹھا کہ اہل مشرق کو اپنی اقدار اور روایات فرسودہ معلوم ہونے لگیں آہستہ آہستہ مغرب اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ مشرقی ممالک میں منتقل ہو رہا ہے اور نوجوان نسل کے ذہن اس کی مادی

ترقی سے مفلوج و مرعوب ہو کر رہ گئے ہیں۔

بیسویں صدی پیچیدہ اس لیے ہے کہ یہ دور نہ تو محض عقل کا دور ہے نہ محض سائنس کا نہ ہی محض اشتراکیت کا نہ محض بے دینی کا اس دور کی حقیقت یہ ہے کہ سارے رجحانات اور سارے افکار اپنے تضاد کے باوجود بیک وقت موجود ہیں اور ان کے اندر کسی قسم کی درجہ بندی بھی نہیں ہے ان سب کو ایک سطح پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔

عموماً ایک ہی شخص کے ذہن میں دو بالکل متضاد رجحان کام کرتے ہیں اسے کبھی ایک طرف لے جاتے ہیں اور کبھی دوسری طرف لے جاتے ہیں **صراط مستقیم** پر عمل مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

شاید اسی وجہ سے علماء امت پورے اخلاص کے ساتھ کسی ایک فتنہ کا تعاقب کرتے ہیں ابھی وہ فتنہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا فتنہ جنم لے لیتا ہے اسی طرح فتنے شکل بدل بدل کر سامنے آتے ہیں **اللھم احفظنا من الفتن**.

یہ مختصر ساخاکہ ان ادوار کا ہے جن میں مختلف عقائد اور نظریات اہل مغرب کے اندر رائج ہوئے ہیں۔

مغربی دنیا

مغربی تہذیب چند جغرافیائی حد بندیوں کی مرہون منت نہیں بلکہ یہ مخصوص عقائد' اقدار اور نظریات پر مبنی ذہنیت ہے۔ تمام وہ ممالک جو آزادی، مساوات اور ترقی کو قدر یعنی خیر اور شر جانچنے کا آلہ گمان کرتے ہیں وہ سب مغربی ذہنیت کے ممالک ہیں اس لیے ان کو مغربی ممالک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے امریکہ روس چائنہ اگرچہ یہ ممالک مغرب میں واقع نہ ہوں یعنی شمال و جنوب میں ہوں۔

کسی بھی تہذیب میں انسان کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہوتا ہے۔ اس تہذیب نے انسان کا جو بھی مقام تصور کیا ہو اسی سے باقی عقائد پھوٹتے ہیں اگر اس خاص تصور

انسان کو اپنا لیا جائے تو اس تہذیب کو انہی علمی بنیادوں پر رد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

کسی بھی تہذیبی غلبہ میں اگرچہ عسکری عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ محض عسکری بنیادوں پر حاصل کیا ہوا غلبہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتا ہے۔ کسی تہذیب کا زوال اس کی علمی بنیادوں کی شکست وریخت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم طرح طرح کے مسائل کا شکار ہیں اور اپنی اسلامی علمیت سے تمام تر اخلاص کے باوجود محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی اساسی بنیادوں کو نہ جاننے کی وجہ سے اس کو نا قابل شکست تسلیم کر لیا ہے اور اسلامی تعلیمات میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ مغربی فکر کو نہ جاننے کی وجہ سے اسلام میں طرح طرح کی تاویلیں کر کے مغربی فکر کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آزادی ومساوات کو اسلام سے ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی جاتی ہے مغرب کی مادی ترقی دیکھ کر اس کی ترقی کو اسلام کی مرھون منت قرار دیتے ہیں اور دور تنویر کو اسلامی فکر کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ مغرب کی فکر کو سمجھا جائے اہلِ مغرب کے اصل روپ کو دیکھے بغیر اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے اور مقابلے میں بھی یہ طرز اختیار کرنا کہ پہلے ان کے اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے پھر انکا مقابلہ کیا جائے یہ عظیم حماقت اور غلط طرز عمل ہے۔

اس لیے ہم پہلے ان اصولوں پر بحث کریں گے کہ ان کا معنی اور مفہوم کیا ہے ان اصولوں کو اپنانے سے کیا کیا خرابیاں لازم آتی ہیں؟ آیا صحیح یا سقم کو جانچنے کا آلہ یہ اصول بن سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ اصول کس علمیت سے اخذ کردہ ہیں؟ ان اصولوں کا مظہر کیا ہے؟ یعنی کس منشور میں ان اصولوں کو استعمال کیا گیا؟

تہذیب مغرب میں بنیادی اصول تین ہیں۔

آزادی　　　　مساوات　　　　ترقی

آزادی (Freedom)

مغربی فکر وفلسفہ کو سمجھنے کیلئے آزادی (Freedom) کے بارے میں جاننا نہایت

ضروری ہے۔اس پر ہم جو بحث کریں گے اس کو چند حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور مغرب کو ہم ویسا ہی دیکھ سکیں جیسا کہ وہ ہے۔

نمبر 1: آزادی بذات خود کیا ہے؟

نمبر 2: اسلام میں آزادی کا تصور۔

نمبر 3: تہذیب مغرب میں آزادی کا مفہوم کیا ہے؟

نمبر 4: آزادی کی کتنی قسمیں ہیں۔

نمبر 5: مسلمانوں میں نظریہ آزادی (Freedom) کی طرف رجحان کیسے اور کیوں بڑھا۔

نمبر 6: آزادی، حریت، عبدیت، غلامی کا تصور و معانی۔

نمبر 7: آزادی کے مغربی تصور سے پیدا ہونے والے مسائل۔

نمبر 8: (عدم آزادی) غلامی کا تصورِ اسلامی۔

نمبر 9: اس نظریے کا بانی کون ہے۔

آزادی بذات خود کیا ہے؟

آزادی بذات خود کیا ہے؟ سوال گو کہ آسان ہے مگر اس کا جواب آسان نہیں ہے۔آزادی بنیادی طور پر حدود و قیود کی عدم موجودگی'' کا نام ہے۔

عام طور پر آزادی سے مراد کسی انسان کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے چاہ سکے اور اپنی چاہت کو قابل عمل بنا سکے چنانچہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ آزادی محض ایک رقبہ ہے اور آزادی کی بڑھوتری اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اس خالی رقبہ کو لامحدود وسعتوں تک پھیلا دیا جائے تاکہ انسان ایک لامحدود رقبہ میں اپنی الوہیت کا اظہار کر سکے اور اس اظہار کے حوالے سے کسی کے آگے جواب دہ نہ ہو کیونکہ اس کی آزادی ایک ایسی طاقت ہے جس نے اس کو ایک خصوصی صلاحیت بخشی ہے۔

اصلاً آزادی کی کوئی ٹھوس شکل نہیں بلکہ محسوس کرنے کی بات ہے اگر اس کو حاصل کرنے کے اعتبار سے اس کی ٹھوس شکل تلاش کی جائے تو سرمائے کے علاوہ اور کچھ

نہیں کیونکہ جس کے پاس جس قدر سرمایہ ہے وہ اس قدر آزاد ہے کیونکہ وہ سرمائے کے زور پر تسخیر کائنات زیادہ سے زیادہ کر کے اپنی (الوھیت) من چاہی زندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔

اہلِ مغرب جس آزادی کی بات کرتے ہیں اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ بندہ مطلق العنان ہے یہ ہر طرح کی مذہبی جکڑ بندی تہذیبی اور روایتی اقدار کی پابندی اور خاندانی دباؤ سے آزاد ہے۔ جو انسان اپنے آپ کو کسی بھی دوسری طاقت (دوسری طاقت والدین بھی ہو سکتے ہیں معاشرہ بھی، خدا بھی، مذہب بھی) کے سامنے جھکا دے وہ انسان کہلانے کا حق دار نہیں ہے اس لیے کہ اس نے اپنے بنیادی آئیڈیل (آزادی) کو چھوڑ دیا ہے۔

اسلام میں آزادی کا تصور

اس بحث کو شروع کرنے سے قبل آزادی، حریت، غلامی اور عبدیت و بندگی میں فرق سمجھ لینا ضروری ہے پھر ان کی حیثیت کا تعین کرنا آسان ہوگا۔

مغربی فکر و فلسفہ میں آزادی کا مطلب ہے مطلق العنانی، مادر پدر آزادی، خدا، رسول، مذہبی جکڑ بندیوں اور روایتی پابندیوں سے آزادی۔

اس مادر پدر آزادی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے اسلام کی نظر میں ایسا آدمی جانور سے بھی بدتر ہے۔ انسانیت کا شرف بندگی ہے۔ عبدیت اسکی معراج ہے خدا نے اپنے رسول ﷺ کو ایک عظیم لقب جو عطا فرمایا وہ ہے (عبد) اور حضور ﷺ بھی اسی صفت کو پسند فرماتے تھے۔ (عبدہ ورسولہ) اس لیے مسلمان کا مطمع نظر اللہ کی بندگی ہے۔

مغربی فکر اور تصور آزادی کو اسلام دھریت، بے دینی، لامذہبیت قرار دیتا ہے جو صریح گمراہی، عین ہلاکت اور خسران فی الدنیا والآخرہ کا سبب ہے۔

مغربی مفکرین بغیر کسی شرمندگی کے نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں اس مادر پدر مطلق العنان آزادی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کی طرف دعوت عام دیتے ہیں اور عالمی منشور کے ذریعے اسی مادر پدر آزادی کو تحفظ دینے کیلئے کوشاں رہتے ہیں اور عالمی معاہدات کے ذریعے اسلامی ممالک کو بھی اسی مادر پدر مطلق العنان آزادی جو درحقیقت لادینیت ہے

اس کو فروغ دینے کیلئے مجبور کرتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی آزادی اسلام کے خلاف ہے اور اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

مذہب کس قدر آزادی دیتا ہے؟

انسان جس بھی مذہب یا معاشرے میں زندگی گزارتا ہے اس میں کسی کے ہاتھ یا پاؤں باندھے تو نہیں جاتے کہ ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا جاتا ہو بلکہ وہ فرد معاشرے میں آزادانہ طور پر اُٹھ بیٹھ سکتا ہے۔ کھا پی سکتا ہے۔ اتنی آزادی صرف اسلام ہی نہیں بلکہ تمام مذہب تمام تہذیبیں دیتی ہیں جب اتنی آزادی ہر معاشرہ اور ہر تہذیب دیتی ہے تو محاذ آرائی و جستجو آج کل کس بات کی ہو رہی ہے۔ جگہ جگہ یہی نعرہ مقصود و مطلوب ہے کہ فلاں کی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔ واضح رہے کہ مذہب یا معاشرے آزادی دیتے ہیں بطور صلاحیت کے نہ کہ بطور حق یعنی آزادی کو پرکھا جائے گا کسی اور چیز پر مذہب یا معاشرتی اقدار پر اگر اس کے مطابق ہو تو ٹھیک وگرنہ آزادی نہیں دی جائے گی۔

دراصل مذہب خیر بھی متعین کرے گا شر بھی متعین کرے گا کہ فلاں چیز میں خیر ہے بھلائی ہے اس کو اختیار کرو اور فلاں چیز شر ہے برائی ہے اس کو اختیار ہرگز نہ کرنا۔ شر اور خیر کی تعیین کے بعد بندے کو آزادی ہوتی ہے کہ شر کو اختیار کرتا ہے یا خیر کو مثلاً سچ بولنا خیر ہے نیکی ہے اب بندے کو اختیار ہے بندہ آزاد ہے سچ بول کر رب کو راضی کرے یا جھوٹ بول کر اپنی قبر کو برباد کرے۔ اسی طرح نماز پڑھنا خیر ہے اور چھوڑنا شر ہے اب بندہ آزاد ہے پڑھے یا نہ پڑھے کسی نے بیڑیوں میں تو جکڑا ہوا نہیں ہے کہ اس کو کھینچ کر کوئی نماز کیلئے لے جائے گا۔ یا جھوٹ بولنے سے اس کی زبان پر کوئی گرہ آ جائے گی۔

کسی کی غیبت کرنا بری بات ہے شر ہے اب بندہ آزاد ہے کہ یہ کر گزرے یا اس سے رک جائے کسی کو تکلیف دینا شر ہے۔ بری بات ہے یہ تو طے ہے مگر اس کو اختیار کرنے یا اس سے بچنے کا اختیار بندے کو ہے اس اختیار کو غلط استعمال کرے گا تو عذاب کا مستحق ہوگا اور اگر درست استعمال کرے گا تو اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرے۔

خلاصہ کلام: شر کیا ہے خیر کیا ہے یہ تو وحی الٰہی اور سنت رسول سے ہی مقرر ہوگا

پھر بندوں کو اختیار ہے بندے آزاد ہیں کسی نے ہاتھ نہیں باندھے کسی نے مجبور نہیں کیا کہ تم شر کو اپناؤ یا خیر کی طرف جاؤ لیکن ترغیب ضرور دی جاتی ہے کہ خیر کو اختیار کرو اور شر کو اختیار کرنے پر ترہیب ہے یعنی خیر اور شر میں سے کسی پر بھی عمل کرنے میں بندہ آزاد ہے۔

مگر مغربی فلسفہ میں آزادی کا یہ معنی ہر گز نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک ایک اور معنی مراد ہے وہ یہ کہ بھلائی کیا ہے؟ برائی کیا ہے؟ شر اور خیر کیا ہے ان کو متعین کرنے کی آزادی۔ انسان خود طے کرے گا کہ سود لینا صحیح ہے یا غلط یعنی اچھا کیا ہے برا کیا ہے یہ بات مذہب خدا یا رسول سے نہ پوچھی جائے بلکہ بندہ آزاد ہے جسے چاہے حلال قرار دے جسے چاہے حرام۔ اور اس میں بھی آزاد ہے کہ جس کے بارے میں جو رائے قائم کرے۔ جس کی رو سے بزرگوں کی آبرو ریزی کرنے اور انبیاء کی گستاخی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں لہٰذا اس معنی کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ آزادی کے اس معنی کو مغرب بطور اصول کے قبول کرتا ہے پھر ہر چیز کے صحیح اور غلط قرار دینے سے مراد وہی پیمانہ ہوتا ہے۔ جدت پسند طبقے کا طریقہ کار یہی ہے پہلے اہلِ مغرب کے بیان کردہ اصول کو تسلیم کرتے ہیں پھر اسی اصول کو صحیح مانتے ہوئے اسلامی احکام و مسائل کی تاویلات کر کے اسے مغربی اصولوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی مغربی اصول سے اسلام کے احکام و مسائل کے حدود اربع جانچنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ ایک غلط طرز عمل ہے لہٰذا ہم ان مغربی اصولوں کو عملی بنیادوں پر رد کریں گے۔

سوال: جب اسلام میں آزادی نہیں تو کیا غلامی ہے؟ عام طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر آپ آزادی کا نظریہ غلط تسلیم کرتے ہو تو کیا اسلام میں غلامی ہے؟

جواب: ہم جس آزادی کی نفی کر رہے ہیں اس کے مقابلہ میں غلامی نہیں آتی بلکہ اس کے مقابلے میں بندگی ہے۔ اور یہ بات ہم پوری اسلامی علمیت کی روشنی میں کہتے ہیں کہ اسلام میں عبدیت ہے بندگی ہے مطلق العنانی نہیں ہے۔

جو کوئی مطلق العنان آزادی کی اسلام کاری کرنے کی کوشش ناحق کرے تو اسے چاہیے کہ رحمت دو جہاں ﷺ کے فرمان عالی شان کا بغور مطالعہ کرے۔

ارشاد نبوی:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ الدنیا سجن المؤمن و جنۃ الکافر ھذا حدیث حسن صحیح (ترمذی: ج2 ص58)

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا دنیا مومن کیلئے قید خانہ ہے اور کافر کیلئے جنت۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ان ارشادات نبوی ﷺ کو مدنظر رکھ کر انسان اس دنیا میں اپنی حیثیت دیکھے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس دنیا میں آزاد ہے یا احکام الٰہی کا پابند ہے اور جو اپنے لیے مطلق العنانی کا دعوے دار ہے اور اس کیلئے کوشاں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا کیونکہ مسلمان کیلئے تو قدم قدم پر اللہ کی بندگی کا حکم ہے یوں کرو یوں نہ کرو۔ بیت الخلاء میں جاتے وقت سے لیکر انداز حکمرانی تک ایک ایک چیز کا پابند ہے۔ قدم قدم پر رہنمائی ہے اور اچھا مسلمان تو وہ ہوگا جو جس قدر اللہ کی بندگی میں لگا ہوا ہے اس کے لیل ونہار رب کریم کی رضا تلاش کرنے میں گزریں اس کا اٹھنا بیٹھنا اپنے نبی کے طریقے کے مطابق ہو اس کی خوشی غمی بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔ شادی و بیاہ سے لیکر کفن و مرگ تک بندہ پابند ہے۔

بغیر کسی ابہام کے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ انسانیت کی بھلائی عبدیت میں ہے بندگی میں ہے مطلق العنانی میں نہیں انسانی افضلیت اور شرف کا اندازہ بھی اسلامی نقطہ نظر سے اس کی بندگی یعنی تقویٰ دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ جو جتنا زیادہ متقی ہے اتنا زیادہ مکرم ومحترم ہے۔ مطلق العنانی اور آزادی کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

اعتاق کی طرف اسلام ضرور دعوت دیتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو نبی پاک ﷺ نے غلاموں کو آزاد کرنے کے بہت سے فضائل بیان فرمائے ہیں۔

حتیٰ کہ رحمت دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان غلام کو آزاد کرنے کا اتنا اجر ہے کہ اللہ جل شانہ اسکے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو جہنم سے بچا لیتے ہیں۔

ارشاد نبوی ﷺ:

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من اعتق رقبة مسلمة اعتق الله بكل عضو منه عضو امن النار حتى فرجه بفرجه متفق عليه (مشکواۃ المصابیح: حدیث نمبر 3233)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جناب نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کے عضو کو جہنم سے آزاد (بری) کر دیں گے حتیٰ کہ اس کی فرج کے بدلے اس کی فرج کو۔

غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ اسلام آزادی کی حمایت کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غلام آزاد کیے جائیں۔ تمام بنی آدم اللہ کی بندگی اور اطاعت میں آ جائیں اسلام اس کا داعی ہے مطلق العنان آزادی اسلام میں نہ مطلوب ہے اور نہ ہی اس کی گنجائش ہے۔

برصغیر پاک و ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں لفظ آزادی یا حریت کی مقبولیت کی وجہ کیا بنی؟

جب آزادی (Freedom) پر مغربی فکر و نظر کے لحاظ سے روشنی ڈالی جاتی ہے تو لاشعوری طور پر یہ سوال مسلمانوں کے ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس قدر دہریت آمیز معنی جس میں لادینیت ہے لامذہبیت ہے تو آخر کیا اسباب و وجوہ بنے جس کی وجہ سے مغربی نظریات اقوام مسلم میں تیزی سے پھیل گئے اور کم علمی کی وجہ سے یا مغربی تہذیب سے عدم تعارف کے سبب مسلمانوں نے ان نظریات کو قبول کیا حتیٰ کہ ان کی اسلام کاری کی بھی کوشش شروع کر دی۔ آزادی کو اسلام سے ثابت کرنے لگے مساوات کو بھی اسلام کا نصب العین قرار دینے لگے؟

مغل بادشاہوں کے زوال کے بعد انگریز برصغیر پر قابض ہو گئے چونکہ انہوں نے بادشاہت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے انگریز مسلمانوں کی بیخ کنی کی مکمل کوشش کرتے اور ہندوستان کی باقی اقوام کو بھی اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں کو سماجی، معاشرتی و اخلاقی طور پر کمزور کرنے کی مکمل کوشش کرنے لگے۔

ایسی صورتحال میں مسلمان اکابرین نے انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے لئے آزادی کی تحریک چلائی حریت کا نعرہ لیکر میدان عمل میں آئے اورزوروشور سے آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ اگرچہ یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی۔ اس تحریک کو ختم کردیا گیا اور کارکن علماء کرام کو تختہ دار کی زینت بنادیا گیا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں علماء امت کے خون سے سرزمین ھند کو سرخ کیا گیا۔ اگرچہ یہ اولیاء وقت تو اس جہان فانی سے سرخرو ہوکر اپنے رب سے جاملے لیکن ان کی چلائی ہوئی تحریک کا اثر مسلمانوں میں باقی رہا وہ سوچ وفکر مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اس ظالم قوم سے نجات حاصل کرنی ہے۔ یہ حال صرف ہندوستان کا ہی نہ تھا کہ غیروں کے زیراثر تھا بلکہ خلافت عثمانیہ کا بھی 1919ء میں شیرازہ بکھر گیا تھا غرض تمام اسلامی مما لک مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے اور انگریزوں نے ان پر اپنا تسلط جمالیا تھا۔

مسلمانوں کے پاس اب کوئی بڑی حکومت نہ بچی تھی۔ اس حالت میں ان کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ ایک عظیم نعمت کو کھو چکے ہیں اور غیر مسلم قوموں کے مطیع بن گئے ہیں۔ ایسے حالات میں مسلم اُمہ کیلئے آزادی کی تحریکیں اور آزادی کا حصول گراں قدر چیز تھی اس لیے کہ جب غلامی کی زنجیروں کا مزا چکھا تو آزادی کی قدر معلوم ہوئی لہٰذا مسلم دنیا میں آزادی و حریت کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ لفظ آزادی کا استعمال بے دریغ ہمارے لٹریچروں میں ہوا لیکن آزادی سے یہ بات ہٹ گئی کہ کس سے آزادی اور کس لیے آزادی۔

Freedom for   Freedom from

کی تشریح کے بغیر لفظ آزادی کا استعمال ہوا اور اس کے معنی کے ساتھ وضاحت کے ہٹ جانے کی وجہ سے وہ تصور آزادی ابھر کر سامنے آیا اور وہ معنی مراد لیا جانے لگا جو مغربی دنیا میں مراد ہے جس معنی کی عکاسی اہل مغرب کرتے ہیں بعض کلمہ گو افراد نے بھی آزادی سے وہ معنی مراد لینا شروع کردیا اور بطور دلیل ہمارے اکابر کی عبارات پیش کرنے لگے۔

حالانکہ مسلمان اگر آزادی کو قدر واہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اس کا پس منظر

وہ سوسالہ غلامی ہے۔ ان کے ذہن میں آزادی کے مقابلے میں غلامی ہے اس غلامی سے خلاصی کیلئے آزادی کی تحریکیں مسلمانوں نے چلائیں اور غیر مسلم قوموں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے ہزاروں جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ تاکہ انگریزوں سے آزادی حاصل کر کے پوری طرح اللہ کی بندگی کرسکیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرسکیں۔

حریت کیا ہے؟

ہمارے اکابر نے کفار یا غیر قوموں سے آزادی کی جدوجہد میں لفظ آزادی/حریت استعمال کیا یقیناً ان الفاظ سے مراد ان کی مغربی تصور آزادی (مادر پدر آزادی) نہ تھی۔

اس لیے آزادی کی جگہ بہت دفعہ حریت کا لفظ استعمال کیا ہے لہٰذا جدت پسند طبقہ وہ عبارات وتقاریر جو اکابرین امت کی کتابوں میں ہیں ان سے استدلال نہیں کرسکتا کہ آزادی سے مراد مادر پدر آزادی ہے کیونکہ سیاق عبارت اور لفظ حریت اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزادی سے مراد کافر قوموں کے تسلط سے چھٹکارا ہے۔

حریت وغلامی کا اسلامی نظریہ

مومن آدمی سیدھا سادہ اور بھولا بھالا ہوتا ہے جیسا کہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عن ابی هریره رضی الله عنه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم المؤمن غر کریم والفاجر خبّ لئیم (مشکوٰۃ۔ج2،ص446)

جب مغرب کسی نظریہ کو پیش کرتا ہے تو اس نظریے کے اظہار کیلئے ایسا لفظ اختیار کیا جاتا ہے جو لفظ لوگوں میں اچھے معنی میں استعمال ہو اور لوگوں میں مانوس ہو یعنی لفظ کی ذاتی کشش اس نظریے کو لاشعوری طور پر لوگوں کے دلوں میں نقش کرتی چلی جائے اور باطل کو حق کے ساتھ ملا کر یوں پیش کرتا ہے کہ عام نظر رکھنے والا آدمی حق وباطل میں فرق کو واضح نہ کرسکے اور فرق نہ کرنے کی وجہ سے یا تو وہ کلی طور پر انکار کرے گا جس میں حق کا بھی انکار کر بیٹھے گا اور اس کا موقف کمزور ہو جائے گا۔ یا پھر تصدیق کرے گا اور تصدیق وحمایت میں حق کے ساتھ

باطل کو بھی صحیح تسلیم کرے گا۔ یعنی مغربی فکر کی مکاری و چالاکی اور ان کے بنیادی اصولوں کا مطالعہ کیے بغیر آدمی ان کے دجل کا شکار ہو جائے گا۔ ان کی تقریباً ہر اصطلاح میں ایسے ہی ہوتا ہے وضاحت کے بغیر کلی طور پر رد کریں تو بے شمار اعتراضات کا دروازہ کھلے گا۔ اور اگر حمایت کریں گے تو باطل کی حمایت کرنے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔

عام طور پر جب آزادی کے بارے میں بحث کی جاتی ہے تو کئی لوگ سادگی کی وجہ سے یا پھر لاعلمی کی وجہ سے آزادی سے مراد وہ آزادی لیتے ہیں جو غلاموں کو دی جاتی ہے اور آزادی کو کتب فقہ میں حریت/ اعتاق کے نام سے ذکر کیا گیا ہے اس کی باقاعدہ اسلام نے تعلیم دی ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو لہٰذا کئی مسلمان آزادی کی حمایت میں اعتاق کے ابواب کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اسی تناظر میں آزادی کی تشریح کرتے ہیں۔ کہ آزادی انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اور غلاموں کو آزاد کرنے اور ان سے مثبت سلوک کرنے کی اسلام نے ترغیب دی ہے لہٰذا اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے آزادی کی حمایت کرتے ہیں۔

اور جب کوئی لفظ آزادی بولتا ہے تو لاشعوری طور پر مسلمان اپنے تاریخی تناظر میں وہی آزادی و حریت مراد لیتے ہیں جو چودہ سو سال تک چلی آتی رہی وہ احادیث کے تناظر میں آزادی کی مکمل حمایت کرتا ہے اور غلامی کو عارضی چیز قرار دیتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ غلاموں کے ایسے بے مثال قابل ستائش عالی شان واقعات ملتے ہیں جو تاریخ انسانی میں اس سے قبل کبھی بھی رونما نہیں ہوئے۔ ان واقعات نے اسلامی تاریخ کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی مثل تعلیمات کسی کے پاس نہیں ہیں۔

اسلام اگرچہ غلامی کی بجائے آزادی کی ترغیب دیتا ہے اور غلاموں کو آزاد کرنے پر اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من اعتق رقبۃ مسلمۃ اعتق اللہ بکل عضو منہ عضواً من النار حتی فرجہ بفرجہ (مشکوٰۃ ج2، ص302)

ترجمہ: ''حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جس نے مسلمان غلام کو آزاد کیا اللہ ہر عضو کے بدلے اس کے عضو کو جہنم سے بری کرے گا حتیٰ کہ اس کی فرج کے بدلے فرج کو آزاد کیا جائے گا''۔

انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت کم عرصہ میں سینکڑوں غلام آزاد کیے۔

تکملہ فتح الملھم: اعتق النبی ﷺ ثلاثاً وستین نسمۃ عدد سنی عمرہ وعد اسماء ھم قال: اعتقت عائشۃ تسعاو ستین وعاشت کذلک واعتق ابو بکر کثیراً.................اعتق عبدالرحمٰن بن عوف ثلاثین الف نسمۃ.

نبی اکرم ﷺ نے 63 غلام آزاد کیے (نواب صدیق حسن) نے ان کے نام بھی ذکر کیے ہیں حضرت عائشہ نے 69۔ حضرت عباس نے 80 غلام آزاد کیے۔ حضرت عثمان نے محاصرے کی حالت میں شہادت والے دن 20 غلام آزاد کیے۔ حکیم بن حزام نے 100 غلام آزاد کیے۔ عبداللہ بن عمر نے 1000 ذوالکلاع حمیری نے ایک دن میں 8000۔ عبدالرحمان بن عوف نے 30000 غلام آزاد کیے۔ امت میں ایسے بے شمار غلام گزرے ہیں جن کی فقاہت کو اہل علم تسلیم کرتے ہیں اوران کے چشمہ فیض سے آج تک لوگ سیراب ہوتے ہیں کتب پر سرسری نظر ڈالنے سے کئی ایسے غلام نظر آتے ہیں جن کو امت مفسر یا محدث یا فقیہ ہونے کی حیثیت سے جانتی ہے۔ دور نبوت میں آزاد کردہ غلاموں کا خاکہ

1۔ نبی اکرم ﷺ	63
2۔ حضرت عائشہؓ	69

3۔حضرت عباسؓ	80
4۔حکیم بن حزامؓ	100
5۔عبداللہ بن عمرؓ	1000
6۔ایک دن میں ذوالکلاع حمیریؓ	8000
7۔عبدالرحمٰن بن عوفؓ	30000
8۔حضرت عثمانؓ نے محاصرہ کی حالت میں	20

نبی اکرم ﷺ کا غلاموں سے حسن سلوک

قصہ نمبر 1:

نبی اکرم ﷺ غلاموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے، زید بن حارثہ جو کہ حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے حضرت خدیجہؓ نے زید رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کو تحفہ میں دیئے تھے۔

چنانچہ زید رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں زندگی گزارنے لگے نبی دو جہاں ﷺ نہایت کریمانہ اخلاق کے ساتھ ان سے پیش آتے اور بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ زید بن حارثہ کے قبیلے والے موسم حج میں حج کیلئے مکہ آئے انہوں نے مکہ میں زید بن حارثہ کو دیکھ لیا اور دیکھتے ہی پہچان لیا۔

چنانچہ زید نے ان کو پیغام کے طور پر چند شعر سنائے جس میں اپنی خوش عیشی کا تذکرہ تھا اشعار سنانے کے بعد کہا کہ میرے گھر والوں کو پہنچا دینا۔ جب قبیلہ والے واپس آئے تو انہوں نے زید کے باپ کو اور اس کے بھائی کو سارا قصہ سنایا تو وہ زید کو لینے کیلئے مکہ آئے جب مکہ آئے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اے ابن عبدالمطلب اے ابن ہاشم اور اے اپنی قوم کے سردار ہمارے ساتھ زید کے بارے میں نرمی کریں اور ہم پر احسان کرو اور زید کو ہمارے ساتھ بھیج دو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس بارے میں زید بن حارثہ کو اختیار دیتا ہوں۔

اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہے تو آپ بے شک لے جائیں لیکن اگر وہ مجھے اختیار کرے تو میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا ۔ وہ دونوں اس فیصلہ سے بہت خوش ہوئے چنانچہ زید بن حارثہ کو بلایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو اختیار دیا۔

تو زید بن حارثہ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ان دونوں کی بجائے آپکو اختیار کرتا ہوں آپ میرے لیے بمنزلہ والد کے ہیں اور بمنزلہ چچا کے بھی ہیں اس پر زید کے والد نے کہا کہ تم غلامی کو آزدی پر ترجیح دیتے ہو اور اپنے باپ پر غیروں کو ترجیح دیتے ہو اور ان کو عار دلائی تو زید بن حارثہ نے جواب دیا کہ ہاں میں اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ علامہ ابنِ کثیر نے اس واقعہ کو اس طرح نقل کیا ہے۔

اسد الغابہ:

فخرج حارثة واخوه كعب ابنا شراحيل لفدائه فقدما مكه فدخلا على النبى صلى الله عليه وسلم فقالا يابن عبدالمطلب يا بن هاشم يا بن سيد قومه ....فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم فهلا غير ذلك قالوا الخ فقالا ويحك يا زَيد اتختار العبودية على الحرية وعلى ابيك واهل بيتك ؟ قال : نعم:............(اسد الغابہ ج2 ص130)

یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ اخلاق تھے کہ اپنے غلاموں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے تھے کہ آپ کی غلامی سے وہ جس قدر راحت پاتے تھے کوئی شہنشاہ وقت کے پاس بھی اتنا مسرور نہ ہوتا ہوگا۔ اس مثال سے واضح ہو گیا ہے کہ اپنے والدین کو چھوڑنے کیلئے ایک بچہ تیار ہے اور کہہ رہا ہے کہ آپ کے علاوہ کسی اور کو ہرگز اختیار نہیں کروں گا۔

قصہ نمبر 2:

اس طرح کا ایک اور قصہ ہے جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلاموں کے ساتھ سلوک کا علم ہو جائے گا۔ حضرت مہاجر ایک غلام ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ یا دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے لیکن کبھی بھی مجھے یہ نہیں کہا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا؟

اورنہ ہی کسی کام پرآپ نے یہ کہا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا؟

کماذکر فی اسدالغابہ:

قال بکیر سمعت مهاجر مولی ام سلمه یقول خدمت النبی ﷺ عشر سنین او خمس سنین فلم یقل لشیئی صنعته لِم صنعته ولا لِشيءٍ تركته لِم تركت (اسدالغابہ ج4، ص503)

نبی اکرم ﷺ کی وصیت:

آخری وصیت تو ویسے ہی اہمیت رکھتی ہے اور پھر جب لسان نبوت سے صادر ہوتو بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوگی۔ چنانچہ ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو وفات کے وقت آخری وصیت فرمائی تو وہ یہ تھی کہ نماز کی پابندی کرواوراپنے ماتحتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرواُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرو چنانچہ ابن ماجہ کی حدیث میں وارد ہے:

عن انس بن مالک قال کانت عامة وصية رسول الله ﷺ حين حضرته الوفاةوهو يغرغر بنفسه الصلوٰة وماملكت ايمانكم. (ابن ماجہ، ص198، مکتبہ ایچ ایم سعید)

حضرت انس فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا جب وفات کا وقت قریب ہوااورغرغرہ بجنے لگا اُسی دوران آپ نے فرمایا کہ نماز کی حفاظت کرنااوراپنے ماتحتوں پرشفقت کرنا۔

الغرض آپ نے غلاموں کے حقوق طے فرمادیئےان کے ساتھ نرمی کرنے کی ترغیب دی اوران کوآزاد کرنے پرعظیم اجروثواب کاوعدہ کیا۔

غلام علماءامت:

نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ اس امت میں ایسے غلام بھی گزرے ہیں جوعلم، تقویٰ اورخشیت الٰہی میں زمانے کے امام تھےان کوصرف غلام ہونے کی وجہ سے چھوڑ نہیں دیا گیا بلکہ ان کے چشمہ فیض سے جاری ہونے والے علوم کوامت نے بغیر کسی

تردد کے قبول کیا ہے اس موضوع پر ضخیم مواد جمع کیا جا سکتا ہے کہ اس امت مسلمہ میں غلام محدثین غلام مفسرین اور غلام فقہاء کتنے گزرے ان کا اپنے اپنے علم میں مقام کیا تھا ان کے شاگردوں نے ان سے کس طرح فیض حاصل کیا۔ ہم چند مثالیں ذکر کرتے ہیں جس سے اسلام میں غلام کی حیثیت اور ان سے کیے جانے والے سلوک پر روشنی پڑے گی۔

غلاموں میں سے جلیل القدر محدثین کی فہرست بہت طویل ہے مگر ہم چند ذکر کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

غلام محدثین:

1۔ حضرت نافع مولی ابن عمر
2۔ عطاء بن ابی رباح
3۔ طاوس بن کیسان
4۔ ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی
5۔ حضرت مکحول الدمشقی
6۔ حضرت سلمہ بن دینار
7۔ حضرت سلیمان بن خاطر التیمی
8۔ حضرت یزید بن ابی حبیب
9۔ حضرت محمد بن عجلان
10۔ عبداللہ بن عون

حدیث میں اِن کا مقام:

ان محدثین کا مقام حدیث میں بہت بلند ہے ان کے علم وتقویٰ پر علماء سلف کی آراء مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ نافع مولی ابن عمر:

حضرت نافع یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام تھے چنانچہ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

نافع الفقیہ مولی ابن عمر ابو عبداللہ المدنی اصابه ابن عمر فی بعض المغازیة (تہذیب التہذیب: ج5 ص606 مکتبہ بیروت)

علمِ حدیث میں ان کا مقام:

ابن سعد نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

قال ابن سعد ثقة كثير الحديث و قال البخاری اصح الا سانید مالک عن نافع عن ابن عمر

2۔ عطاء بن ابی رباح:

عطاء بن ابی رباح یہ ابو محمد المکی کے غلام تھے چنانچہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

عطاء بن ابی رباح واسمه اسلم القرشی مولاهم ابو محمد المکی (ج3، ص128)

علم حدیث وفقہ میں ان کا مقام

امام ابو حنیفہؒ ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ عطاء بن ابی رباح سے زیادہ افضل آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ عطاء بن ابی رباح کا فتویٰ اہل مکہ میں چلتا تھا یہ ان چھ بندوں میں سے ہیں جن پر آ کر علم رک جاتا ہے۔

کمافی التہذیب التہذیب:

قال ربيعة فاق عطاء اهل مكة فی الفتویٰ وعن ابی حنيفه مارأيت فيمن لقيت افضل من عطاء (تہذیب التہذیب، ج3، ص128)

3۔ طاؤس بن کیسان:

حضرت طاوس بن کیسان بجیر بن ریسان کے غلام تھے۔

کمافی التہذیب:

طاوس بن كيسان اليمانی ابو عبدالرحمٰن الحميری الجندی مولی بحير بن ريسان من ابناء الفرس.

علم حدیث میں مقام:

قیس بن سعد لکھتے ہیں کہ طاوس ہمارے ہاں ابن سیرین کی مثل تھا۔

کمافی التہذیب:

قال ليث بن ابی سليم كان طاؤس يعد الحديث حرفاً حرفاً

وقال قیس بن سعد کان فینا مثل ابن سیر ین بالبصرۃ.

4۔ یزید بن ابی حبیب:

یزید بن ابی حبیب یہ ابو رجاء ازدی مفتی مصر کے غلام تھے۔

کمافی سیر اعلام النبلاء:

الامام الحجہ مفتی الدیامر المصیحہ ابو رجاء الازدی مولا ھم. (سیر اعلام النبلاء: ج6، ص31 مکتبہ بیروت)

علم حدیث میں مقام:

ان کے بارے میں لیث بن سعد کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سردار اور عالم ہیں اور محمد بن سعد کہتے ہیں کہ یہ ثقہ اور زیادہ حدیث والے ہیں۔

کمافی سیر اعلام:

قال اللیث بن سعد یزید بن ابی حبیب سیدنا و عالمنا . وقال محمد بن سعد یزیدبن ابی حبیب مولی لبنی عامر بن لوئی من قریش و کان ثقة کثیرا الحدیث . (سیر اعلام النبلاء: ج6، ص32۔ مکتبہ بیروت)

ان کے علاوہ بہت سے محدثین ہیں جو اصلا غلام تھے مگر امت مسلمہ ان کو ایک محدث ہونے کی حیثیت سے آج تک جانتی ہے۔ چند کے نام یہ ہیں۔

5۔ سلیمان بن مہران یہ بنو اسد کے غلام تھے مگر اپنے وقت کے بہت بڑے ائمہ حدیث میں سے اور اہل ورع میں سے تھے۔

6۔ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن فروخ ۔ یہ المنکدر کے غلام تھے اور بڑے محدثین میں سے تھے اور بہت اچھے فقہ کے ماہر تھے۔

7۔ عبداللہ بن عون یہ قبیلہ مزن کے غلام تھے یہ ثقہ محدثین میں سے تھے۔

8۔ داؤد بن دینار یہ ابو محمد الحراسانی بنی قشیر کے موالی میں سے تھے ان کے بارے میں ابو حنیفہ کے استاد حماد بن زید کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ فقیہ میں نے نہیں دیکھا۔

9۔ زید بن ابی انیسہ یہ بھی بہت بڑے محدث تھے اور غلام تھے۔

10۔ حسن بن ابی الحسن یسار یہ انصار کے موالی تھے ایک بڑے فقیہ تھے اور محدث تھے۔

11۔ مسلم بن یسار بھی غلام تھے بڑے بڑے محدثین ان کے شاگرد ہیں امام احمد ان کو ثقہ راویوں میں شمار کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیسیوں غلام محدثین ہیں جن کے حال جاننے کیلئے کتب اسماء الرجال کی طرف مراجعت کی جائے۔

غلام فقہاءِ امت

جس طرح غلاموں میں سے بہت سے افراد نے حدیث نبوی کو محفوظ رکھنے کا کام کیا ہے اسی طرح فہم حدیث اور مسائل کے استخراج میں بھی بہت لوگوں نے مہارت حاصل کی چنانچہ امت آج ان افراد کو ایک فقیہ ہونے کی حیثیت سے جانتی ہے جن میں سے چند ہستیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔سعید بن جبیر	2۔سلیمان بن یسار	3۔حکم بن عتیبہ
4۔لیث بن سعد	5۔محمد بن جعفر الھذلی	6۔مسلم بن یسار
7۔مغیرہ بن مقسم	8۔حسن بن ابی الحسن یسار	9۔ربیعہ بن عبدالرحمٰن

مسلمانوں نے ان کو ایک فقیہ ہونے کی حیثیت سے قبول کیا اور کبھی بھی ان کی فقیہانہ شان اس وجہ سے متاثر نہیں ہوئی کہ یہ حضرات غلاموں میں سے ہیں۔

فقاہت میں ان حضرات کا درجہ:

سعید بن جبیر: سعید بن جبیر ابو عبداللہ کوفی کے غلام تھے۔

فقاہت میں مقام:

فقاہت میں ان کا یہ مقام تھا کہ اہل کوفہ جب حضرت ابن عباس کے پاس آتے اور مسئلہ دریافت کرتے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ ان سے فرماتے کہ تم میں ابن ام الدھماء یعنی سعید بن جبیر نہیں ہیں کہ تم مجھ سے پوچھنے آئے ہو چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

کمافی التہذیب:

کان ابن عباس اذا اتاہ اهل الكوفة يستفتون يقول اليس فيكم ابن ام الدهماء يعنى سعيد بن جبير (تہذیب التہذیب: ج4، ص11)

سلیمان بن یسار:

سلیمان بن یسار میمونہ کے غلام تھے بڑے بڑے محدثین نے ان سے فیض حاصل کیا ہے۔

فقاہت میں مقام:

ابوزناد فرماتے ہیں کہ سلیمان بن یسار یہ سات فقہاء میں سے ایک ہیں علامہ ابن حجر عسقلانی ذکر فرماتے ہیں۔

کمافی التہذیب:

ذكر ابو الزناد انه احد الفقهاء السبعه اهل فقه وصلاح وفضل (ج4، ص20)

لیث بن سعد:

ان کا نام لیث بن سعد بن عبدالرحمٰن تھا اور یہ قریش کے غلام تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے محدثین سے علم حاصل کیا۔

فقاہت میں انکا مقام:

ابن سعد اور امام احمد نے ان کو حدیث میں ثقہ قرار دیا ہے امام شافعی فرماتے ہیں جتنا افسوس مجھ کو لیث بن سعد کی موت پر ہوا اتنا کسی کی موت پر نہیں ہوا امام شافعی فرماتے تھے کہ لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے۔

کمافی التہذیب:

سمعت الشافعی یقول اللیث افقه من مالک الا ان اصحابه لم یقوموا به (تہذیب التہذیب: ج4، ص610)

محمد بن جعفر الھذ لی:

ان کا نام محمد بن جعفر الھذ لی ہے اور غندر کے لقب سے مشہور ہیں اور ہذلی ان کی نسبت ہے یعنی ان کے غلام تھے۔

فقاہت وذکاوت:

غندر بڑے ذہین تھے چنانچہ ثقہ راوت میں غندر محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے فقاہت میں امام زفر کے ہم مثل ہیں چنانچہ ابن حجر فرماتے ہیں:

کمافی التہذیب:

قال محمد بن یزید : کان فقیه البدن و کان ینظر فی فقه زفر (تہذیب التہذیب: ج5، ص65)

مسلم بن یسار:

مسلم بن یسار یہ بنوامیہ کے غلاموں میں سے تھے اور بعض کے نزدیک طلحہ کے غلام تھے۔

مقام فقاہت:

خلیفہ بن حیاط فرماتے ہیں کہ مسلم بن یسار اہل بصرہ کے پانچ فقہاء میں سے پانچویں شمار ہوتے ہیں۔

غلام مفسرین

سب سے مقدس کتاب قرآن پاک کی خدمت کرنے والے اور علوم قرآن میں مہارت حاصل کرنے والے چند مشہور مفسرین مندرجہ ذیل ہیں۔ جو اصلاً تو غلام تھے مگر اسلام کا نظام عدل دیکھئے اور علم سے محبت دیکھئے کہ اپنے ماتحتوں کو بھی علم کیلئے کس طرح فارغ کیا جن لوگوں کو قیمت کے عوض اپنی راحت کیلئے خریدا جاتا تھا انکو تعلیم دلوانا اور باقی امت کا بھی تعصب سے پاک ہونا سمجھ میں آتا ہے کہ غلام ہونے کی وجہ سے کبھی کسی کو حقیر نہیں جانا بلکہ عظمت وذلت کا معیار تقوی ہے جس قدر تقوی زیادہ ہوگا قدر

بڑھتی جائے گی۔ایسے غلام مفسر گزرے ہیں جن کے قول کو آج تک اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

عکرمہ مولیٰ ابن عباس:

ان کا نام عکرمہ ہے اور یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے اور ابن عباسؓ نے ہی ان کو تعلیم دی تھی۔

کمافی التہذیب:

عکرمہ البربری ابو عبداللہ المدنی مولی ابن عباس اصلہ من البربر (تہذیب التہذیب: ج4،ص167)

تفسیر وحدیث میں مقام:

ایوب مصری نے ان کو حدیث میں ثقہ قرار دیا ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

کمافی التہذیب:

وقال یحیی بن ایوب مصری سألنی ابن جریج ھل کتبتم عن عکرمہ قلت لا قال فاتکم ثلثاالعلم وقال حماد عن ایوب لولم یکن عندی ثقة لم اکتب عنہ (تہذیب التہذیب: ج 4،ص169)

مجاہد بن جبر:

ان کا نام مجاہد بن جبر ہے اور سائب بن ابی سائب کے غلام تھے۔علامہ عسقلانی فرماتے ہیں:

کمافی التہذیب:

مجاھد بن جبر المکی ابو الحجاج المخزومی المقری مولی السائب بن ابی السائب (تہذیب التہذیب: ج5،ص373)

علم تفسیر میں مقام:

بڑے بڑے محدثین ان کے شاگرد ہیں جو ان سے فیض یاب ہوئے۔

حضرت مصعب فرماتے ہیں کہ تفسیر کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے مجاہد ہیں اور حج کے احکام کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے عطاء ہیں اور مجاہد خود فرماتے ہیں کہ میں نے تین دفعہ پورا قرآن ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پڑھا اور ہر ایک آیت کا شان نزول میں نے پوچھا تھا چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

کمافی التہذیب:

وقال عبدالسلام بن حرب عن مصعب كان اعلمهم بالتفسير مجاهد وبالحج عطاء وعن مجاهد قال قرأت القرآن على ابن عباس ثلاث عرضات اقف عند كل آية اسأله فيم نزلت ؟ وكيف كانت؟ (تہذیب التہذیب: ج5، ص374)

یہ دونوں مفسرین غلام ہیں مگر ان کے علم و فضل کے سامنے بڑے بڑے سر جھکا دیتے ہیں ائمہ تفسیر کے اندر ان کا شمار ہوتا ہے۔ اصل میں اسلام کے اندر شرف وفضیلت اس شخص کیلئے ہے جو تقویٰ وورع میں کامل ہے۔

محمد بن سیرین جو تفسیر میں ایک مقام رکھتے ہیں اور خواب کی تعبیر بتانے میں ماہر جانے جاتے تھے۔ ان کے اقوال سے آج تک استفادہ کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اصلاً غلام تھے۔

غلامی کا تصور صرف اسلام میں ہی نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب وقدیم تہذیبوں میں غلامی کا تصور موجود رہا ہے اس لیے کہ دنیا میں ایک مزاج کے لوگ نہیں رہتے بلکہ مختلف مزاج کے لوگ آباد ہیں اور جب ان میں سے کوئی غالب آئے گا تو وہ دوسرے کو اپنا مطیع بنائے گا۔

عیسائیت میں تصور غلامی:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک نے خط لکھا جس میں یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا۔ اپنے آقا کی اطاعت کرو اسکی حکم عدولی نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں غلامی کا تصور موجود تھا۔

یہودیت میں تصور غلامی:

یہودیوں کے ہاں یہ قانون تھا کہ جب کسی آدمی کو وہ غلام بنا لیتے تو سات سال تک غلامی کرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جاتا اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ ان میں بھی غلامی کا تصور موجود تھا۔

اہل یونان کے ہاں تصور غلامی:

جو جنگ میں گرفتار ہو جاتے ان کے اموال پر قبضہ کر لیا جاتا اور ان کو غلام بنا لیا جاتا جو کام سلیم الفطرت آدمی نہیں کر سکتا تھا وہ کام غلاموں سے کروائے جاتے تھے۔

اہل روم کے ہاں تصور غلامی:

اہل روم کا غلام اگر آقا کی نافرمانی کرتا تو غلام کو اس قدر سخت سزا دی جاتی جو نا قابل بیان ہے نافرمان غلاموں کی پیٹھ پر پتھر رکھ دیتے جو کہ ہفتہ ہفتہ پڑے رہتے۔ ان سب قوموں میں غلامی کا تصور موجود تھا اور غلام بنانے کا عمل جاری تھا مگر غلاموں کے بارے میں ان قوموں کے پاس کوئی خاص احکام نہ تھے ان کے حقوق تک متعین نہ تھے۔ لیکن اسلام نے آکر ان کے احکام کو متعین کر دیا کتب فقہ کا ایک ضخیم حصہ غلاموں کے احکام کے بارے میں موجود ہے۔

تمام اقوامِ عالم میں تصور غلامی تھا اور اس پر عمل بھی کرتے تھے مگر قانونی و اخلاقی ضوابط غلاموں کیلئے نہ ہونے کی وجہ سے غلاموں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا جب بین الاقوامی معاہدے کے تحت غلام بنانے پر پابندی لگا دی گئی تو اعتقاداً بھی یہ اقوام اس عمل کو برا شمار کرنے لگے اور غلام بنانے کو انسانیت کے خلاف سمجھنے لگے اور انسانیت کیلئے غیر نفع بخش سمجھ کر اس کی مکمل طور پر مخالفت شروع کر دی۔

اسلام میں غلام بنانے کی حیثیت:

اگرچہ آزادی انسان کا فطری تقاضا ہے مگر چند عوارض کی وجہ سے اس کی فطری آزادی کو سلب کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگی قیدی کو مسلمان اپنا غلام بنا سکتے ہیں کیونکہ اس نے اُس مالک

الملک کے خلاف اعلان بغاوت کیا ہے جس نے اس کو آزاد پیدا کیا تھا۔ جس نے اس کو ہوش وشعور بخشا۔ جیتا جاگتا انسان پیدا کیا۔ اور یہ اسی کے دین کو مٹانے کے لئے میدان کارزار میں اتر آیا۔ یاد رہے **ان الدین عنداللہ الاسلام**: صرف اور صرف اسلام ہی اللہ کے نزدیک دین برحق ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب گمراہی ہے۔ اور جو کوئی بھی اس دین کے غلبہ میں رکاوٹ بنے گا۔ اس سے قتال کیا جائے گا اور ان کو غلام بنایا جائے گا تاکہ اللہ کا دین بلند ہو۔

کتب فقہ میں غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں مستقل احکام ہیں اور کتب احادیث میں بھی ان سے اچھا سلوک کرنے اور ان پر ظلم نہ کرنے کے مستقل ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

اس لئے تصور غلامی کو اسلامی علمیت کے تناظر میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی کہہ دے کہ اسلام میں بھی غلام بنانے کی گنجائش نہیں ہے اور غلام بنانا غیر اسلامی طرز عمل ہے۔ اور جب بالکلیہ رد ممکن نہ رہا تو مفسدین نے ایک اور راہ اختیار کی کہ غلاموں کے بارے میں حکمتیں تلاش کرنی شروع کر دیں کہ فلاں فلاں حکمت کے پیش نظر غلام بنانے کی اس وقت گنجائش تھی اب نہیں ہے۔ یہ حکم اس وقت کے ساتھ خاص ہے۔ اسلامی نظریات کو غیر مسلم مغربی اقوام کے نظریات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے بے ڈھنگی تاویلات کا سہارا لیا جاتا ہے اور کئی حضرات تو اسلام کے اس عمل پر انتہائی شرمندہ اور نادم نظر آتے ہیں اور ڈھکے چھپے الفاظ میں یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کا یہ طرز عمل غیر مہذب ہے اور پھر اسلام کی وکالت میں کہتے ہیں۔

دراصل غلامی تو شروع سے چلی آرہی تھی اسلام تو اس کو ختم کرنے کیلئے آیا تھا اب چونکہ دنیا اس بات پر متفق ہو چکی ہے کہ غلام نہ بنائیں گے لہذا اسلام کا منشأ بھی یہ یہی تھا اس لیے ہم بھی غلام نہ بنائیں گے۔

حالانکہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے تمام دنیا کیلئے آیا ہے۔ اللہ کے کلمہ کو تمام دنیا میں بلند کرنا اور کفر توڑنا اور ساری دنیا کو اللہ کا مطیع بنانے کی جدوجہد کرنا مسلمان کا مقصدِ حیات ہے کافر کو جینے کا حق صرف اس وقت دینگے جب کہ وہ اپنے رب کا غلام بن جائے اور اللہ کا فرمانبردار بندہ بن جائے یا پھر اللہ کے بندوں کے ماتحت ہو کر زندگی گزارے کافر کو اس دنیا میں

اللہ کا باغی بن کر رہنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے یا وہ اللہ کا مطیع بنے یعنی مسلمان ہو جائے یا پھر مسلمانوں کا ذمی بن کر رہے اس کے علاوہ تمام راستے زندگی گزارنے کیلئے بند ہیں۔

ہاں اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرتا تو اس کے ساتھ جنگ کریں گے پھر جنگ میں دشمن کی طاقت کو کمزور کریں گے۔اس کافر سے اللہ کی زمین کو صاف کریں گے یا پھر اس کو غلام بنائیں گے جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ:

فاذالقیتم الذین کفرو افضر ب الرقاب حتی اذا اثخنتموم فشد واالوثاق فامّا منّا بعد واِمّا فدآءً حتی تضع الحرب اوزارھا. (قرآن مجید، پارہ 26، سورت محمدؐ، آیت 3)

پس جب ان کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو پہلے ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوطی سے باندھو اس کے بعد تم کو اختیار ہے احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرلو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔

خلاصہ کلام یہ کہ کفر کی طاقت کو برداشت نہ کیا جائے گا اس کو ختم کرنے کیلئے ان سے جنگ بھی کریں گے ان کے لوگوں کو غلام بھی بنائیں گے۔ان سے اس وقت تک جہاد کریں گے جب تک کہ کفر کی طاقت اور غلبہ ختم نہ ہو جائے اور اللہ کا نازل کردہ نظام نافذ نہ ہو جائے۔

دورِ حاضر میں غلام بنانے کی شرعی حیثیت:

بعض حضرات یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام میں غلام بنانے کی اجازت اوائل اسلام میں تھی بعد میں منسوخ کر دی گئی اس زمانے میں ہم کو غلام بنانے کی اجازت نہیں ہے اور اپنے اس موقف کو اس لیے الٹے سیدھے دلائل سے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں کہ کسی طرح ثابت کر کے اہل مغرب کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچیں اور ان کو باور کروادیں کہ ہم بھی تمہاری طرح مہذب بن گئے ہیں ہمارے اور تمہارے افکار ہم آہنگ

ہیں۔ میں ان حضرات کے دلائل اوران کے جوابات کی طرف التفات کیے بغیر اہل سنت والجماعت کے صحیح موقف کی طرف رہنمائی پر اکتفاء کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ اپنی کتاب تکملہ فتح الملہم میں تحریر فرماتے ہیں۔

تکملہ فتح الملہم:

ردمن زعم ان الا سترقاق منسوخ: ان کثیراً من اهل اورو باعترضوا فی هذه القرون الاخیرة علی حکم الا سترقاق فی الا سلام جاهلین او متجاهلین عن شروطہٖ و حدود ہٖ و حکمتہٖ و آثارہٖ البالغة فی التاریخ فقامت طائفة . من بین ظهرانی المسلمین یعتذرون عن الاسلام و یطبقونه علی مقتضٰی اهواء اهل الغرب: فقالوا. ان الا سلام لا بیاح فیه الا سترقاق الیوم انما کان مباحاً فی اول الاسلام ثم نسخت هذه الا باحة فی اواخر حیاة النبی ﷺ وممن قام فی الهند بهذه الدعوی السخیفة الباطلة الکاتب المعروف باسم جراغ علی وکان رفیقا من رفقاء سر سید احمد خان فانه کتب لا ثبات هذه الدعوی مقالةفی کتابه اعظم الکلام فی ارتقاء الا سلام وجاء فیهابادلة رکیکة تضحک الثکلیٰ ولسنابحاجه الی سردهذه الأ د لة والردعلیها فانها ممایحکم ببطلانها کل من له ادنی مسکة بالدین وعلمه. (تکملہ فتح الملهم: ج ،ص268)

اس عبارت میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ نے واضح انداز میں ان اہل یورپ کا رد کیا ہے جو اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور وہ مسلمان جو مغربی حمایت حاصل کرنے کیلئے یا

پھر اپنی جہالت کی وجہ سے اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام میں غلام بنانا جائز تھا شروع شروع میں پھر نبی اکرم ﷺ کی وفات کے قریب یہ بات منسوخ ہوگئی تھی۔

لہٰذا اس بات کو ثابت کرنے کیلئے چراغ علی صاحب نے اپنی کتاب اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام میں ایک مستقل مقالہ لکھا جس میں ایسے فضول دلائل سے اسلام میں غلامی کے تصور کی نفی کی ہے کہ اگر وہ دلائل انتہائی پریشان کن آدمی کو سنائے جائیں تو وہ بھی ہنس پڑے۔

اسلام میں غلامی کا تصور آج بھی موجود ہے۔ اگر مسلمان غلبہ کے بعد کسی کو غلام بناتے ہیں تو ان کیلئے غلام بنانا جائز ہے۔ کیونکہ شرعی طور پر غلام بنانے کی اباحت آج تک موجود ہے۔ لیکن امور مباحات میں اگر امیر مسلم منع کر دے تو اطاعتِ امیر لازم ہوتی ہے اس وجہ سے غلام نہیں بنائیں گے۔ باقی بین الاقوامی معاہدات کی رو سے غلام بنانے سے رکیں گے یا نہیں؟ مختصر تو یہ ہے کہ اگر وہ معاہدے کی پابندی کریں تو ہم بھی پابند ہوں گے اور اگر وہ معاہدے کی حکم عدولی کریں تو ہم پر بھی اس معاہدے کی پابندی لازم نہ ہوگی۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل کتب فقہ اور شروح احادیث میں موجود ہے۔ (فلیراجع الی الکتب)

اسلامی تعلیمات سے ناواقف افراد صرف غلامی کے تصور میں ہی اسلام پر شرمندہ نظر نہیں آتے بلکہ ایسے کئی مسائل ہیں جو ان کی محدود عقل سے بالاتر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کما حقہ اسلامی تعلیمات کی حکمتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور یہ ان پر شرمندہ ہوتے ہیں اور بڑے معذرت خواہانہ انداز میں تاویلات کرتے ہیں۔ کہ اسلام میں غلامی منسوخ ہے۔ وراثت میں عورت کو حصہ اس اس حکمتِ عملی سے کم دیتے ہیں۔ مرد و عورت کی دیت میں فرق کی یہ یہ وجہ ہوسکتی ہے۔ چور کا ہاتھ کاٹنا اور دیگر حدود یہ انسانی حقوق کے خلاف نہیں ہیں۔ اس میں یہ یہ فائدے ہوسکتے ہیں۔ ان حکمتوں کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن انہی حکمتوں کو اس انداز سے پیش کرنا کہ سننے والے کے ذہن میں یہ بات نقش ہوجائے کہ حکم تو اسی وجہ سے لگا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو حکم دوسری طرح ہوتا۔

یعنی حکمتوں پر حکم کا مدار رکھنا یہ انتہائی خطرناک بات ہے کیونکہ حکمت تو ایک زمانہ

تک چلے گی پھر وہ ختم بھی ہوسکتی ہے یا کسی جزوی مسئلہ میں وہ حکمت موجود نہ ہوتو کیا حکم بدل جائے گا؟ ہرگز نہیں اس لیے کہ حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے حکمت پر نہیں اور حکمت تو بعد میں حکم سے نکالی جاتی ہے یعنی پہلے علت پھر حکم پھر اس حکم کے فوائد' منافع جو عقل انسانی میں آئیں اس کو حکمت کہا جاتا ہے۔

اور جب کسی حکم کی حکمت اس کے فوائد انسانی عقل سے ماوراء ہوتے ہیں تو انسان آمناو صدقنا کہہ کر خاموش ہوجائے اور کہہ دے کہ میرے رب نے مجھے یہی حکم دیا ہے کہ اس پر عمل کرو اور ایمان بالغیب لاؤ! میں تو مسلمان ہوں یہی کروں گا جیسا کہ سلف امت وصحابہ کا طریقہ تھا۔ قرآن کریم میں ایمان والوں کی چند صفات ذکر کیں ہیں اور وضاحت کی ہے کہ مومن کون ہے۔

1۔الذین یومنون بالغیب (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں)

2۔ویقیمون الصلوٰۃ (اور قائم رکھتے ہیں نماز کو)

3۔ومما رزقنٰھم ینفقون (اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے دیتے رہتے ہیں)

4۔والذین یؤمِنون بما انزل الیک وما انزِل من قبلک (اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو تیری طرف اتار گیا اور جو تجھ سے پہلے اتار گیا)

5۔وبالا خِرَۃ ھم یوُقِنون (اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں)

ان میں سے سب سے پہلی بات غیب پر ایمان لانا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ کی طرف سے جو کچھ آیا ہے وہ سب غیب میں داخل ہے غیب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی مشاہدے' کسی عقلی قیاس کے بغیر ان کو صحیح تسلیم کرنا: احکام الہٰی میں ایسی دلیل کا مطالبہ کرنا جس سے یہ ثابت کرنا ہو کہ یہ واقعہ احکامِ ربانی ہے؟ یہ تو صحیح ہے لیکن یہ جانتے ہوئے کہ یہ حکم شریعت ہے پھر بھی عقلی دلیل اور سائنسی تحقیق کا مطالبہ کرنا اور اگر عقل سے دلیل نہ ملے تو احکامِ شریعت میں شک کرنا یہ صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح تاویلات فاسدہ سے اسلام کی قطع وبرید کرنا اور اپنے بنائے ہوئے عقلی قوانین

اور مغرب سے اخذ کردہ اصول آزادی، مساوات، ترقی سے اسلام کے صحیح وغلط ہونے کا فیصلہ کرنا اور اسلام سے ایسی چیزیں ثابت کرنے کی کوشش کرنا جو ان مغربی اصولوں کے ہم آہنگ ہوں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگرچہ آج کل بہت سے افراد اس مشن میں سرگرم ہیں کہ ہر مسئلہ کی عقلی توجیح پیش کی جائے یا پھر مغرب سے معذرت خواہانہ انداز میں تاویلات پیش کی جائیں کہ جناب ہم بھی آزادی کے حامی ہیں بلکہ آپ سے زیادہ آزادی دیتے ہیں ہم بھی مساوات کو اصول مانتے ہیں۔ اسلام میں بھی مساوات ہے۔ حالانکہ اسلام میں عدل ہے مغرب جس مساوات کا تقاضہ کرتا ہے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ مساوات کی تفصیلی بحث اگلے ابواب میں آجائے گی انشاءاللہ۔

ان افراد کی نیتوں پر تو ہم شک نہیں کرتے شاید یہ اسی بات کو اسلام کی خدمت سمجھتے ہوں مگر ان کی یہ خدمت ایسی ہے جیسا کہ ایک بڑھیا نے عقاب کی کی تھی۔

مثال:

سخت گرمی کا موسم تھا ایک عقاب پھڑ پھڑاتا ہوا ایک بڑھیا کے صحن میں آ گرا بڑھیا بڑی رحم دل تھی اس نے اس کو اٹھالیا اور اس کو پانی پلایا پھر دیکھا کہ اس کو گرمی لگ رہی ہوگی اس پر ایک ڈول پانی کا گرایا پھر کیا دیکھتی ہے کہ اس کے اتنے بڑے پر ہیں گرمی تو لگے گی قینچی لیکر اس کے پروں کو کاٹ دیتی ہے اور اس کے پنجوں کی طرف دیکھ کر بڑا ترس آتا ہے کہ اس کے ناخن کس قدر بدنما ہیں اس کے ناخن بھی کاٹ دیتی ہے۔ مہربانی کرتے کرتے اس عقاب کو کوّا بنا دیا۔ وہ شاہین جو آسمانوں کی بلندی سے زمین کا نظارہ کرنے کا عادی تھا اب اس کی اڑان کی حد بڑھیا کی جھونپڑی سے باہر نہ جاسکتی تھی۔

اسلام کی قطع وبرید کرنے والوں کی مثال اس سے زیادہ کچھ نہیں اگر ان کی نیت درست ہو تو اللہ ان کو ہدایت عطاء فرمائیں اور حقیقت سے آگاہ کردیں لیکن اگر یہ بالقصد اسلام کی بنیادوں کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں تو ان کے وجود سے اللہ زمین کو پاک فرمائے آمین!

کیا اہل مغرب نے انسانیت پر ظلم نہیں کیا؟

اہل مغرب پراپوگنڈے کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بربریت

اسلام میں ہے یا دیگر مذاہب میں ہم جو تصورات و خیالات لوگوں کے سامنے لے کر آئے ہیں یہی امن کا پیغام ہے ان باتوں کو ثابت کرنے کیلئے اور اپنے قانونِ زندگی کو مصالحت اور امن کا علم بردار قرار دینے کیلئے ان کو جو بھی اقدام کرنے پڑیں کرتے ہیں چاہے وہ میڈیا پر پابندی ہو یا ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو کچلنے کی تحریک ہو اور اعتراضات کی ایسی بوچھاڑ کرتے ہیں کہ مخالفین جوابات میں الجھ کر رہ جائیں ہم ایک نظر مغرب کی بربریت پر ڈالتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح قتل عام کیا ہے۔ اور انسانی تاریخ میں جتنا قتل عام اہلِ مغرب نے کیا ہے کسی دوسری قوم نے نہیں کیا۔

اہلِ مغرب کی داستانِ ظلم

براعظم شمالی امریکہ کو یورپی مہم جوؤں نے سولھویں صدی عیسوی میں دریافت کیا کولمبس کی آمد کے وقت امریکہ میں جو لوگ آباد تھے۔ ان کو سرخ ہندی کہا جاتا تھا کہ لوگ ایک اندازے کے مطابق 20 یا 35 ہزار سال قبل ایشاء سے امریکہ میں آئے تھے۔ جس وقت کولمبس وہاں پہنچا تو اس وقت تقریباً دس کروڑ سرخ ہندی النسل آباد تھے اور معمول کے مطابق اپنی زندگی ہنسی خوشی بسر کر رہے تھے۔

شاید ان کی زندگی کا سب سے برا دن وہ تھا جس دن کولمبس کو اس براعظم کا پتہ چلا۔ یورپ کی تاریخ کا سیاہ باب یورپی حملہ آوروں اور آبادکاروں کے ہاتھوں سے شروع ہوا۔

انہوں نے ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور ان کو غلام بنانا شروع کر دیا اور ان کا قتل عام کیا جاتا اور ہر ممکن طریقہ سے ان سرخ ہندیوں کی نسل کشی کی جاتی۔ یورپی حملہ آوروں کے ظلم و ستم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو صدیوں کی قلیل مدت میں ایک پورے براعظم کی آبادی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اور ان کا براعظم ان کیلئے محفوظ نہ رہا ہر طریقے سے ان کا استحصال کیا گیا۔ قتل و غارت گری کرنا آبادیوں میں بیماریوں کا پھیلانا عورتوں سے زیادتی کرنا ان کے مردوں کو غلام بنانا یہ معمول کی بات تھی۔ ان کا خون اس لیے بہایا گیا کہ سونے کے ذخائر پر قبضہ کر لیا جائے اس الم ناک داستان کو تاریخ دانوں نے محفوظ نہ رکھا اس لیے کہ وہ سب روشن خیال تھے اور ان کو مار دینا حق سمجھتے تھے۔

اسی لیے اس ظلم و بربریت کے باوجود نہ آسمان رویا اور نہ زمین کی آنکھ نم ہوئی نہ کوئی سینہ شق ہوا نہ ہی رنگ فق ہوا نہ کوئی چہرا زرد ہوا۔ تاریخ کا یہ المناک باب تین سو سال تک پوشیدہ رہا۔ اب یہ داستان ظلم منظر عام پر آنا شروع ہوئی ہے اس تاریخ کو اول سے آخر تک جاننے کیلئے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

Paddison' Nichals' Nash
Stannard' Sheehan' Wallaee
Hoxie' La Parousse' Phillipn
Hurtada' Heizer' Brawn
Churchill' Eocker' Prucha Madren

(جریدہ نمبر 25، جامعہ کراچی 205)

ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے امریکہ کے اصل باشندوں کی تعداد اور ہلاکتیں معلوم ہو جائیں گی۔

اقتباس:

"ڈیوڈ اسٹیز ڈ کے مطابق قبل از قتل عظیم براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی مجموعی آبادی سے بڑی تھی امریکہ کے ان قدیم باشندوں میں تقریباً 80 لاکھ افراد براہ راست جنگ میں موت کا شکار ہو گئے یا پھر جنگ یا تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اور دل شکستگی کے باعث موت سے ہم کنار ہوئے یہ تمام لوگ کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے بعد 21 سال کے اندر اندر مرے تھے اسٹیز ڈ نے تخمینہ ان اعداد و شمار سے قائم کیا کہ پندرھویں صدی کے اختتام پر کرہ ارض پر 10 کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد صرف 50 لاکھ رہ گئی تھی انسانی قتل پر ایک اور مطالعہ میں جو آر ومیل نے داخلی اور بین الاقوامی جنگوں میں حکومتی قتل کا شکار بننے والوں کی تعداد کی تین عشروں تک دستاویز تیار کرنے کے بعد 1994ء میں مرتب کیا تھا۔ چار عدد قتل عام کا اندازہ لگایا ہے جس میں بیسویں صدی سے قبل معلوم

تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کیے گئے تھے اس کے اندازے میں چین میں 221 قبل مسیح اور انیسویں صدی عیسوی کے اختتام کے درمیان تقریباً تین کروڑ 30 لاکھ افراد کو قتل کیا گیا۔ افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ 70 لاکھ افراد قتل ہوئے اور یورپی باشندوں کی آمد سے لیکر 19 ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ 30 لاکھ افراد کو قتل کیا گیا اس طرح یہ قتل عام تقریباً 10 کروڑ افراد تک پہنچ جاتا ہے لیکن رومیل نے 2005ء میں ان اعداد و شمار میں حیرت انگیز اضافے کیے ہیں اور بتایا ہے کہ سترھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے قتل عام میں پونے دو ارب انسان ہلاک کیے گئے۔ (جریدہ نمبر 35 جامعہ کراچی 265)

براعظم امریکا میں یورپی آبادکاروں نے اس براعظم کے اصل باشندوں کا قتل عام کیا۔ سرخ ھندیوں کے قتل میں کوئی قاعدہ، قانون، اخلاق، اصول اور روایت کا خیال نہیں رکھا گیا صرف ایک ہی قاعدہ تھا جس کا خیال رکھا جا رہا تھا اور اسی کی پیروی ہو رہی تھی۔ خون کے دریا بہا کر سونے کے دریا پیدا کرو جتنا خون سرخ ھندیوں کا بہایا گیا اتنا خون کسی جنگجو بادشاہ نے بھی کسی نسل کا نہ بہایا ہوگا۔

A war of extermination
Will continue to be
Waged between the two
until the indian
Becomes extinct (Phillip.1975.ChP 3-5)

ان سرخ ھندیوں کے اپنے ہی وطن میں ان کی زندگی خطرہ بنا دی گئی۔ یورپی سفید فام لوگوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ ان کو ختم کرنا ہے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے اس زمانے میں ایک نعرہ بہت مقبول ہوا۔

Exterminate or Banish ''ختم کرو یا شہر بدر کردو''

جارج واشنگٹن نے اپنے جنرل کو ہدایت کی تھی کہ ان آبادیوں کو تباہ و برباد کردے۔ان کی تمام باقیات کے خاتمے تک امن کا کوئی نعرہ سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تعارف ایسی قوم کے افعال کا ہورہا ہے جو حقوق انسانی کے علم بردار ہیں اس وقت جب کہ قتل عام ہورہا تھااور جلا وطنی کا عمل جاری تھا پھر بھی تمام صحافی و اخبار سفید فام لوگوں کی تعریف میں مصروف تھےاور ان غریبوں کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ تھا غرضیکہ بڑی بے دردی کے ساتھ ایک براعظم کی آبادی کا مکمل خاتمہ کر کے تاریخ کے سیاہ ابواب میں اپنا نام رقم کروالیا۔ یہ حال تو سرخ ھندیوں کا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ جنگ عظیم اول اور دوم میں جتنا قتل ہوا فوجیں مریں ان کے ساتھ آبادیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔اس کا ذمے دار تاریخ کس کو ٹھہراتی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاسا کی پر ظلم کی داستان سے کون ناواقف ہے اس المناک واقعہ کا سرخیل کون ہے؟

ہم اف بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

باب رابع

مغربی فکر و فلسفہ میں تصورِ آزادی

مغربی فکرو فلسفہ (تہذیب) میں آزادی کا مطلب ہے۔

میں جو چاہوں چاہ لوں اور اپنی اس چاہت کو جس بھی طریقہ سے پورا کرنا چاہوں پورا کروں اور اس عمل پر مجھ سے کوئی بھی پوچھنے والا نہ ہو کسی دوسری طاقت کے سامنے جواب دہ نہ ہوں۔ وہ دوسری طاقت خاندان بھی ہوسکتا ہے والدین بھی ہوسکتے ہیں اور خدا بھی ہوسکتا ہے ان سب سے مطلق العنانی کہ مذہبی جکڑ بندیاں' اخلاقی قدریں اور معاشرتی روایات اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی ہیں یعنی اس بات کی آزادی کہ میں جس چیز کو ٹھیک یا غلط قرار دینا چاہوں ۔کسی کو خیر اور شر متعین کرنا چاہوں تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ خیر کیا ہے میں خود بتاؤں گا شر کیا ہے وہ بھی میں خود بتاؤں گا ۔ یہ آزادی مغرب کا نصب العین ہے کہ خیر اور شر کی تفسیر کا حق بندے کو دے دیا جائے۔

تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر فرد کو آزادی ہے کہ جس چیز کو خیر سمجھ کر اپنانا چاہے اس کو اجازت ہے۔لواطت کو کوئی حلال جانے یا حرام یہ اس کی مرضی ہے۔شادی مرد سے کرے یا عورت سے یہ بندے کی مرضی ہے۔اسے ان تمام امور کی آزادی ہے جسے چاہے اختیار کرلے۔

اس بات کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اہلِ مغرب جس آزادی کے طلب گار ہیں اس آزادی کا مطلب ہے کہ بندے کو خیر اور شر متعین کرنے کی آزادی دی جائے۔اس کے پاس عقل ہے اور عقل کے ہوتے ہوئے اس کو یہ روا نہیں دیتا کہ کسی دوسری طاقت (وحی وغیرہ) سے خیر اور شر کی تعین کروائے۔اس کی عقل اس کی رہنمائی کیلئے کافی ہے۔

کیا اچھا ہے کیا برا ہے کیسے اخلاق ہونے چاہییں کیسے نہیں ہونے چاہییں کیا

بندے کیلئے مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے۔ کونسا قانون ہونا چاہیے کون سا نہیں ہونا چاہیے اس کا تعین کرے گا تو خود انسان کیونکہ یہ آزاد ہے کسی کا پابند نہیں ہے۔ لیکن آزادی اس کو من حیث الفرد حاصل ہے یا من حیث القوم۔ اس اعتبار سے آزادی کی دو قسمیں بن جاتی ہیں جس کو مغربی مفکر ذکر کرتے ہیں۔

آزادی کی اقسام

آزادی کی دو قسمیں ہیں: منفی آزادی۔ مثبت آزادی

جب ہم منفی یا مثبت کا لفظ سنتے ہیں تو لاشعوری طور پر منفی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں بری چیز ہوگی اور مثبت کا مطلب سمجھتے ہیں کہ اچھی چیز ہوگی لیکن اس تناظر میں مثبت کا معنی اچھا ہونا یا منفی کا معنی برا ہونا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ نہ سمجھا جائے کہ مثبت آزادی کا تصور صحیح و درست ہے اور منفی تصور آزادی غلط اور باطل ہے۔

منفی آزادی:

یہ مختصر سی الوہیت ہے کہ بندہ کہے! میں جو چاہوں چاہ لوں اور اس کو حاصل کر لوں اور اپنی چاہتوں کے حصول کیلئے کسی دوسری حقیقت کے سامنے جواب دہ نہ ہوں۔

جس چیز کو خیر قرار دینا چاہے خیر قرار دے دے اور جس کو شر قرار دینا چاہے شر قرار دے دے اور خیر اور شر قرار دینے کا حق ہر ہر فرد کو انفرادی طور پر ملے گا۔

منفی آزادی کا مطلب ہے کہ ہر ہر فرد کو خیر اور شر کی تفسیر و تعین کرنے کا حق ملے گا۔ مثلاً اگر کوئی آدمی سود لینے کو۔ رضامندی سے زنا کرنے کو صحیح سمجھتا ہے یا کسی شخصیت کے بارے میں کوئی رائے رکھتا ہے یعنی کسی نبی کی گستاخی کرتا ہے تو اس کو حق ہے کیونکہ وہ آزاد ہے کسی کا پابند نہیں جو چاہے خیال قائم کرے۔

مثبت آزادی:

منفی آزادی میں خیر و شر کی تعیّن کا حق ہر ہر فرد کو ہوتا ہے اور مثبت آزادی میں یہ حق پوری سوسائٹی/قوم کو ہوتا ہے معاشرے کے اکثر افراد جس کو صحیح کہیں وہ صحیح قرار پاتا ہے اور جسے غلط قرار

دے دیں وہ قانوناً بھی غلط تسلیم کرلیا جاتا ہے جمہوریت اسی بات کی آئینہ دار ہے اگر معاشرے کے اکثر افراد مل کر یہ طے کرلیں کہ مرد کی مرد سے شادی جائز ہونی چاہیے اس کو قانوناً حق دیا جائے یا ہم جنس پرستی کو قانوناً تحفظ ہونا چاہیے اکثریت کی رائے سے یہ قانون بن جائے گا۔ مختصراً یہ کہ خیر اور شر کو متعین کرنا کسی فرد کے بس میں نہیں ہے بلکہ یہ حق مجموعی طور پر ایک قوم کو حاصل ہے من حیث القوم قانون طے کیا جائے گا اور خیر اور شر کے بارے میں بتایا جائے گا۔ منفی آزادی میں یہ کام ہر فرد کرتا ہے۔ مثبت آزادی میں یہ حق مجموعی طور پر عوام کو حاصل ہے کسی ایک فرد کو حق حاصل نہیں ہے۔

انسانی حقوق کے عالمی منشور میں اسی آزادی کے تحفظ کی بات کی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آزادی کو تحفظ کیسے دیا جائے یہ نظر تو آتی نہیں غیر محسوس چیز ہے۔ ناپی بھی نہیں جاسکتی۔

○۔ تحفظ آزادی کا کیا مطلب ہے؟ ○۔ آزادی کو تحفظ دیا جائے کا کیا مطلب ہے؟

خاندانی روایات مذہبی حد بندیوں اور معاشرتی دباؤ کی وجہ سے انسان اپنی بہت سی خواہشات کو بروے کار نہیں لاسکتا کہ اگر میں نے خواہشات پر عمل کیا تو معاشرہ میرے خلاف ہو جائے گا' خاندان والے کیا کہیں گے۔

آزادی کو تحفظ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اقدام کیے جائیں کہ انسان اپنی ان تمام خواہشات کو پورا کرسکے یا ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرسکے جن کو معاشرہ اچھا نہیں سمجھتا' مذہب اس سے منع کرتا ہے۔ خاندان اس کے سامنے رکاوٹ بنتا ہے۔

ایسے قوانین تشکیل دیے جائیں جن کی وجہ سے انسان اپنی خواہشات کو آسانی سے پورا کرسکے۔ اس خواہش کو پورا کرنے میں خاندان' معاشرہ یا مذہب آڑے نہ آسکے۔

مثال: ہر صحت مند انسان وہ عورت ہو یا مرد اس کا میلان جنس مخالف کی طرف ہوتا ہے۔

اسلام نے اس جنسی تسکین کا طریقہ نکاح کی صورت میں مقرر کیا ہے۔ میلان کا جنسی تقاضہ جوان ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے مسلمان معاشروں میں یہ بات بہت بعید تھی کہ نوجوان نامحرم لڑکیاں' لڑکے آپس میں بیٹھیں' باتیں کریں' ہنسی مذاق کی مخلوط محفلیں ہوں

اس عمل کو معاشرے میں بے حد معیوب سمجھا جاتا تھا اور اسلام بھی اس طرز زندگی سے منع کرتا ہے کہ نامحرموں سے تعلق رکھیں یا مخلوط محفلوں میں جائیں۔ جنسی تسکین کو پورا کرنے کیلئے معاشرہ، مذہب اور خاندان نوجوان کی آزادی میں رکاوٹ ہیں ان کی آزادی کو تحفظ اس طرح دیا جاتا ہے کہ ایسے اقدام کیے جائیں کہ یہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں۔

1۔ میڈیا کے ذریعے معاشرے کی ایسی ذہن سازی کی جائے کہ اس چیز کا قبح و برا ہونا لوگوں کے ذہن سے نکل جائے۔

2۔ مخلوط تعلیمی نظام قائم کیا جائے کہ بہت سے خاندان نہ چاہتے ہوئے بھی اس ماحول سے متاثر ہو جائیں گے۔

3۔ ایسے قوانین تشکیل دیئے جائیں کہ عورتوں کو گھر سے باہر آنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے۔

آزادی کو تحفظ دینے کا مطلب یہ ہوا کہ ہر اس رکاوٹ کو ختم کیا جائے جو انسان کو اس کی چاہت پورا کرنے سے روکتی ہو وہ رکاوٹ مذہب ہو، معاشرہ ہو یا خاندانی رسم ورواج ہوں۔

لفظ ’’آزادی‘‘ دو مختلف معانی کا حامل

مسلمان بھی آزادی کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اہل مغرب تو اس کو بطور قدر کے تسلیم کرتے ہیں لفظ آزادی الفاظ کے اعتبار سے اگرچہ ایک ہی طرح لکھا جائے گا مگر یہ دو مختلف تصور اپنے اندر رکھتا ہے اس سے مراد مطلق العنانی بھی ہو سکتا ہے اور اس کا مطلب قید سے رہائی ملنا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی لفظ کا جب پس منظر بدل جائے تو اس کا معنی بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

مابعد الطبعیات کے بدلنے سے معنی بدل جاتا ہے۔

مثال نمبر 1:

لفظ (عدل) اہل سنت کے نزدیک بھی استعمال ہوتا ہے اور معتزلہ کے نزدیک بھی۔ مگر معتزلہ کے ہاں اس کا معنی قدرے مختلف ہے حالانکہ ایک ہی لفظ ہے مگر مابعد الطبعیات کے بدل جانے سے معنی بدل گیا۔ اسی طرح تمام اصطلاحی الفاظ جو ایک گروہ

استعمال کرتا ہے تو اس کا اپنا پس منظر (مابعد الطبعیات) ہوتا ہے لیکن جب کوئی اور گروہ وہ لفظ استعمال کرے اور اس کا پس منظر کسی اور چیز کو قرار دے تو لفظ شکلاً اور مادہ کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود معنی بدل جاتا ہے۔ جیسا کہ لفظ عدل' آزادی وغیرہ۔

مثال نمبر 2:

لفظ (عدت) کا معنی ہوتا ہے شمار کرنا' گننا لیکن جب مطلقہ عورت کو کہا جائے کہ اپنی عدت کے بعد تم شادی کر سکتی ہو تو اس وقت اس سے مراد شمار کرنا نہیں بلکہ خاص مقدار میں دن یا تین حیض کی مدت مراد ہوتی ہے۔ لفظ ایک ہونے کے باوجود معنی بدل گیا پس منظر کے بدلنے کی وجہ سے یہی حال لفظ آزادی کا ہے مسلمان سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد ہے خیر اور شر میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی کہ کسی کو مجبور نہ کیا جائے کہ کیا اختیار کرو۔ اور مغربی تصور آزادی یہ ہے کہ خیر اور شر مقرر کرنے کی آزادی جسے چاہے اچھا قرار دے دو اور جسے چاہے برا سمجھ کر چھوڑ دو۔ مثلاً زنا' لواطت' عورتوں کا بے پردہ پھرنا وغیرہ۔ سب جائز قرار دے کر عمل کر سکتے ہو۔ خلاصہ کلام یہ کہ مغرب میں آزادی کا مطلب ہے مطلق العنانی (بے لگامی) ہر طرح کی مذہبی و خاندانی رکاوٹ معاشرتی رسم و رواج سے آزاد ہو کر زندگی گزارنا۔

نظریہ آزادی کا بانی:

اس نظریے کا بانی ڈیکارٹ ہے۔

اس نے جدیدیت کی عملی بنیادوں کا نہ صرف تعین کیا بلکہ بچی کچی مذہبیت کو بھی عملی بنیادوں پر اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی ہے اور ایک نئے اقداری ڈھانچے کیلئے عملی بنیادیں فراہم کی ہیں اور ایک نئے انسان کا تصور پیش کیا پچھلی تمام تہذیبوں میں کسی نہ کسی اعلی اتھارٹی کا تصور موجود تھا کوئی اس اعلی اتھارٹی کو بھگوان کہتا کوئی دیوتا یا خدا کہہ کر پکارتا کوئی کرشن کہتا تھا۔ بہر حال ہر قوم کے پاس ایک ایسا تصور تھا جس کے سامنے انسان جھکتا تھا اور وہی ہستی خیر و شر کی تعیین کرتی تھی اس سے (اچھائی کیا ہے برائی کیا ہے) اس کا علم انسان اخذ کرتا تھا۔

ڈیکارٹ نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس میں ہر اس ادراک کو ہر اس علمیت کو رد

کر دیا جو انسان کی عقل کے علاوہ کسی غیر سے لی جائے کیونکہ اس کے نزدیک انسان ہی علم کا ماخذ و منبع ہے اس نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے عقلی دلیل دی اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ علم کا منبع انسان خود ہے۔

دلیل:

I think therefor I am

جب اپنے علاوہ ہر چیز پر شک کیا جا سکتا ہے اور صرف میرا اپنا وجود یقینی ہے اس کے علاوہ اگر کوئی حقیقت اعلی کا وجود ہے بھی تو میری عقل اور تجربہ اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اس لیے میں اس کو بغیر عقل اور مشاہدے کے کیسے تسلیم کرلوں لہٰذا دنیا کی سب سے بڑی حقیقت میرا اپنا وجود ہے جس پر میں شک نہیں کر سکتا اپنے علاوہ ہر چیز میں شک کیے جانے کی گنجائش ہے کہ آیا وہ چیز واقعتاً خارجی کائنات میں موجود ہے بھی یا نہیں۔ کہیں یہ میری آنکھوں کا دھوکہ تو نہیں؟

لہٰذا میری عقل کی یہ استطاعت نہیں ہے کہ اپنے وجود کے علاوہ کسی دوسری ہستی کا وجود ماورائے شک بیان کر سکے اس لیے میں تمام ایسی ہستیوں کا انکار کرتا ہوں۔ اس طرح ڈیکارٹ نے ایک ایسی علمیت کی بنیاد رکھ دی جس میں انسان کی حیثیت بدل گئی آئیڈیل بدل گئے بنیادی قدروں کا تبادلہ ہو گیا اور علمیت حاصل کرنے کا منبع اور ماخذ کوئی اور قرار پایا اور صحیح و سقم، غلط و درست جاننے کے معیارات بدل گئے۔

اس ڈیکارٹ کی علمیت کی وجہ سے انسان کا مقام یہ ٹھہرا:

1۔ انسان کائنات کا مرکز و محور ہے۔

2۔ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے۔

3۔ مساوات بنیادی قدر ہے۔

4۔ عقلیت بحیثیت معیار کے ہے۔

ڈیکارٹ نے Self یعنی ذات انسانی کو ایک ایسے علم کا مخزن قرار دیا جو تجربہ سے ماوراء ہے اور وہ بتاتا ہے کہ انسانی ذات میں ایسا نظام اور ترتیب موجود ہے جو منبع نور ہے اس

کی بیرونی کائنات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے لہٰذا اس نے نفس انسانی کو خدا کا مقام دے دیا اور عقل انسانی کو پیغمبروں کی جگہ بٹھا دیا۔ یعنی پہلے غلط وصحیح خیر وشر کی تعیین وحی الٰہی سے ہوتی تھی اب انسان کا نفس یہ فیصلہ کرے گا کہ صحیح کیا ہے غلط کیا ہے پہلے رہنمائی پیغمبر کیا کرتے تھے وحی الٰہی کی ترجمانی انبیاء کیا کرتے تھے لیکن اب چونکہ نفس انسانی خیر وشر۔ صحیح وغلط کی حدود مقرر کرے گا تو اس نفس کی ترجمانی عقل کرے گی۔ خلاصہ یہ نکلا کہ خدا کی جگہ نفس انسانی قرار پایا اور پیغمبروں کی جگہ رہنمائی کیلئے عقل نے لے لی۔

جب وحی الٰہی کی جگہ نفس انسانی اور پیغمبروں کی رہنمائی کی جگہ عقل انسانی نے لے لی تو اس کے نتیجے میں جو انسان وجود میں آیا وہ خواہشات کا غلام تھا اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی ہوس میں مطلق العنان آزادی کا طلب گار تھا۔

مذہبی افکار، روایتی اقدار اور خاندانی اخلاقیات اس کی خواہشات کو پورا کرنے میں رکاوٹ نہ بنیں اس لیے مغربی مما لک نے آزادی کا نعرہ لگایا اور آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کی تاکہ یہ روایتی مذہبی اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو۔

آزادی کے حصول کی مادہ شکل سرمایہ ہے لہٰذا طے پایا کہ جو جتنا سرمایہ دار ہے اتنا ہی زیادہ آزاد ہے کیونکہ جتنا سرمایہ ہوگا اتنا ہی دنیا کو مسخر کر سکے گا مثلاً گرمیوں کے موسم میں گرمی کو (AC) لگا کر سردی میں تبدیل کرنا اور سردیوں میں ہیٹر لگا کر گرمیوں میں بدلنا۔ سرمایہ ہے تو ہواوں میں اڑنا اور سمندروں کی تہوں تک پہنچنا ممکن ہے غرض جتنا زیادہ سرمایہ ہوگا اتنا دنیا کو مسخر کر سکے گا اتنا ہی آزاد ہوتا چلا جائے گا۔ جتنا زیادہ سرمایہ ہوگا اتنا ہی اپنی خواہشات کو زیادہ پورا کر سکے گا اسی نظریے کے پیش نظر اپنی تمام تر قوت وصلاحیت سرمائے کے حصول میں لگائی جاتی ہے۔

نظریہ آزادی سے پیدا ہونے والی معاشرتی خرابیاں

مغربی تہذیب کی حکمت نظری اور حکمت عملی کی عمارتیں دونوں ہی غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہیں جس کے نتائج ایک سو سال بعد واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں اور ان کی تہذیبی فکر کا نقص کھل کر واضح ہو گیا اور ان کے نعرہِ آزادی ومساوات نے معاشرے میں جو گل

کھلائے اہل عقل و دانش اس پر حیران کھڑے تماشہ دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

مغرب نے جب آزادی کا نعرہ لگایا تو بہت سے طالبان عیش و عشرت اور نفس کے غلام آزادی کے حصول کے لئے سرگرداں ہوگئے۔ پھر جب معاشرہ آزادی کی انتہا تک پہنچ گیا تو اس میں اس قدر حیرت انگیز اور افسوس ناک واقعات رونما ہونے لگے کہ انسانی تاریخ نے اس قدر تاریک باب کا نظارہ کبھی نہیں کیا تھا۔ جس میں ہر مرد و عورت نفس کا غلام ہو اور وحشی ہو۔ وحشت و ظلم اور بے غیرتی اس قدر بڑھ جائے کہ اولاد تک اپنے والدین سے جنسی طور پر محفوظ نہ ہو۔ عورت کیلئے عزت کا کوئی مقام نہ رہا۔ حصول آزادی کیلئے مغرب نے مندرجہ ذیل حسین عنوانات اختیار کیے اور لوگوں کو طلب آزادی کیلئے ابھارا اور یہی تحریک عام کی۔

1۔ حق اظہار رائے　　2۔ حقوق نسواں　　3۔ اتحاد بین المذاہب

حق اظہار رائے:

یوں تو بڑا حسین عنوان ہے اس قدر حسین کہ کسی کو بھی اس عنوان اور مقصد پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے کہ ہر آدمی کو اپنے خیالات اور بات کہنے اور سننے کی اجازت ہو افہام و تفہیم سے ایک دوسرے کو قائل کر لیا جائے لیکن اس عنوان سے صرف افہام و تفہیم مراد نہیں ہے بلکہ مطلق العنانی کا وہ عنصر بھی شامل ہے جس کا مغرب طلب گار ہے تو اس حسین و پر کشش عنوان کا مطلب ہے کہ آدمی جو کچھ بھی جس کے خلاف بکنا چاہے بک سکتا ہے اس کی ہر کسی کو آزادی ہے جو رائے دینا چاہے دے جو خیال نقل کرنا چاہے نقل کرے اگر کسی پیغمبر کی توہین کرنا چاہتا ہے تو اس کی رو سے اس کو اجازت ہوگی۔ خدا' رسول' کتاب اور تمام معزز ہستیوں کا مذاق اڑانا اس کا حق ہے۔ جس کا دل چاہے توہین آمیز خاکے بنا کر شائع کردے یہ بھی اظہار رائے کی آزادی کی رو سے اس کو حق حاصل ہے غرضیکہ کسی قید و بند کے بغیر مطلق العنان آزادی حاصل ہو تحریر کی رو سے بھی تقریر کی رو سے بھی۔ یہ سب باتیں ماڈرن ازم میں فخر سے بیان کی جاتی ہیں اور جو آدمی مذہب کی وجہ سے کسی معزز ہستی کی توہین کا قائل نہیں ہے تو وہ آدمی اس تہذیب کے نزدیک فرسودہ ہے' اجڈ ہے اس نے اپنی انسانیت کو پہچانا ہی نہیں۔ مذہبی جکڑ بندیوں میں

گھرا ہوا ہے وہ اپنے کو آزاد نہیں سمجھتا لہٰذا وہ آزاد اور ماڈرن نہیں ہے۔

اصول کے مطابق منشأ کلام تو متکلم ہی بتایا کرتا ہے تو اہل مغرب حق اظہار رائے سے مراد یہ معانی لیتے ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں اس مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہر مسلمان فیصلہ کرسکتا ہے کہ آزادی اظہار رائے کا حق اسلام دیتا ہے یا نہیں یقیناً ایسی مطلق العنانی کی اجازت اسلام نے کبھی بھی نہیں دی اور یہ بات بھی مناسب نہیں ہے کہ ایک لفظ کا خود ہی معنیٰ مقرر کر کے اس کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیے جائیں۔اور متکلم سے اس کی مراد طلب ہی نہ کی جائے۔اور اپنا معنی مراد لیکر حلت اور جواز کی رٹ لگالی جائے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ آزادی صرف کفر بکنے توہین کرنے کیلئے تو ہے کیونکہ اس سے مغربی ذہنیت کا پرچار ہوتا ہے مگر مغربی ظلم وستم دکھانے یا لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ڈرون حملوں میں ہلاک ہونے والے افراد تڑپ تڑپ کر مرنے والے خاک وخون میں لت پت چہرے دکھانے کی اجازت نہ کسی اخبار کو ہے اور نہ ہی کسی ٹی وی چینل کو ہے۔

حقوق نسواں:

عورتوں کی آزادی کو تحفظ دینے کیلئے مختلف جماعتیں' حقوق نسواں کے عنوان سے کام کررہی ہیں عنوان تو اگرچہ یہ بھی بہت حسین ودلکش ہے کہ عورتوں کو معاشرتی ظلم وستم سے بچانے کیلئے تحریک چلائی گئی ہے مگر اس تحریک کا اصل مقصد عورتوں میں شعور بیدار کرنا اور ان کو اکسانا کہ مذہبی جکڑ بندیاں خاندانی روایات اخلاقی قدریں کچھ نہیں ہوتیں بلکہ آزادانہ باہر جا کر کام کرنا اپنے لیے معاشرے میں مقام پیدا کرنا تمہارا حق ہے۔اگر کماؤ گی نہیں تو معاشرے پر بوجھ بن جاؤ گی الغرض مارکیٹ میں کام کرنا اور ملازت اختیار کرنا تمہارا حق ہے۔

جب عورت باہر نکلی تو گویا کہ فتنہ بازاروں میں نکل آیا۔عریانی فحاشی عام ہوگی۔عورت جو ایک زمانے تک بہن' بیٹی' ماں کے روپ سے جانی جاتی تھی۔لیکن جب گھر کی چار دیواری کو ترک کر کے عورت روڈوں' بسوں' ورکشاپوں' میڈیکل سٹوروں ریلوے اسٹیشنوں میں ورکر' سیکٹری بن کر کام کرنے لگی تو اپنا ذاتی حسن بے پردگی کی وجہ سے کھو بیٹھی اور اس کی زبان پر بھی نعرہ

آزادی تھا مگر جتنا خسارہ مغربی عورت کو اس نعرے کے اپنانے کی وجہ سے پہنچا ہے شاید ہی کوئی دوسرا اس سے اتنا متاثر ہوا ہو۔ان کے گھر ان کے لئے غیر محفوظ مقام بن گئے آزادی کا نعرہ لگا کر باپ بھائی اس قدر وحشی ہو گئے کہ ان کے جنسی تشدد سے وہ محفوظ نہیں رہیں۔

آزادی کا یہ ثمر دیکھ کر اہل مغرب نے اس سے توبہ نہیں کی بلکہ آزادی کو تحفظ فراہم کیا کہ عورتوں اور جوان لڑکیوں کو جو گھروں میں تشدد کا شکار ہیں ان کیلئے دارالامان بنوائے۔مگر اس میں حفاظت کیسے متصور کر لی جائے جبکہ معاشرے کا ہر فرد اپنی من چاہی زندگی طلب کرنے کا اتنا حریص ہے کہ اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا ان کو کوئی پرواہ نہیں۔ جب عورت گھر میں خبیث النفس باپ سے محفوظ نہیں تو اس معاشرے کے کسی غیر فرد سے کیسے توقع کی جاتی ہے۔عورتوں کی بے باکانہ آزادی اور بے پردہ باہر آنے سے جنسیات بھڑکتی ہیں اور شادی کے علاوہ طریقوں سے خواہش کو پورا کرنے کیلئے قانونی تحفظ آزادی کے نام سے ہی دیا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا۔محبت ورواداری کا نشان تک گم ہو گیا انسانیت کثرت مال کے باوجود پریشانیوں اور تنہائیوں کا شکار ہو گئی ہے۔

معاشرے میں تمام تر اخلاقی بگاڑ کی ذمہ دار یہ تحریک آزادی ہے جس کی وجہ سے اس معاشرے میں صرف جوان عورت کو اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ یہی عورت ان کے کام آ سکتی ہے لیکن ایام حیات ڈھلتے ہی وہ حسینہ معاشرے پر بوجھ تصور کی جاتی ہے اپنے حسن کو برقرار رکھنے کیلئے عورتوں نے بچے جننے چھوڑ دیئے۔اس نسل کشی پر حکومتیں پریشان نظر آ رہی ہیں ان کی آبادیاں مسلسل کم ہو رہی ہیں۔لیکن وہاں کی عورت بچہ جننے کیلئے تیار نہیں کیونکہ وضع حمل اور بچے کو دودھ پلانے سے نسوانی حسن میں کمی آ جائے گی اور حسن کے کم ہونے کے بعد اس تنہاء عورت کی زندگی موت سے بھی زیادہ اجیرن ہوتی ہے غم و بیماری میں کوئی پرسان حال تک نہیں ہوتا۔اس قدر خود غرض معاشرے کی تکمیل جن عقائد ونظریات پر ہوئی ہے ان میں بنیادی حیثیت آزادی کی ہے۔اسی غلط عقیدے کی بنیاد پر وہ کشیدگیوں کے شکار ہیں۔قریب ہے کہ ان کی تہذیب کا شیرازہ بکھر جائے اور یہ اپنی موت آپ مر جائے۔

تمہاری تہذیب تمہارے خنجر سے خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

آزادی مذہب:

آزادی مذہب کے نعرے کا مطلب ہے کہ تمام مذہبی اقدار ختم ہوگئیں مذہب یا دین نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی جس کام کو بھی انسانی عقل اچھا بتلائے اسے کرسکتے ہو کسی مذہب سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔تم ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہو جسے چاہو اپنالو جسے چاہو ترک کردو۔ حالانکہ دین تو نام ہے ایک ضابطہ حیات کا جس میں پروردگار اپنے بندے کو احکام ومسائل کا پابند کرتا ہے اور یہ پابندی مغربی تصور آزادی کے بالکل مخالف ہے۔لہٰذا آزادی کا دعویٰ کرنے والے مندرجہ ذیل امور کو عمل میں لانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے مثلاً۔زنا۔سود اور لواطت وغیرہ کے جواز پر اگر جمع ہو جائیں تو یہ اس معاشرے میں جائز قرار دےدیئے جائیں گے۔کیونکہ اس معاشرے میں خیر اور شر کا تعین کسی غیر سے نہیں بلکہ خود انسان کریں گے عقل کے ذریعے۔

1۔ زنا برضاء ان کے نزدیک جائز ہوگا۔
2۔ لواطت میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جائے گی۔
3۔ انسان دین تبدیل کرنے میں آزاد ہوگا۔
4۔ دین کے جزوی یا کلی مسائل میں دین پر اعتراض کرنے میں اِن کو آزادی ہوگی۔
5۔ اگر ایک دین کو اختیار کیا ہے پھر دوسرے کو اور پھر تیسرے کو ان سب کی بندے کو آزادی ہوگی۔
6۔ انسان ہر قسم کی مذہبی پابندی سے بری متصور کیا جائے۔
7۔ انبیاء ورسل کے بارے میں ہر قسم کی رائے رکھنے میں آزادی ہے وہ حق میں ہو یا خلاف ہو۔
8۔ مذہب میں آزادی ثابت کرنے کا مطلب ہے کہ ہر انسان شطرِ بے مہار رہے۔
جس طرح مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے عورت کو بھی ہے جس طرح طلاق دینے کا حق مرد کو ہوتا ہے اسی طرح طلاق دینے کا حق عورت کو بھی دے

دیا جائے کہ وہ بھی طلاق دے سکتی ہے۔

9۔ اذان کے وقت مسجد کی طرف کھچے چلے جانا، نماز کو ضروری سمجھنا اور دیگر عبادات کی پابندی کرنا اور ان کو لازمی سمجھنا کوئی ضروری نہیں، یہ چند جزئیات ہیں اگر مذہب میں آزادی تسلیم کرلی جائے تو یہ جزئیات اعتراض بن کر ابھرتی ہیں۔

یہ سب چیزیں آزادی مذہب کے ضمن میں آتی ہیں آزادی مذہب کو ہم کوئی دوسرا نام دینا چاہیں تو میرے خیال میں یہ دھریت اور بے دینی کو فروغ دینے کے سوا کچھ نہیں۔

دنیا کا کوئی بھی مذہب اپنے ماننے والوں کو ایسی آزادی نہیں دیتا کہ حق اور خیر یا شر اور باطل کی تعیین خود انسان طے کرے اور جب چاہے اس مذہب سے منحرف ہو جائے۔

مساوات

مغربی مفکرین نے جو فکر و فلسفہ پیش کیا ہے اس میں (آزادی) کے بعد (مساوات) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کسی چیز پر صحیح وغلط کا حکم لگانا ہو یا یہ دیکھنا ہو کہ یہ انصاف کے مطابق ہے تو وہ ان اصولوں سے چیک کرتے ہیں۔

1۔ اس امر کا کوئی پہلو انسانی آزادی میں کمی تو نہیں لا رہا ہے؟

2۔ مساوات انسانی اس سے متاثر تو نہیں ہو رہی ہے؟

ہم اس فصل میں جائزہ لیں گے کہ مساوات کی حیثیت کیا ہے اور اس کو قانون بنانا صحیح ہے یا نہیں؟

3۔ مساوات کا مغربی معنی اور مشرقی نظر و فکر میں مساوات کا معنی کیا ہے اور عدل و مساوات میں فرق پر روشنی ڈالیں گے۔

4۔ مغربی تہذیب میں انسانی مساوات کی کیا حیثیت ہے۔ اور کس وجہ سے انسانوں میں مساوات ہے اور اسلامی نقطہ نظر میں مساوات کس بنیاد پر ہے؟

5۔ مساوات کوئی کمال بھی ہے یا کہ عیب ہے؟

نظمِ کائنات میں مساوات یا درجہ بندی

یہ بات واضح ہے کہ دنیا میں تمام اشیاء ایک ہی طرح کی نہیں ہیں بلکہ کوئی چھوٹی کوئی بڑی کوئی سیدھی ہے تو کوئی ٹیڑھی۔ اِن مختلف الوجود اور مختلف المراتب بے شمار اشیاء سے مل کر یہ جہان بنا ہے۔ یہ ہموار زمین بلند و بالا پہاڑ بہتے ہوئے چشمے وسیع و عریض سمندر، وادیاں، ندی نالے، سورج، چاند، ستارے غرض بے شمار چیزیں ملا کر اس جہاں کی تعمیر کی گئی۔ جن میں سے ہر ایک اپنے عمل میں مصروف ہے یہ سورج و چاند کا آنا جانا، ندی نالوں اور چشموں کا جاری ہونا زمین کا سینہ چیر کر نباتات اُگنا غرض کہ تمام کائنات رب کریم نے ایک حسین نظام میں پروئی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بڑی خوش اسلوبی سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ جس میں اعلیٰ وادنیٰ ماتحت و بالا، امیر و غریب مزدور و مالک حاکم و محکوم کا حسین امتزاج ہے۔

ہر ایک کی دوسرے کے ساتھ غرض وابستہ ہے جس سے زندگی کے تمام شعبے اور نظام چل رہے ہیں اگر سب برابر ہو جائیں کوئی امیر نہ رہے کوئی غریب نہ رہے۔ مزدور کو مالک سے کوئی غرض نہ رہے اور مالک مزدور سے بے نیاز ہو جائے تو یہ کائنات کا نظام چل نہیں سکتا لامحالہ ایسی مساوات کا کوئی بھی دعوے دار نہ ہوگا کہ کائنات میں سب جسم، حجم وزن کے لحاظ سے یا بقاء وارتقا کی حیثیت سے برابر ہیں۔ اونٹ، گھوڑا، بکری، بیل، پہاڑ، دریا اور سمندر، چوٹیاں کہسار جنگل وغیرہ سب کو ایک ہی زمرے میں شامل کرنا کہ یہ اشیاء ہر حیثیت سے برابر ہیں۔

ایسا دعویٰ کرنا محال کا دعویٰ کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ مساوات کلی ممکن ہی نہیں ہے اگر کوئی مساوات کا دعویٰ کرتا بھی ہے تو ایک خاص قسم کی مخلوق میں مساوات کا مدعی ہوگا جیسا کہ مغرب میں انسانی مساوات کو بطور قانون اور ماخذ کے قبول کیا جاتا ہے۔ ہماری بحث میں بھی مطلوب یہ ہے کہ آیا سب انسان تمام حیثیتوں سے برابر ہوتے ہیں یا فرق ہوتا ہے اور اگر مساوات ہے تو کس بنیاد پر ہے۔ قانون کے نافذ کرنے میں مساوات ہوگی؟ یا قانون بنانے میں کہ ہر ایک ضعیف وقوی مرد و عورت کیلئے احکام میں مساوات ہے۔

کیا انسانوں میں مساوات ہے؟

ہر چیز میں مساوات ممکن نہیں ہے نظم کائنات کو چلانے کیلئے درجہ بندی ضروری ہے۔اب محل نظریہ بات ہے کہ آیا تمام بنی آدم برابر ہیں یا کچھ اعلیٰ اور کچھ ادنی ہوتے ہیں یا تمام انسان تمام حیثیتوں سے برابر ہوتے ہیں۔

بندے باعتبار شرف وفضیلت اور بلند مقام کے دو طرح کے ہیں:

1۔ بندے کا اپنا عمل کوشش ومحنت اس کے مقام کے حصول میں شامل حال ہو۔

2۔ بندے کی کوشش ومحنت کا اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں دخل نہ ہو بلکہ محض رب کریم کی عطاء ہو۔

ان دونوں معاملات میں تمام انسان مساوی نہیں ہیں کوشش محنت دل لگی سے کام کرنے والے سستی کاہلی اور بدذوقی وبدمختی سے کام کرنے والے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں ان میں دنیاوی امور کے اعتبار سے برابری ممکن نہیں۔

قدیم یونان کا مشہور فلسفی افلاطون حکومت کیلئے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتا تھا کہ کچھ تو حکام ہوں گے کچھ لشکر کے افراد ہوں اور باقی عوام الناس ہوں۔وہ کہتا تھا کہ تمام لوگ صلاحیتوں میں برابر نہیں ہیں کچھ بہت عقل کے مالک ہیں اور کچھ غبی وسست ہیں لہٰذا دانش وروں اور اہل لوگوں کے ہاتھ میں قیادت دینی چاہیے نااہل اور غبی وسست لوگ ان کے ماتحت ہو کر زندگی گزاریں۔وہ جمہوریت کی کلی طور پر نفی کرتا تھا۔اسی طرح کے نظریات ارسطو کے تھے۔

ان لوگوں نے تو انسانوں کی ظاہری صلاحیتوں کو دیکھ کر یا پھر ان صلاحیتوں کو قابل عمل بنانے کے تفاوت کو دیکھ کر انسانوں میں عدم مساوات کا فیصلہ کیا۔حالانکہ عدل وانصاف کے وہ بھی حامی تھے۔انسان میں کچھ صلاحتیں ایسی ہوتی ہیں جو محنت سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ محض اللہ ہی کی طرف سے عطاء ہوتی ہیں ان عطاؤں میں سے بڑی عطاء مقام نبوت ہے کہ اللہ کسی کو اپنا نائب چن لے۔

ان میں بھی مراتب کا فرق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ:

تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض منھم من کلّم اللہ ورفع بعضھم درجٰت o

ترجمہ: یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی۔ (سورۃ البقرہ: آیت 203)

عدل اور مساوات میں فرق:

عدل اور مساوات میں فرق ہے ان کو مترادف المعنی والمفہوم سمجھنا غلط ہے۔

مساوات کہتے ہیں کسی چیز کو کماً و کیفاً برابر تقسیم کر دینا۔

منطقی اعتبار سے مساوات اور عدل میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔

ہوسکتا ہے کہ عدل اور مساوات جمع ہو جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی مسئلہ میں عدل تو ہو مساوات نہ ہو اور ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی مسئلہ میں مساوات تو ہو مگر عدل نہ ہو۔

مثال: عدل و مساوات جمع:

ایک آدمی کے دو ہی بیٹے تھے وہ فوت ہو گیا اس نے چار لاکھ روپے ترکہ چھوڑا تو یہ ترکہ بیٹوں میں دو دو لاکھ دے دیا جائے گا۔ یہ عدل بھی ہے مساوات بھی ہے۔

عدل ہو مساوات نہ ہو:

ایک آدمی فوت ہوا اس نے جائیداد میں 5 لاکھ روپے ترکہ چھوڑا اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ تو ان کے درمیان ترکہ یوں تقسیم ہوگا۔ ہر بیٹے کو دو لاکھ روپے اور بیٹی کو ایک لاکھ روپے دیں گے۔ یہ عدل تو ہے مگر مساوات نہیں ہے۔ یہ عین عدل اس لئے کہ اس کا حصہ اتنا ہی مقرر تھا لہٰذا اس کو دے دیا گیا۔

مساوات ہو عدل نہ ہو:

اگر ایک آدمی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوں اور وہ ترکہ میں دس لاکھ روپے چھوڑ کر مرا اس کے بعد اولاد میں سے ہر ایک کو دو دو لاکھ دے دیئے گئے۔ ہر بیٹے کے حصے

میں بھی دو لاکھ آیا اور بیٹی کو بھی دو لاکھ دے دیئے گئے یہ مساوات تو ہے مگر عدل نہیں ہے کیونکہ عدل یہ ہے کہ جوجسکا حصہ مقرر ہے وہ اس کو دے دیا جائے۔ اسلام عدل کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

بنیادی مسئلہ حق دینے اور لینے کا نہیں ہے بلکہ مغرب اور اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ حق مقرر کون کرے گا مسلمانوں کے نزدیک تو اللہ اور رسول بتائیں کہ کس کا کیا حق ہے پھر جس کا جو حق بن جائے گا اس کو دیں گے بلا کسی نسلی امتیاز کے بلا کسی دباؤ کے۔ بلا کسی امیر وغریب کے فرق کے۔اس کو مقرر شدہ حق دیا جائے گا۔

مگر مغربی فلسفہ میں حق کی تعیین وحی سے نہیں بلکہ انسان خود اپنی عقل سے کرے گا کس کو کیا حق دینا ہے جب حقوق کی تعیین اپنی ناقص عقل سے کرتے ہیں تو حقوق کی تقسیم کے اعتبار سے تمام انسانوں کو برابر کا حق دار ٹھہراتے ہیں مسلم' کافر' مرد وعورت غرض تمام انسانوں کے حقوق اور ذمہ داریاں برابر قرار دیتے ہیں اس سے مساوات تو ہو جاتی ہے۔ مگر ہر ایک کی صلاحیتیں مختلف ہونے کی وجہ سے عدل نہیں ہوتا۔

انصاف وامن عدل میں ہے نہ کہ مساوات میں

ہر حیثیت سے برابری ومساوات انصاف کا منشأ نہیں ہے بلکہ عدل کرنا انصاف کا منشأ ہے یعنی جس کا جو حق مقرر کر دیا گیا اس کو بلا تفریق دے دینا انصاف ہے۔

ایک فرضی قصہ سے بات سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی گاؤں میں رہتا تھا اتفاق سے اسے کسی دور کے علاقے میں جانے کی ضرورت پیش آ گئی اس کے پاس دو اونٹ ایک دودھ دینے والی اونٹنی اور تین بکریاں اور ایک مرغی تھی اس نے اپنے ملازم کو سمجھایا کہ کمرے میں سے چارا لا کر رکھ دیا ہے۔ ایک ایک گٹھر اونٹوں کو اور ڈیڑھ گٹھر دودھ دینے والی اونٹنی کو ڈال دینا اور جو باقی آدھا بچے گا وہ ان تین بکریوں میں ڈال دینا اور یہ روٹیاں مرغی کو ڈالتے رہنا۔ مالک نے جاتے وقت ملازم سے بڑی تاکید کے ساتھ کہا کہ ان جانوروں کا خیال کرنا اور ان میں انصاف کرنا۔ کمی زیادتی نہ کرنا۔ اب اس ملازم کے پاس دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ جتنا مالک نے ہر ایک

کا حصہ مقرر کیا ہے اور بڑی تاکید کے ساتھ اس پر عمل کرنے کو کہا ہے۔ اگر یہ ملازم ایسے ہی کرتا ہے تو یہ منصف شمار کیا جائے گا اگر اس نے مساوات والے قانون پر عمل کیا کہ سب اونٹ برابر ہیں لہٰذا دودھ والی اونٹنی کو نصف گٹھر زیادہ نہ دوں گا اور بکریوں میں بھی برابری ہے لہٰذا سب کو مساوی طور پر چارہ تقسیم کیا جائے گا۔ تو یہ ملازم منصف شمار نہ ہوگا............

انصاف یہی ہے کہ جس کا جو حق بنے اس کو دے دیا جائے بغیر کسی نسل اور رنگ کے فرق کے اور یہ ہرگز انصاف نہ ہوگا کہ کافر و مسلم ماتحت و بالا مرد و عورت باوجودیکہ ذمہ داریاں ان کی مختلف ہیں مگر حقوق میں سب کے سب برابر ہوں۔

اسلامی نظریہ مساوات

عدل کی جزوی شکل کا ظہور بہت دفعہ مساوات کے ساتھ ہوتا ہے چونکہ اسلام عدل والا مذہب ہے اس لیے بہت سے مسائل میں مساوات کا بھی حامی ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب و ملل میں یہ امتیاز فقط اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ہر کام میں نہایت اعتدال قائم رکھا ہے اس کا ہر قانون اور قانون کی ہر جزئی اسی کلیہ کے ماتحت ہے اور اسی لئے قرآن نے خاص طور پر اس امت کو امت وسط کا لقب دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وکذالک جعلنا کم امۃ وَسَطاً لتکُونوا اشھَدَاء علی الناسِ

ترجمہ: اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل جماعت بنایا تاکہ لوگوں کے مقابلے میں تم گواہ بنو۔

اسلام سے پہلے تمام قوموں کے دستور العمل ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے جابرانہ اصول پر مبنی تھے۔ قوی ضعیف کو کھا جاتا ذات پات کی اونچ نیچ نے انسانوں کے طبقات میں اس قدر بعد قائم کر دیا تھا کہ دیکھنے والا یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ ایک آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔ رنگ وروپ کالے گورے کے امتیاز نے جدا سکہ جمایا تھا اونچے نسب کا آدمی اپنے سے نیچے والے کو انسانیت کا برتاؤ کرنے کا اہل نہ سمجھتا تھا حتیٰ کہ جرائم کی سزا بھی شخصیتوں کو دیکھ دیکھ کر

جاری کی جاتی تھی بڑے درجے کے لوگ سزاؤں سے مستثنیٰ کر لیے جاتے اور تعزیرات کی مشق کیلئے غرباء وضعفاء کے بدن وقف تھے لیکن جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو ان ظلمتوں کے بادل چھٹ گئے جناب نبی اکرم ﷺ نے رنگ نسل ذات پات کی فضیلت کو ختم کر دیا اور فرمایا کہ تقویٰ کی بنیاد پر مراتب حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ باقی سب انسان برابر ہیں کسی کو بھی کسی دوسرے پر نسلی یا لسانی فوقیت نہیں ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ:

ایها الناس ربکم واحد لافضل لعربی علی عجمی ولالعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولالا سود علی احمر الا بالتقوی' ان اکرمکم عندالله اتقاکم

ترجمہ: اے لوگو تمہارا رب ایک ہے کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر یا گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوی کے ساتھ بے شک تم میں سے زیادہ متقی اللہ کے نزدیک زیادہ مکرم ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ:

ایها الناس ربکم واحد ان اباکم واحد کلّکم لآدم وآدم من تراب اکرمکم عندالله اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقوی الا هل بلغت؟ اللهم فاشهد

(البیان والتبیین' ج2' ص29 مکتبہ الاستقامہ مصر)

ترجمہ: اے لوگو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم تمام آدم علیہ السلام میں سے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔ تم میں سے معزز ترین اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے' کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں مگر تقویٰ کی وجہ سے کیا میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ گواہ رہنا۔

امت مسلمہ میں انہی تعلیمات نبوی کا اثر تھا کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہمارے اکابر علیھم الف الف رحمۃ کی کتب میں اگر کوئی تحریر ہے بھی کہ اسلام میں مساوات ہے اسلام مساوات پر زور دیتا ہے تو ان کی مراد مساوات سے عدل ہی ہوتا ہے۔ مغربی فکر وفلسفہ میں جو مساوات کا معنی ہے وہ مراد نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اقتباس:

مساوات کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے جو قانونِ عدل قرآن وحدیث کے اندر نازل فرمادیا ہے اور جو حدود قائم کردی ہیں اس قانون کی تنفیذ میں کسی سے رعایت نہ کی جائے اس میں ایک بڑے سے بڑا بادشاہ اور ادنیٰ سے ادنیٰ فقیر برابر ہوں۔ نفاذ قانون میں ذات پات کی اونچ نیچ اور رنگ روپ کا امتیاز درمیان میں نہ آئے۔ نہ یہ کہ قانون ہی ایسا مہمل بنایا جائے کہ گدھا اور گھوڑا برابر ہو جائیں مرد وعورت اور حاکم ومحکوم کے حق میں کوئی امتیاز نہ ہو الغرض جو مساوات عقلاً محمود ہے وہ یہ ہے کہ اجراء قانون کی رو سے کسی خاص معاملے کا جو حق دار ہے اس میں کسی کی رعایت ومروت یا خوف وطمع سے کمی زیادتی نہ کی جائے نہ یہ کہ خود قانون کی دفعات ہی ہر شخص کے لیے ہر معاملے میں برابر ہوں (جواھر الفقہ ''مفتی شفیع عثمانی'' ج 2، ص 78 مکتبہ دارالعلوم کراچی)

علماء امت مساوات کو اہمیت کی نگاہ سے اگر دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب ان کی دیگر عبارات سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ کس طرح کی مساوات کے حامی تھے۔ وہ مغربی فکر وتصور سے مترشح مساوات کے ہرگز حامی نہ تھے بلکہ اس طرح کی مساوات ان کے نزدیک دہریت

اور الحاد ہے بلکہ اسلام کے نام پر تحریف ہے کوئی بھی اہل علم سلف صالحین میں سے ایسا نہیں ہے جو مرد و زن میں مساوات کلی کا قائل ہو اور ان کو بھی مردوں کے دوش بدوش بے پردہ تجارت کے بازاروں میں پھرنے کی اجازت دیتا ہو یا عورت اور مرد کی میراث میں مساوات کا قائل ہو ان کے نزدیک عورت کی دیت بھی مرد کی دیت سے نصف ہوتی تھی اس لیے کہ اسلام کے احکام کلی طور پر ہم وحی سے اخذ کریں گے عقل اصل ماخذ قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل کرنے کا وسیلہ وذریعہ تو بن سکتی ہے مگر عقل کو اس قدر اہم سمجھنا کہ وحی کے احکام ہوتے ہوئے محض عقل کی طرف التفات کرنا یہ جہالت و بے دینی کے ساتھ ساتھ حماقت بھی ہے۔ مغرب نے مساوات کا معنی عقل سے گھڑا ہے اور اس کو بطور اصول کے قبول کرتا ہے اب ہر مسئلہ شرعیہ اسی اصول سے جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے (مساوات) کے اس اصول سے اسلامی شریعت کے حدودِ اربع ناپے جاتے ہیں اور اسی بنیاد پر مختلف قسم کے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں اور پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں مساوات نہیں ہے۔ سادہ لوح مسلمان مساوات سے عدل مراد لیتے ہیں اور اسلام کی حمایت کر کے دوسروں کو اسلام کی حقانیت پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اعتراضات اس وقت اٹھائے گئے ہوتے ہیں جبکہ مساوات کا وہ معنی مراد ہو جو اہل مغرب کے ہاں مسلّم ہے۔

تصورِ مغرب میں مساوات

مغربی فکر و فلسفہ میں مساوات کا تصور اور معنی یہ ہے کہ تمام انسانوں کو عقل ودیعت کی گئی ہے عقل کی بارہ کیٹگریز ہر انسان میں کام کرتی ہیں لہٰذا جب تمام انسان عقلی طور پر برابر ہیں تو احکام و مسائل میں بھی برابر ہونے چاہئیں مرد و عورت، کافر، مسلم، رسول، امتی، باپ، بیٹا، ماں بیٹی، دادی، پوتی، الغرض تمام رشتے ناطے برابر ہیں لہٰذا باپ اپنے بیٹے کو ڈانٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ بھی اس باپ کی طرح آزاد ہے اور اس کے مساوی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح عورت مرد کے برابر ہے اس کے حقوق مرد کے حقوق کے مساوی ہیں طلاق کا حق جس طرح مرد کو ہے اسی طرح عورت کو بھی ہونا چاہیے۔ وراثت میں عورت اور مرد کا حصہ برابر ہوگا۔

مغربیت سے جو افراد متاثر ہو کر یا اپنی کم علمی کی وجہ سے بغیر تحقیق کے ان کا اصول مساوات قبول کر لیتے ہیں تو پھر اسلام میں کھینچ تان کر کے ان جیسی مساوات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں فلاں مسئلہ میں عورت مرد کے برابر ہے لہٰذا اسلام بھی مساوات کا درس دیتا ہے۔ حالانکہ مساوات کلی کو بطور قانون بنا کر اسلام میں تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام اور مغرب کی مساوات میں بنیادی فرق

مساوات کی بحث میں بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ مساوات لوگوں کے درمیان کس بنیاد پر ہو گی مغرب مساوات میں بنیاد کس چیز کو بناتا ہے اور اسلام اگر مساوات کا حامی ہے تو کس بنیاد پر؟ اگر بنیاد میں ہی فرق آ جائے تو یہ بالکل جداگانہ تصور سمجھے جائیں گے۔

مغربی فکر میں مساوات کی بنیاد یہ ہے کہ انسان سب عقل رکھتے ہیں لہٰذا مرد و عورت باپ بیٹا، دادا پوتا، رسول اور امتی کافر و مسلم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے سب برابر ہیں تمام انسانوں میں مساوات کلی ہے۔

اسلام میں مساوات کی بنیاد عقل نہیں ہے بلکہ اسلام میں مساوات جن مسائل میں ہے وہ اس لیے کہ اللہ نے جو قانون بنایا ہے مسلمان اس کے پابند ہیں مثلاً بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کو جائیداد میں برابر حصہ ملے گا وہ اس وجہ سے کہ اللہ نے مسلمان کو جس قانون پر عمل کرنے کا پابند کیا ہے وہ ایسے ہی ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مساوات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی جو اللہ جل شانہ نے مقرر کیا ہے اس کو نافذ کرنے میں مساوات ہو گی اللہ نے جس بندے کے بارے میں جو حکم نازل کر دیا اب ہم اس پر نافذ کریں گے۔ چاہے امیر ہو یا غریب ہو بادشاہ وقت ہو یا گداگر ہو سب پر نفاذ ہو گا کسی مرد و عورت کی رعایت نہیں کی جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نفاذ قانون میں مساوات کا مدعی ہے کہ ہم قانون نافذ کرنے میں برابری کرتے ہیں اور مغرب قانون وضع کرنے میں، قانون بنانے میں مساوات کا مدعی ہے۔ ہم ان کا معنی اسلام میں ضم نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمان کے پاس قانون اللہ کی طرف

سے متعین ہے اور یہ حضرات جمہوریت سے جو فیصلہ طے ہو جائے اسے قانون بنا لیتے ہیں۔

بہرحال یہ قانون سازی میں مساوات کے قائل ہیں کہ مرد و عورت کو مساوی حقوق ملنے چاہئیں طلاق، نکاح وغیرہ کا حق برابر ہونا چاہیے۔

مساوات کی اسلام کاری

بعض حضرت اسلام سے بھی مساوات کا وہ معنی ثابت کرتے ہیں جو اہل مغرب مراد لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مرد و عورت میں مساوات ثابت ہو جائے اور ایسے جزوی مسائل بیان کر کے لوگوں کے ذہن ہموار کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام بھی مساوات کلی کا درس دیتا ہے۔ گویا انہوں نے مساوات کو اس قدر مسلّم اصول تسلیم کیا ہوا ہے کہ اس پر نقد وارد کرنے کی کوئی جرأت نہیں کرتا بس یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کوئی جزوی مثال ملے تو اس سے یہ ثابت کر دیں کہ ہاں اسلام نے بھی مرد و عورت کو برابر کے حقوق دیئے ہیں اور انسانوں میں مساوات ہے۔ انسانوں میں مساوات کو ثابت کرنے کیلئے محمد ثانی صاحب (محسن انسانیت اور انسانی حقوق) کتاب میں لکھتے ہیں اور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وما کان لمومن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امراً ان یکون لهم الخیرة من امرهم

ترجمہ: کسی ایمان والے مرد اور عورت کیلئے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں پھر ان کیلئے کوئی اختیار باقی ہو۔

فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید کیلئے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش کو نکاح کا پیغام دیا تھا حضرت زینب کو اپنے نسلی اور خاندانی فخر کے باوجود اس حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا اس طرح نسلی امتیاز کے بت کو توڑ کر انسانی مساوات کا بہترین عملی نمونہ کاشانہ نبوت سے سماج کے سامنے پیش کیا۔ (محسن انسانیت اور انسانی حقوق: ص 13)

اوراس عبارت پرعنوان قائم کرتے ہیں' انسانی مساوات کا حق اوراس سے اگلے عنوان میں حضرت صاحب فرماتے ہیں اجروثواب میں مردوزن کی برابری کا حق

ارشاد باری تعالیٰ:

ان المسلمین والمسلمٰت والمومنین والمؤمنٰت........... اَعَدّ اللہ لھم مغفرۃ واجراً عظیما (سورۃ الاحزاب۔آیت نمبر35)

یہ اسلام کی وہ بنیادی قدریں ہیں جنہیں ایک فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے ان قدروں کے لحاظ سے مرد وعورت کے درمیان دائرہ عمل کا فرق تو ضرور ہے مگر اجر وثواب میں برابر ہیں ان دونوں آیات سے مصنف صاحب نے ثابت کیا ہے کہ عورتوں اور مردوں میں مساوات ہے۔

ان آیات کو اس انداز سے بیان کرنا اور ایسے سیاق میں لے کر آنا کہ دیکھنے والے کو یہ باور کروایا جائے کہ اس میں انسانی مساوات کلی ہے مردعورت حقوق میں برابر ہیں ان کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ حقوق کی یکسانیت کا اسلام قائل نہیں ہے۔ظاہر سی بات ہے جب ذمہ داریاں علیحدہ علیحدہ ہوں گی تو لامحالہ حقوق بھی علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔مردوعورت کے معاملات میں یکسانیت کا مطالبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو برابر حقوق اور برابر ذمہ داریاں دو' حالانکہ یہ صنف نازک ان ذمہ داریوں کو آسانی سے نبھا نہیں سکتی' لامحالہ خالق لم یزل کی تقسیم ہی بہترین تقسیم ہے حقوق اور ذمہ داریوں کو ہر جنس (مرد،عورت) پر جس طرح احسن انداز سے اسلام نے تقسیم کیا ہے کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

نظریہ مساوات (مغرب) سے جنم لینے والے مسائل

مغربی تصور میں مساوات کا جو معنی ہے اس کی رو سے بہت سی معاشرتی خرابیاں رونما ہوئی ہیں جس نے معاشرے کا سکون وچین برباد کر دیا ہے اور خاندانی نظام کو انتہائی درجہ کا نقصان پہنچایا ہے خاص طور پر مردوعورت کے حقوق میں مساوات کے نظریے سے کئی اسلامی شقوں میں بھی نقب زنی کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان برائیوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

1)۔ بے حیائی کو فروغ ملا ہے۔ جب عورتوں کو مساوی طور پر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی اور مارکیٹ آنے کی کھلے عام اجازت ملی تو اخلاقی طور پر بے حد تباہی آئی۔نو جوان نسل عریانی وفحاشی کا شکار ہوگئی۔

2)۔ بے ادبی کی فضاء قائم ہوئی حفظ مراتب ختم ہو گئے یعنی جب باپ بیٹا دادا برابر سمجھے جائیں اور باپ بیٹے کو کچھ نہیں کہہ سکتا اگر کچھ کہہ دے تو باپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے کیلئے تیار ہو جائے لہٰذا ادب کی فضاء ختم ہوگئی۔

3)۔ جب اس اصول کے تحت اسلامی جزئیات کو دیکھا جانے لگا تو دین میں شکوک و شبہات کا دروازہ کھلا' ہر جگہ شور ہونے لگا کہ عورتوں کو بھی طلاق دینے کا حق دیا جائے۔

4)۔ مرد اور عورت کی دیت میں برابری ہونی چاہیے۔اس کے مطالبے شروع ہوئے اور تاویلات کر کے اسلام کی غلط تشریحات کی گئیں۔

5)۔ اشکال اٹھائے جانے لگے کہ بچی اور بچے کا حق میراث میں برابر ہونا چاہیے۔غرض اس پیمانے کو لیکر دین کے مسائل میں قطع و برید شروع کر دی گئی۔

اس نظریہ مساواتِ مرد و زن سے ذاتی طور پر عورت کو خسارہ ہوا ہے۔جو چیز حقوق باور کروا کر انکو دی گئی درحقیقت وہ اس عورت پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھانا ہے۔

پہلے عورت کے ذمہ صرف یہ کام ہوتا تھا کہ گھر کی نگاہ داشت کرے اور بچوں کی دیکھ بھال' کھانا وغیرہ بنانا' لیکن جب سے نعرہ آزادی میں عورتوں کی شرکت ہوئی اور ملازمتوں میں عورتوں کی بھرتی ہوئی تو عورتوں کی ذمہ داریاں دوگنی ہوگئیں اب وہ دفتر کے بھی کام کرتی ہیں اور گھر کا بھی سارا کام ان کو کرنا پڑتا ہے بچوں کی ضروریات کا لحاظ ان کو رکھنا پڑتا ہے اس حسین عنوان سے عورتوں کو بے وقوف بنایا گیا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے کچھ مالی مفاد تو حاصل کر لیا مگر خاندانی نظام سے محروم ہو گئے۔سابق روسی صدر گورباچوف نے کتاب لکھی جس میں اس نے برملا اعتراف کیا بلکہ ایک مستقل باب قائم کیا (Status of women) اس میں اس نے دوٹوک الفاظ میں یہ بات لکھی ہے۔

اقتباس:

''ہماری مغربی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اسے گھر سے باہر نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کیے اور پیداوار میں اضافہ ہوا اس لئے کہ مرد وزن کام کر رہے ہیں لیکن پیداوار کی زیادتی کے باوجود نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا او راس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجہ میں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں وہ نقصانات ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پروڈکشن کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے لہٰذا میں اپنے ملک میں پروسٹر نیکا کے نام سے ایک تحریک شروع کر رہا ہوں اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عورتیں جو گھر سے باہر نکل چکی ہیں انہیں واپس گھر میں کیسے لایا جائے؟ ایسے طریقے سوچنے پڑیں گے ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو رہا ہے اس طرح پوری قوم تباہ ہو جائے گی''۔ (ماہنامہ قومی گزٹ کراچی، مارچ 1996ء)

اپنی اس غلطی کا احساس ان لوگوں کو اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر چکا، اب ان کی تمناء ہے کہ کسی طرح عورت اپنی گھریلو زندگی اختیار کر لے اسی میں ان کی بقاء ہے مگر اب عورت یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

حقوق نسواں ایک فریب

درحقیقت حقوق نسواں مرد وزن مساوات کا نعرہ ایک فریب تھا۔ عورتوں کو بیوقوف بنایا گیا تھا۔ اس فریب کو جاننے کیلئے اس نعرے کے آغاز وارتقاء پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مغرب میں مساوات مرد وزن کا نظریہ سب سے پہلے برطانیہ کے ایک دہری فلسفی جو کہ کالم وناول نگار بھی تھا اس کی بیوی دولسٹوں کرافٹ نے اپنی کتاب ''حقوق نسواں'' (Vindication of the rights of women) میں پیش کیا کہ عورتوں کی وہی حیثیت تسلیم کرنی چاہیے جو مرد کی حیثیت ہے اس کے الفاظ کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

تعلیم روزگار اور سیاست کے میدان میں عورتوں کی وہی حیثیت تسلیم کی جائے جو مردوں کو حاصل ہے اور دونوں صنفوں کیلئے اخلاقی معیار بھی یکساں ہونا چاہیے۔

اس سے آگے چل کر جان سٹورٹ مل اور اس کے ہم خیال افراد نے مساوات مرد و زن کے حق میں دلائل فراہم کرنے شروع کیے یہ نظریہ ایک ترقی پسندانہ نعرے کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔

اس نعرے کو اختیار کرنا چونکہ اہل مغرب کی مجبوری تھی اس لیے حکومتی سطح پر اس نعرے کو عام کیا گیا تا کہ عورتیں اس آزادی اور مساوات کے نعرے سے متاثر ہو کر گھر کے حصارے سے باہر آئیں اور مارکیٹ کا کام کریں کیونکہ اہل مغرب جنگ عظیم اول اور دوم میں بے شمار مرد فوجیوں کی لاشیں دفن کر چکے تھے۔ افرادی قوت بہت کمزور ہو چکی تھی مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں بہت کم تھی جو مرد جنگ سے جان بچانے میں کامیاب بھی ہو گئے تو وہ کئی زخموں میں مبتلا تھے ایک صحت مند انسان کی طرح مارکیٹ کو چلانے سے قاصر تھے تو اس افرادی قوت کو مغرب نے عورتوں سے پورا کیا' ان کو گھروں سے لا کر دوکان پر کھڑا کر دیا' اسٹیشن پر ٹکٹیں کاٹنے کیلئے بٹھا دیا' بینک میں حساب کتاب اس کے ذمہ لگا دیا۔

الغرض مردوں کی کمی کو عورتوں سے پورا کیا اور اپنے اس مقصد کے حصول کیلئے عورتوں کو ذہناً تیار کیا آزادی کی ترغیب دی مساوات کا احساس دلایا تا کہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں اس سارے کارنامے میں حکومتیں سرپرستی کر رہی تھی اسی وجہ سے تو روسی صدر کہہ رہا ہے کہ ہم نے عورت کو گھر سے نکال کر معاشی طور پر تو اپنے کو مستحکم بنالیا مگر خاندانی نظام ہمارا تباہ ہو گیا اس وجہ سے تمام تر سرمائے کے باوجود ہماری قوم خسارے کی طرف جا رہی ہے۔ غرضیکہ سرمائے کے حصول کیلئے عورت کو استعمال کیا گیا۔ عورتیں بے گھر ہوئیں معاشرے میں اپنی قدر گنوائی' گھر کا سکون ختم کیا' یہ سب کچھ عورتوں کے ساتھ ہوا اور ہو رہا ہے مگر اس کا فائدہ حکومت نے اٹھایا۔

ترقی (Devolpmant)

آزادی، مساوات کے علاوہ ایک تیسرا اصول (ترقی) ہے جس کیلئے اہل مغرب کسی امر کے صحیح و سقم کا اندازہ لگائیں گے آزادی، مساوات اور ترقی کو اصول کی بجائے عقیدے کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے ہر کام میں وہ دیکھیں گے کہ ان تین میں سے کسی پر زد تو نہیں آرہی اگر آزادی پر زد ہے تو وہ کام بھی ان کے نزدیک صحیح نہیں اگر مساوات کے خلاف ہے تو بھی صحیح نہیں اور اگر کوئی کام ایسا ہے جس سے ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو وہ بھی قابل برداشت نہیں ہے۔

ان کے تمام قوانین اور اس کی تمام شقیں انہی بنیادوں کو دیکھ کر تیار کی جاتی ہیں، ترقی بھی ایک قدر ہے (Development) ترقی درحقیقت آزادی کی ہی ایک مادی شکل ہے آزادی کے حصول اور علاقہِ الوہیت میں اپنی ہر چاہت پر عمل کرنے کی صلاحیت زر سے ہی ممکن ہے گویا کہ آزادی کا ایک مادی وجود سرمایہ ہے اسی کے حصول میں ترقی کرنا (Devolpment) کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ آزادی کا مطلب ہے بغیر کسی حدود وقیود کے جو چاہوں چاہ کر کر گزروں ہواؤں میں اڑنے کی تمنا ہے یا گرمی کو سردی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے یا یہ سمندر کی تہوں تک رسائی حاصل کرنے کا خواہش مند ہے یا ستاروں اور سیاروں پر کمند ڈالنا چاہتا ہے یہ سب انسان کی خواہشات ہوسکتی ہیں غرضیکہ کائنات کا ہر قانون فطرت جو بندے کی طبیعت کے ناموافق ہے اس کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اس دنیا کے ماحول کو مسخ کر کے ایک ایسا جہاں تعمیر کرنے کا خواہش مند ہے جو اس کی طبیعت کے موافق ہو گویا کہ اس دنیا میں جنت کے حصول کا خواہش مند ہے۔ ان خواہشات کو پورا کرنے کیلئے 17 صدی کے بعد کوشش شروع ہوگئی۔

جو سائنس ایک زمانے تک اس جہاں کے مشاہدے میں مصروف تھی مخلوق کے مشاہدے سے خالق کو تلاش کرنے کی جستجو میں مصروف تھی۔ دنیا اور آسمان کے عجائبات دیکھ کر اس کی اصل حقیقت کو دیکھنے میں محو تھی 17 صدی کے بعد اس کا محاذ

بدل گیا موجودہ سوشل سائنس کا محاذ یہ ہے کہ قانون فطرت کو مسخ کر کے اپنے تابع بنایا جائے اور ایسی دنیا تخلیق کی جائے جو انسانوں کی چاہت کے مطابق ہو۔

سائنس سے یہ جہاز ہواؤں میں اُڑنے کے لیے تو بن گئے' سمندروں کے فاصلے بحری جہاز اور تیز رفتار کشتیوں نے سمیٹ دیئے ایک براعظم کی خبر ہواؤں کے ذریعے دوسرے براعظم میں پہنچانے پر انسان قادر تو ہو گیا' مہینوں کے سفر انسان دنوں میں طے کرنے لگا پہاڑوں کی بلندیاں سمندر کی وسعتیں اس کے سامنے ہیچ ہو گئیں مگر ان سب چیزوں پر آج بھی وہی آدمی قدرت رکھے گا جس کے پاس سرمایہ ہے یعنی اپنی خواہشات کی تکمیل مال و دولت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور مکمل آزادی کے حصول کی زر و دولت کے سوا کوئی اور شکل نہیں ہے تو معلوم ہوا انسان کی آزادی کا ترقی کے ساتھ گہرا ربط ہے۔

لہٰذا جس کے پاس جس قدر دولت ہو گی وہ آدمی اس قدر آزاد سمجھا جائے گا اور مغربی فلسفہ میں یہ طے ہو چکا ہے کہ انسانیت کا کمال اور انسانیت کی معراج یہ ہے کہ وہ مکمل آزاد ہو اور آزادی موقوف ہوئی سرمایہ پر لامحالہ طلبِ سرمایہ ہی انسان کا اعلیٰ ترین مقصد قرار پایا۔

یہ نظری تبدیلی سترہویں صدی میں رونما ہوئی اور مغرب میں بڑی تیزی سے پھیل گئی اور پھر آہستہ آہستہ مشرقی ممالک میں بھی پھیل گئی۔ اسی نظریے کا اثر ہے کہ آج دنیا بھر میں صدر اور وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ وزیر تجارت اور معاشیات کو بھی خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ مفتی اعظم کو آج وہ اہمیت حاصل نہیں جیسا کہ 17 صدی سے قبل عیسائیت میں پوپ کو حاصل تھی اور اوائل اسلام میں مذہبی طبقہ کو حاصل تھی۔ کیونکہ اس وقت سب کا مطمع نظر دنیا کے علاوہ کوئی اور تصور بھی تھا کہ آخرت میں کیا کریں گے اس کے متعلق رہنمائی اپنے مذہبی گروہوں سے لیتے تھے۔ موجودہ سائنس کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ ہر موجود پر شک کرو پھر تحقیق کرو اور کوئی بھی تحقیق آخری نہیں ہے بلکہ اس آخری میں بھی شک ہے ہو سکتا ہے کہ آئندہ زمانے میں اس سے بھی بہتر نتیجہ سامنے آ جائے۔

علم ہے ہی وہ جس پر شک کیا جا سکے بقول انکے اگر کوئی ایسا علم ہے جس پر شک

کی گنجائش نہیں تو وہ عقیدہ ہے علم نہیں ہے۔ سائنس کے اس علم کی تعریف کی رو سے نت نئے نظریات سامنے آتے ہیں اور پچھلے نظریے ختم ہو جاتے ہیں۔

غرضیکہ سائنس دانوں' معاشیات کے ماہروں کو جو اہمیت حاصل ہے کسی مذہبی منصب کو حاصل نہیں کیونکہ معیشت دان تو ترقی کا طریقہ بتائے گا جس سے تجارت کو فروغ ملے گا اور روپیہ حاصل ہو گا جو کہ آزادی کی مادی شکل ہے جبکہ اس کے مقابلے میں مذہبی تعلیم کے ماہر کی قدر نہیں کیونکہ وہ ایسی چیز کا دعوے دار ہے جس کا ترقی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے بلکہ دنیا سے بے رغبتی کی دعوت دیتے ہیں۔

الباب الخامس

حقوق انسانی کا عالمی منشور

(ہیومن رائیٹس چارٹر)

آزادی مساوات اور ترقی کو بنیادی اصول بنا کر جو قانون بنایا گیا ہے اس کا نام ہے انسانی حقوق کا عالمی منشور بالفاظ دیگر اس کو اہل مغرب کی شریعت بھی کہا جا سکتا ہے اور یوں بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اس کو ماننے والا زندہ رہنے کا حق دار ہے اور جو اس قانون کو تسلیم نہیں کرتا اس پر آتش و آہن کی برسات کرنا اور آئے دن پابندیاں لگانا مغربی تہذیب کے علم بردار اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہیومن رائیٹس کا منشور بیان کرنے سے قبل ہیومن کے فلسفہ سے واقفیت ضروری ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حقوق کس قسم کے انسان کیلئے ہیں ہیومن ازم کا فلسفہ:

Humanism is any philosophy
Which recogizes the value
Or dignity ofn man any
Makes him r somehow
Takes huthe measure of

All things oman nature is
Limits of its interest
As its theme

ہیومن ازم ہر اس فلسفے کو کہتے ہیں جو انسانی قدر یا عزت کو تسلیم کرے اور انسان کو تمام چیزوں کا میزان قرار دے یا جو صرف انسانی طبیعت کو اپنی فکر کی حد یا دائرہ کی حیثیت سے لے۔ انسانی حقوق کا چارٹر جاننے سے قبل مغرب میں انسان کا تصور اور انسان کی حیثیت جاننا ضروری ہے۔ پھر اسی حیثیت کو مدنظر رکھ کر اس کے حقوق طے ہوں گے۔

اس فلسفہ وفکر کا مطلب ہے کہ انسانی عقل اور علم چیزوں کی حقیقت جاننے کیلئے' اچھائی اور برائی کی تعیین کرنے کے لئے کافی ہیں۔

فلسفہ الوہیت انسانی

مرکز کائنات اللہ نہیں انسان:

ہیومن ازم' سوشل ازم' عقلیت' ماڈرن ازم' جدیدیت کے اس فلسفے کے نتیجے میں کائنات میں مرکزی ہستی اللہ تعالیٰ کی بجائے انسان کو ٹھہرایا گیا اور اللہ تعالیٰ کے اختیارات انسان کو منتقل کر دیئے گئے اس طرح فلسفے کی اصطلاح میں کائنات کے بارے میں انسانی فکر نے God procentric approach (رضاء خداوندی) کی بجائے Arthroprocetntric aproach نفس پرستی کو اختیار کر لیا اور کائنات میں مرکزی مقام خدا کی بجائے انسان کو دے دیا گیا اور سمجھا گیا کہ یہی مقصود کائنات ہے لہٰذا خیر وشر' طاقت اور فیصلہ کے اعتبار سے تمام حقوق' تمام اختیارات انسان کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔

انسان جب اس فلسفے کے تحت خدائی اور الوہیت کی جگہ پر بیٹھ گیا تو اب سب آپس میں برابر ہیں' باپ بیٹا برابر ہیں پیر مرید رسول اور امتی برابر ہیں اس لیے کہ سب الوہیت کی طاقت میں برابر کے شریک ہیں۔ اس فلسفہ کی رو سے اعلیٰ اتھارٹی اس بندے کے علاوہ کوئی اور نہیں اور یہ کسی کے آگے جواب وہ نہیں' اس لیے آزاد و مطلق العنان ہے' کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اسی بناء پر حق کیا ہے خیر کیا ہے یہ خود بتائے گا' اس فلسفے کا عروج انسانیت پرستی کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

اسی فلسفہ ہیومن سے ہیومن رائیٹس چارٹر تشکیل پایا ہے اس عالمی منشور (ہیومن رائیٹس) کے منشور میں کیا کیا کفر دالحاد پرویا گیا ہے آئندہ فصلوں میں وضاحت کی جائے گی۔

حقوق العباد اور حقوق انسانی میں فرق:

انسانی حقوق کو حقوق العباد کے مترادف خیال کیا جاتا ہے کہ حقوق العباد ہی حقوق انسانیت ہیں پھر اس کے اثبات میں قرآن وسنت سے دلائل کا انبار لگایا جاتا ہے اولاً حقوق انسانیت اور حقوق العباد کی اصطلاح میں فرق سمجھ لینا چاہیے۔

عبد اور انسان کا فرق:

عبد اور انسان میں بنیادی نوعیت کا فرق ہے عبدیت خدا کے وجود کا اقرار ہے اور انسانیت اپنے وجود کو حقیقت تسلیم کرنے کا اظہار ہے۔(Human Rights) اپنے کو خدا قرار دینے کا فلسفہ ہے۔

ہیومین رائیٹس کا مسودہ کس نے تیار کیا:

بنیادی حقوق کا منشور امریکی صدر روز ویلٹ کی اہلیہ ایلینا روز ویلٹ کے قلم سے تحریر ہوا تھا بنیادی حقوق کا منشور پہلے اخبارات میں چھاپا گیا اور آئینی مباحث پر زبردست بحث چھیڑی گئی اخبارات کے یہ مضامین فیڈرلسٹ پیپر کے نام سے مشہور ہوئے پھر انہی پیپروں سے قومی اسمبلی کے مقرر کردہ ممبروں نے انسانی حقوق کا چارٹر تیار کر کے اقوام متحدہ کو پیش کیا بنیادی حقوق کے بارے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ کہ انسانی حقوق میں دیے گئے عام حقوق مطلق ہیں اس میں کوئی If اور But نہیں ہے۔ اگر مگر کی تفصیل سے بالاتر ہے اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ یہ مغربی ایمانیات وعقائد کا حصہ ہے اس میں لفظاً اور عملاً کسی قسم کی کمی بیشی کی اجازت نہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ 1948ء

اقوام متحدہ نے فروری 1946ء میں 53 ارکان پر مشتمل انسانی حقوق کا کمیشن قائم

کیا اس کمیشن کی ذمہ داری یہ تھی کہ ایک ایسا مسودہ تیار کر کے جنرل اسمبلی کے سامنے پیش کرے جو تمام ارکان ممالک کی مذہبی روایات سیاسی نظریات قانونی نظام اقتصادی معاشرتی اور ثقافتی طور طریقوں میں تفاوت پائے جانے کے باوجود ان کے لئے قابل قبول ہو کمیشن نے انسانی حقوق کا مسودہ تیار کیا اور جنرل اسمبلی کو پیش کیا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں 10 دسمبر 1948ء کو منظور کیا گیا۔

اس کو انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ کے نام سے موسوم کیا گیا اور تمام رکن ممالک سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنی اقوام کو بلا امتیاز اس اعلامیہ اور منشور میں دیے گئے تمام معاشرتی سیاسی و معاشی حقوق دیں اور ان حقوق کی حفاظت حکومت کرے گی۔

یعنی مزید ایسے قانون اور پابندیاں معاشرے میں رائج کی جائیں جس کی وجہ سے ان کے یہ حقوق متاثر نہ ہوں اور ان شقوں میں دیئے گئے حقوق سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں یہ حقوق تمام انسانوں کیلئے بلا تفریق رنگ و نسل کے بلا تفریق مذہب و ملت کے اور بلا امتیاز مرد عورت کے یکساں ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ یہ انسانوں کا بنایا ہوا وہ قانون زندگی ہے جس میں گدھا گھوڑا، اونٹ، بکری حتیٰ کہ ہاتھی و چیونٹی سب برابر ہیں اس طرح کی برابری کہ تمام کو یکساں خوراک ملے گی سب برابر کے پنجروں میں رہیں گے مرد و عورت میں خلقتاً تفاوت کے باوجود ان کی ذمہ داریاں اور ان کے حقوق دونوں مساوی قرار دیئے گئے ہیں۔

ایک نظر انسانی حقوق کے عالمی منشور پر

(یہ عالمی منشور بعینہ نقل کیا جا رہا ہے)

تمہید:

چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت اور انسانوں کے مساوی اور نا قابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے، چونکہ انسانی حقوق سے لاپرواہی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جن سے

انسانیت کے ضمیر کو سخت صدمے پہنچے ہیں اور عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی بات کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ رہیں، چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آکر جبر اور استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوں، چونکہ ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے، چونکہ اقوام متحدہ کی ممبر قوموں نے اپنے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت اور قدر اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کردی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔

چونکہ ممبر ملکوں نے یہ عہد کرلیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے اشتراکِ عمل سے ساری دنیا میں اصولاً اور عملاً انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں گے اور کرائیں گے۔ چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لئے بہت اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں، لہٰذا جنرل اسمبلی اعلان کرتی ہے کہ

انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصولِ مقصد کا مشترک معیار ہوگا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور اُن قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں، منوانے کے لیے بتدریج کوشش کرسکے۔

دفعہ 1: تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں، انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیئے۔

دفعہ 2: ہر شخص تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں،

اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔

اس کے علاوہ جس علاقے یا ملک سے جو شخص تعلق رکھتا ہے اس کی سیاسی کیفیت دائرۂ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بنا پر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا چاہے وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا سیاسی اقتدار کے لحاظ سے کسی دوسری بندش کا پابند ہو۔

دفعہ 3: ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ 4: کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا، غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، ممنوع قرار دی جائے گی۔

دفعہ 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ، انسانیت سوز، یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ 6: ہر شخص کا حق ہے کہ ہر مقام پر قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے۔

دفعہ 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پالینے کے برابر حقدار ہیں اس اعلان کے خلاف جو تفریق کی جائے یا جس تفریق کے لئے ترغیب دی جائے، اس سے سب برابر کے بچاؤ کے حق دار ہیں۔

دفعہ 8: ہر شخص کو ان افعال کے خلاف جو اس دستور یا قانون میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق کو تلف کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے پر چارہ جوئی کرنے کا پورا حق ہے۔

دفعہ 9: کسی شخص کو محض حاکم کی مرضی پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ 10: ہر ایک شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کا تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے بارے میں مقدمہ کی سماعت آزاد اور غیر جانب دار عدالت کے کھلے اجلاس میں منصفانہ طریقے پر ہو۔

دفعہ 11: ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری کا الزام عائد کیا جائے، بے گناہ شمار کیے جانے

کا حق ہے' تاوقتیکہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہ دیا جا چکا ہو۔

کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگذاشت کی بنا پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا' کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائیگا۔

دفعہ 12: کسی شخص کی نجی زندگی' خانگی زندگی' گھر بار' خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے' ہر شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے۔

دفعہ 13: ہر شخص کا حق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو' اور اسی طرح اسے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ 13: ہر شخص کو ایذا رسانی سے دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے' اور پناہ مل جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوامِ متحدہ کے مقاصد اور اُصول کے خلاف ہیں۔

دفعہ 15: ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائیگا اور اس کو قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

دفعہ 16: بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے' مردوں اور عورتوں کو نکاح'

ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملہ میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔
نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضامندی سے ہوگا۔
خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حق دار ہے۔

دفعہ 17: ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔
کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ 18: ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر، تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل جل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہارِ رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے علم اور خیالات کی تلاش کرے۔ انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

دفعہ 20: ہر شخص کو پرُامن طریقے پر ملنے جُلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔
کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ 21: ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔
ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر حق ہے۔
عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔
یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مساوی کسی

دوسرے آزادانہ طریقِ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ 22: معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی کہ وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی' معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو حاصل کرے جو اس کی عزت اور شخصیت کے آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ 23: ہر شخص کو کام کاج' روزگار کے آزادانہ انتخابات کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول معاشرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لئے باعزت زندگی کا ضامن ہو' اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذرائع سے اضافہ کیا جا سکے۔

ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ 24: ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے علاوہ مقررہ وقفوں کے ساتھ تعطیلات بھی شامل ہیں۔

دفعہ 25: ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک' پوشاک' مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات شامل ہیں اور بے روزگاری' بیماری' معذوری' بیوگی' بڑھاپا یا ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضۂ قدرت سے باہر ہوں' کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

دفعہ 26: ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے' تعلیم مفت ہوگی' کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں' ابتدائی تعلیم جبری ہوگی' فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا

اور لیاقت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔
تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشو ونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی' وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت' رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔ والدین کو اس بات کے انتخاب کا اوّلین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائیگی۔

دفعہ 27: ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے' ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔
ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے اُن اخلاقی اور مادی مفاد کا بچاؤ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، علمی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے' حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ 28: ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حق دار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہوسکیں جو اس اعلان میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔

دفعہ 29: ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں۔ کیونکہ معاشرے میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشو ونما ممکن ہے۔ اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق' امن عامّہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لئے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔ یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصول کے خلاف عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔

دفعہ 30: اس کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک' گروہ یا شخص کو ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

ہیومین رائیٹس میں اسلام کے خلاف شقوں کا جائزہ

بنیادی طور پر انسانی حقوق کا لفظ ہی محل اشکال ہے تمام فقہاء متقدمین ومتأخرین کے ہاں ایسے تعلقات جو بندوں کے بندوں کے ساتھ ہوتے تھے اور ہر وہ حق جو بندوں کا بندوں پر لازم ہوتا تھا اس کے لیے حقوق العباد کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا اور کتب فقہ میں اور اسلامی تعلیمات میں آج بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہی لفظ اسلامی عقیدے کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

کیونکہ عبد ایک اضافی لفظ ہے عبد ہوگا تو آقا کا تصور بھی لفظ عبد سنتے ہی ذہن میں آتا ہے کہ یہ عبد ہے اس کا کوئی مالک ہے جس کے اشاروں پر یہ چلتا ہے یہ اسی چیز کو حق سمجھتا ہے جو اس کا مالک' آقا اور خدا اسے بتائے اس نے دوسروں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے وہ بھی اس کا آقا اس کو بتائے گا اور اس کے حقوق بھی اسی کی طرف سے متعین ہوں گے کہ فلاں بندے کا فلاں پر یہ حق ہے اور لفظ (انسان) ظاہراً ایک اپنا تشخص رکھتا ہے اور مغربی نظریے کے مطابق یہ اپنے حق کی تعیین خود کرے گا خدا سے رہنمائی لینے کا روادار نہیں ہے۔ لفظ (انسانی حقوق) اس معنی کی ترجمانی کرتا ہے اور مغربی تہذیب میں یہی معنی مراد ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کوئی عیسائی ہو یا مسلمان، ہندو ہو یا سکھ، بدھ مت ہو یا لادین انہوں نے یہ حقوق انسانیت کو بنیاد بنا کر اپنی عقل سے تیار کیے ہیں لہٰذا یہ اصول وقوانین کسی بھی مذہب وملت کے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہوسکتے اقوام عالم کے بعض مذاہب کی یہ عظیم غلط فہمی ہے کہ یہ حقوقِ انسانی کا منشور ان کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہے حالانکہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں کیونکہ مغرب میں انسانیت کی حقیقت ایسی تصور کی گئی ہے جس کی کسی مذہب میں گنجائش نہیں لہٰذا اس انسانیت کی بنیاد پر جو حقوق طے کیے جائیں گے وہ حقوق بھی دینی تعلیمات کے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے......

دفعہ نمبر 1: تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے اس لیے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا

سلوک کرنا چاہیے۔

اقوام متحدہ کے منشور میں یہ قرار دیا گیا کہ انسان کو زندگی گزارنے اور معاشرے کو تعمیر کرنے کے لیے جو بنیادی وسائل دیئے گئے ہیں وہ دو ہیں ایک عقل دوسرا ضمیر، عقل کی بنیاد پر انسان اپنے طبعی معاشرے کی تعمیر کرتا ہے تو ضمیر کی بنیاد پر اپنے اخلاقی معاشرے کی تعمیر کرتا ہے۔

اسلام اس تصور باطل کو رد کرتا ہے اور یہ قرار دیتا ہے کہ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر نہ تو اخلاقیات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور نہ ہی انسانی معاشرت کو صحیح خطوط پر استوار کیا جاسکتا ہے۔

اسلام میں زندگی گزارنے کا طریقہ خیر وشر کا معیار اور بنیاد صرف وحی الٰہی ہے اس سے انحراف کی سر مو گنجائش نہیں عقل وضمیر وحی الٰہی کے تابع ہونگے انسان اپنی عقل وفہم کی وجہ سے تمام جانوروں سے ممتاز ہے مگر رب کریم کے قریب سے قریب تر ہونے کا طریقہ محض عقل نہیں بتاسکتی اس عمل سے یہ قاصر ہے تمام تر روشنی انسان وحی سے حاصل کرے گا اور وحی الٰہی اور قانون خداوندی میں حقوق کی درجہ بندی ہے مرد وعورت کا فر ومسلم کیلئے حقوق علیحدہ علیحدہ ہیں اور مساوات قانون کے نفاذ میں ہوتی ہے نہ کہ قانون سازی میں، اس شق میں کہا گیا ہے کہ تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت میں برابر ہیں حالانکہ اسلام میں اس طرح کی برابری کا کوئی تصور نہیں ہے...... کہ کافر ومسلم مرد وعورت برابر ہوں

دفعہ نمبر 2: مذہب کی بنیاد پر معاشرتی تفریق نہیں ہوگی۔

انسانی حقوق کے منشور میں یہ قرار پایا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر معاشرتی تفریق ناجائز ہے جبکہ اسلام میں مذہب کی بنیاد پر معاشرتی تفریق ایک مرکزی تصور ہے اور اہل اسلام اور معاشرتِ اسلام میں شرکت اور خراج کی واحد بنیاد اسلام ہے اہل کفر سے معاملے کا طریقہ بالکل جدا ہے اسلامی حکومت میں معاہد اور ذمی کے معاملات بھی مختلف طریقوں سے طے کیے جاتے ہیں۔

اہل کتاب کی عورتوں سے اگرچہ شرعاً شادی کرنے کی گنجائش ہے لیکن مسلم عورتوں کو اہل کتاب مردوں سے شادی کرنے کی اجازت نہیں اس کے علاوہ غیر مسلم جزیرۃ العرب کے

اندر داخل نہ ہونے دیں گے۔غرض یہ کہنا کہ مذہبی بنیاد پر کوئی فرق نہ کریں گے سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اسلامی شریعت میں مسلمانوں اور کافروں کے احکام ومسائل بالکل الگ الگ ہیں حتیٰ کہ ان کا لباس بھی مسلمانوں جیسے نہ ہونگے۔

الغرض مذہب ہی سے مسلمان دوسروں سے ممتاز ہوگا البتہ قومیت' علاقائی تشخص عمدہ حسب نسب کا اعتبار نہ کیا جائے گا لیکن مسلمان ہونے کا اعتبار کرتے ہوئے کفار پر اس کو فضیلت دی جائے گی' کافر اگر مسلمانوں کے ملک وخطہ میں آباد بھی ہیں تو ان کو حقوق تو حاصل ہوں گے مگر مسلمانوں کے اور ذمیوں کے حقوق الگ الگ ہوں گے یہ مسلمانوں کے ذمی بن کر زندگی کے دن گزاریں گے ان کو ان کی عبادت گاہوں میں عبادت کی اجازت دیں گے مگر کوئی نیا معبد وصنم خانے کی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے گی۔عبادت وتجارت کے اکثر احکام ومسائل مسلمانوں سے مختلف ہیں۔

دفعہ نمبر 3: ہر شخص کو اپنی جان' آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے۔

اس آرٹیکل میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہر انسان کو زندگی کا حق حاصل ہے کہ وہ زندہ رہے اور اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنے کا حق ہے اور اس کا یہ حق بھی ہے کہ اس کے اس حق کی حفاظت کی جائے۔

اسلام زندگی کو انسان کا حق قرار نہیں دیتا بلکہ یہ اللہ کا عطیہ ہے جسے اللہ کے احکام کے مطابق گزارنا چاہیے اسلامی ریاست میں مشروط زندگی گزارنے کی اجازت حاصل ہے اگر اسلام پر باقی ہے تو زندہ رہے اگر کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کو نصیحت کریں گے اگر باز نہ آئے تو اس کو قتل کریں گے اسی طرح زندیق کو زندگی کا حق نہ دیں گے کیونکہ وہ اللہ جل شانہ کا باغی ہے اور باغی کی سزا قتل ہے۔اسی طرح زنا کار جس کی شادی ہو چکی ہو تو اس کو بھی سنگسار کیا جائے گا اس کا بھی کوئی حق نہیں کہ وہ زندہ رہے۔رضامندی سے زنا کرنے والا یا جبراً زنا کرنے والا جبکہ شادی شدہ ہوں ایک ہی حکم ہے اس لیے کہ زندگی (اسلامی نظریہ کے مطابق) انسان کا حق نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عطیہ ہے جب حکم عدولی کرے گا تو جان طلبی کا حکم ہونا برحق ہے۔

اسی طرح جان کے علاوہ مطلق العنان آزادی سے زندگی گزارنے کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا کہ آدمی اپنی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے شہر میں فحاشی پھیلائے۔ اگر کسی بھی حرام کام میں ملوث ہوا تو اس کو روکا جائے گا۔

دفعہ نمبر 4: کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جائے گا غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل ہو ممنوع قرار دی جائے گی۔

اسلام کے ظہور سے قبل نبی اکرم ﷺ کی آمد سے پہلے زمانوں میں غلامی کا رواج چلا آ رہا تھا۔ روم و یونان، عیسائیت و یہودیت سب غلام تو بناتے تھے مگر کسی کے پاس ان کے بارے میں تفصیلی احکام نہ تھے ان کے حقوق طے نہ تھے رحمت دو عالم ﷺ نے آ کر ان بے بسوں کی قسمت کو بدل دیا ان کے حقوق طے کر دیئے اور غلام بنانے کو مباح رکھا اس کو ناجائز قرار نہ دیا حتیٰ کہ یہ سلسلہ صحابہ و تابعین کے بعد عرصہ دراز تک قائم رہا اور اسلام کے تمام مفکرین و فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ امر مباح ہے غلام بنانے میں کوئی حرج کی بات نہیں اگرچہ اسلام میں آزاد کرنے پر ترغیب دی جاتی ہے مگر غلام بنانے سے منع بھی نہیں کیا۔

ہیومن رائیٹس کی یہ شق بھی اسلامی تعلیم کے خلاف ہے کہ اسلام ایک چیز کو جائز کہتا ہے اور یہ اقوام عالم اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ اگر مباح کام کو امیر وقت منع کر دے تو اس سے رکنا ضروری ہو جاتا ہے اس وجہ سے آج کل امیر وقت کی عدم اجازت کے سبب کسی کو غلام نہ بنائیں گے۔ مگر اصل تعلیم اسلام کی اباحت ہی ہے اور آج تک اباحت کا حکم باقی ہے جس دن حاکمِ وقت پابندی ختم کر دے تو حکم اصلی واپس لوٹ آئے گا۔ الغرض یہ شق بھی اسلامی تعلیم اور منشأ کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ انسانیت سوز یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

اس شق میں اسلامی سزاؤں کو رد کیا گیا ہے اور اس کا عنوان یہ بنایا کہ اقوام متحدہ غیر انسانی اور وحشی سزاؤں کو کالعدم قرار دیتی ہے۔ اس میں تمام اسلامی سزاؤں کو نشانہ بنایا گیا۔

حالانکہ حد کا نفاذ سرکار دو عالم ﷺ نے خود اپنے زمانے میں کیا اس کے بعد اسلامی

طریقہ عدالت بھی یہ تھا اور اسلام کے اہم امور میں سے اسے تصور کیا جاتا ہے قاضی کے پاس اگر ثابت ہو جائے کہ فلاں بندے نے چوری کی ہے تو اس کے بعد مالک اس کو معاف بھی کرے پھر بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اسی طرح زنا کرنے والے ایک دوسرے سے رضا مندی سے بھی یہ فعل کریں تب بھی مکمل سزا دی جائے گی اس لیے کہ یہ حدود بندے کا حق نہیں ہیں جو وہ معاف کردے بلکہ یہ اس خالق کا حق ہیں جس نے اس کو پیدا کیا اس پر کروڑوں احسانات کیے ایک بے معنی چیز سے خوبصورت سننے دیکھنے والا انسان بنایا۔ یہ اس کا حق ہے۔ چونکہ اس بندے نے خدا کی نافرمانی کی ہے۔ لہٰذا عدالت حدود والی سزاؤں کو جرم ثابت ہونے کے بعد معاف نہیں کرسکتی اور یہ بدیہی سی بات ہے کہ آدمی جب بندوں میں رہتا ہے تو اس کے ذمہ دوسروں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں جسے یہ ادا کرتا ہے اور جس خالق لم یزل نے اسے عدم سے وجود دیا آیا اس کا اس بندے پر کوئی حق نہیں الغرض حدود کا نافذ کرنا اللہ کا حق ہے اور اس شق میں اس کو رد کیا گیا ہے کہ یہ انسانی حقوق کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حقدار ہیں اس اعلان کے خلاف جو تفریق کی جائے یا جس تفریق کیلئے ترغیب دی جائے اس سے سب برابر کے بچاؤ کے حق دار ہیں۔

اقوام متحدہ کے مطابق تمام انسان مرد و عورت بغیر کسی فرق کے قانون سازی کی حیثیت سے برابر ہیں۔ قانون سازی میں برابری کا تصور اسلام میں نہیں ہے اس لئے کہ اسلامی قانون میں عدل ہے مساوات و برابری نہیں ہے۔

قانون مسلمانوں کیلئے اور ہے ذمیوں کیلئے اور اسی طرح مردوں کے لئے اور طرح کے قوانین وحقوق ہیں اور عورتوں کیلئے قانون وحقوق مردوں سے مختلف ہیں مرد ایک سے زائد شادیاں کرسکتا ہے جبکہ عورت صرف ایک شادی ایک وقت میں کرسکتی ہے مرد کو طلاق دینے کا حق ہے جبکہ عورتیں طلاق نہیں دے سکتیں، بیٹی کا حصہ بیٹے سے نصف ہوتا ہے اسی طرح مرد کی دیت مکمل اور عورت کی دیت مرد سے نصف ہوتی ہے معاش کی تمام تر ذمہ داریاں مرد پر ہیں عورت پر نہیں۔ مگر

اس چارٹر میں سب کو پابند کیا گیا ہے کہ اس تفریق کو ختم کیا جائے جو حقوق مرد کو دیئے جائیں عورت کو بھی وہی حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ شق بھی اسلام کی تعلیمات کے مخالف ہے خاص طور پر عورتوں اور ذمیوں کے مسائل اکثر اس شق کے متضاد ہیں۔

دفعہ نمبر 8: جز اول: ہر شخص کا حق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو......

یہ شق بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ہر جگہ سفر کرنے کی اجازت اسلام نہیں دیتا مثلاً مکہ میں کافروں کو داخل نہ ہونے دیں گے۔ مگر اہل مغرب کہتے ہیں ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ جس ریاست میں چاہے سفر کرے اور قیام اختیار کرے لیکن اسلام جزیرہ العرب میں کافروں کو سکونت کی اجازت نہ دے گا۔

دفعہ نمبر 8: جز ثانی: ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

بظاہر یہ شق عام سی معلوم ہوتی ہے مگر اس شق سے تمام مرتدین و گستاخانِ رسول سزا سے مامون ہو گئے اور اسلامی قانون میں جو ملک بدر کرنے کی سزا موجود ہے اس کو ختم کر دیا گیا۔ غرضیکہ یہ شق بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 15: ہر شخص کو قومیت کا حق ہے کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائیگا اور اس کو قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

اس شق میں قومیت بدلنے کی اجازت عام کا اعلان درج ہے کہ کوئی حاکم یا کوئی اور کسی دوسرے کو قومیت کے بدلنے سے روک نہیں سکتا۔ ہر بندہ آزادانہ طور پر اپنی قومیت و نسل بدلنا چاہتا ہے تو اس کا حق ہے وہ اس طرح کر سکتا ہے۔ مگر اسلام میں اس حرکت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا! مفہوم ہے کہ اپنے باپوں کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت مت کرو۔ یہ قبیلوں کے بعد قوموں میں تقسیم محض اس لیے ہے کہ تم آپس میں

ایک دوسرے کو جان سکو۔ نہ کہ تفاخر کیلئے اگر ہر بندہ اپنے خاندان کو بدلنا شروع کر دے تو خاندان میں تقسیم کا منشا ہی ختم ہو جائے گا۔ غرضیکہ یہ شق بھی اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 16: بالغ مردوں عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے مردوں اور عورتوں کو نکاح ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملہ میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

اقوام متحدہ کے مطابق تمام مرد و عورت کو بلا تفریق مذہب و ملت شادی کرنے اور اسے فسخ کرنے کا اختیار ہے اسلام اس کو رد کرتا ہے مسلمان عورتوں پر حرام ہے کہ وہ کافرو مشرک مرد سے شادی کریں اور مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ کتابی مرد سے شادی کرے اسی طرح اسلام میں عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا گیا۔

طلاق صرف مرد دے سکتا ہے الغرض بہت سے مسائل میں عورت مرد سے مختلف ہے عبادات سے لیکر معاملات تک اکثر مسائل ایسے ہیں جن میں شریعت مسلمان عورت کو مسلمان مرد سے الگ کرے گی ان کے احکام و مسائل جدا جدا ہوں گے اور عدل و حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے اس لئے کہ دو جنس الگ الگ ہیں ان کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں اسلام معاش و خورد و نوش کی ذمہ داری مرد پر ڈالتا ہے اور گھریلو امور عورت انجام دیتی ہے۔

یہ شق بھی صراحتاً اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 17: نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضامندی سے ہوگا۔

اس شق میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مرد و عورت آپس میں رضا مندی سے نکاح کر سکتے ہیں ان پر کسی دوسرے فرد کا خارجی دباؤ نہ ہوگا ان کو اس تعلق سے کوئی روک نہیں سکتا۔

یہ شق بھی اسلامی تعلیم کے متضاد ہے اسلام عورت کو جبکہ وہ نابالغ ہو تو بالاتفاق اس کا حق نہیں دیتا اور جب وہ بالغ بھی ہو جائے تو (باختلاف الائمہ) اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنا نکاح اولیاء کی رضامندی کے بغیر کسی مرد سے کرالے۔

اگر وہ عورت غیر کفو میں نکاح کر لیتی ہے تو اس کے اولیاء کو اس نکاح کے فسخ

کروانے کا حق ہے۔ اسلام میں کفو اور ولایت کے کتب فقہ میں مستقل ابواب ہیں۔

الغرض یہ شق بھی اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس میں اسلام کی حکمت بالغہ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ عورت چونکہ ناقص العقل ہے ظاہری چمک دیکھ کر کسی ایسے فرد کے عقد میں نہ چلی جائے جو اس کی زندگی کیلئے موزوں نہ ہو اس لیے اسلام اولیاء کو بطور سرپرست عورت کے اس عقد کا ذمہ دار مقرر کرتا ہے کہ عورت اپنا نکاح خود نہ کرے بلکہ اولیاء اس کا نکاح اس کی رضامندی سے کریں۔

دفعہ نمبر 18: ہر انسان کو آزادی فکر آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

اس شق میں نہایت واضح طور پر لکھا ہے کہ مذہب کی مکمل آزادی ہے صبح کو مسلمان ہو تو شام کو عیسائی ہو جائے اس سے اگلے دن ہندو پھر بدھ مت کا پیروکار اور پھر عیسائی تو اس آرٹیکل کی رو سے کوئی حرج نہیں، مذہب اختیار کرنے میں ہر فرد آزاد ہے حالانکہ صرف اسلام ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کے دین کو قبول کرنے کے بعد ترک نہ کیا جائے۔

اسلام میں بھی اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد ترک کرے گا اس مرتد کو قتل کیا جائے گا۔ اس آرٹیکل میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہر کسی کو تبلیغ کا حق ہے اس کا جو بھی عقیدہ ہے تنہا یا دوسروں سے مل کر اس کی تبلیغ کرنا اس کا حق ہے جبکہ اسلام میں صرف اس بات کی تبلیغ کی اجازت دی جائے گی جو اسلام کے مخالف نہ ہو۔

اگر کوئی کفر اور الحاد کی تبلیغ کر رہا ہے تو اس کو سلطنتِ اسلام میں نہ چھوڑیں گے، اور اگر اسلام کا عنوان دے کر غلط علوم کی تبلیغ کرتا ہے غلط عقائد و نظریات عوام میں پھیلاتا ہے تو اس زندیق کو قتل کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی ہے اس حق میں یہ بھی

شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیئے علم اور خیالات کی تلاش کرے انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے............

آزادی رائے کا حق اور اپنے خیالات کے اظہار کا حق' اس کا مطلب ہے اگر کوئی خبیث النفس انبیاء کی یا برگزیدہ ہستیوں کی توہین کرنا چاہتا ہے یا مذہب کا مذاق اڑانا چاہتا ہے اسے مکمل حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے جبکہ اسلام ہر ایسی رائے پیش کرنے سے منع کرتا ہے جس میں اسلام کی منشأ کے خلاف عقائد کی ترویج ہو' غلط نظریات کی اشاعت ہو یا اس تعلیم یا خیالات سے مسلم معاشرے میں اخلاقی بگاڑ آتا ہو اسلامی حکومت ان تمام آلات مواصلات پر پابندی لگانے کی مجاز ہوگی جس سے مسلمانوں کے اخلاق وعقائد پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہوں۔

الغرض اسلام کے خلاف خیالات کی تبلیغ کا حق اور ایسے افکار کی ترویج کا حق جو اسلام کے خلاف ہوں اسلامی حکومت اسکی ہرگز اجازت دینے کی مجاز نہیں ہے اور دور حاضر میں اسی آرٹیکل کی آڑ لیکر انبیاء کرام کی توہین اور مذہب کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اس عمل کو اپنا حق تصور کیا جاتا ہے۔ اہل مغرب جان بوجھ کر ایسے اقدام کرتے ہیں جس سے مذہبیت ختم ہو بلکہ وہ افراد جو مذہب کو اہمیت دیتے ہیں ان کو فرسودہ سمجھتے ہیں۔

دفعہ نمبر 20: ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

اس آرٹیکل کی آڑ میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پرامن تنظیمی سرگرمی میں ملوث ہو اور پرامن طریقے سے جو بھی کام کرنا چاہے کرے غرباء کی مدد کے نام پر تنظیم قائم کر کے لوگوں کے عقیدوں کا دام لگائے یا عورتوں کے حقوق کی انجمن قائم کر کے پرامن طریقے سے فحاشی اور عریانی کی راہ ہموار کرے لاوارث یتیم بچوں کی پرورش کا ادارہ کھول کر حرامی بچوں کے دنیا میں آنے کا سبب بنے۔ الغرض ہر قسم کی پرامن سرگرمی جس کے نتیجے میں مغربی معاشرے کی ترویج ہو اور ان کے افکار پھیلیں اس کی اجازت اس آرٹیکل میں دی گئی ہے۔

جبکہ اسلام کسی بھی ایسی تنظیم یا این جی اوز کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں جس کے عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ اسلامی معاشرہ برائیوں کی طرف جا رہا ہو۔ جیسا کہ دور حاضر کی انجمنیں اور این جی اوز کا کام ہے وہ حسین عنوان قائم کر کے لوگوں سے فنڈز وصول کرتے ہیں پھر انسانیت کی خدمت کے نام پر برائیوں کے وجود کا سبب بن کر انسانیت کو درندگی کی طرف لیجاتے ہیں یا غریب علاقوں میں اناج لے جا کر ان غریب عوام کو اناج و کپڑا ان کے ایمان کے بدلے دیا جاتا ہے وہ مجبور حالات سے شکست خوردہ، کم علم ان بے رحموں کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور **کاد الفقر ان یکون کفراً** کا مصداق بن جاتے ہیں۔

دفعہ نمبر 21: عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی

انتخاب کے ذریعے ظاہر کیجائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہ یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریق رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے............

اس آرٹیکل میں ایک تو جمہوریت کو مسلمہ اصول کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

عوام کی مرضی اقتدار کی بنیاد ہوگی جبکہ اسلام میں اللہ کی مرضی اور رضا حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہے اس اصول کے علاوہ کسی اور اصول کی بنیاد پر حکومت کی بنیاد رکھنا اللہ سے بغاوت ہے۔ اس لئے کہ اسلامی سلطنت کے نفاذ کا اعلیٰ ترین مقصد آزادانہ طور پر احکام الٰہی کو بجالانا اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہوتا ہے۔

اسلام میں قومیت' نسبت' کی بنیاد پر حکومت قائم کرنے کا تصور غلط ہے بلکہ حکومت ایک ملت و امت ہونے کی حیثیت سے قائم ہوگی۔ عوام کی مرضی نہیں چلے گی کہ عوام مل کر کسی کافر کو اقتدار سپرد کر دیں کہ یہ ہمارے معاملات حل کر دے گا یا کسی اور وجہ سے عوام راضی ہو جائیں عوام کی رضا کے باوجود اس کو اقتدار دینا صحیح نہ ہوگا الغرض یہ آرٹیکل بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 25: زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں تمام بچے خواہ وہ شادی سے پہلے

پیدا ہوں یا شادی کے بعد معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

اس میں کوئی تردد نہیں کہ زچہ و بچہ خاص توجہ و امداد کے حق دار ہیں لیکن شادی سے پہلے بچے پیدا ہونے کا تصور اسلامی معاشرے میں نہیں یہ کھلے لفظوں میں زنا کی ترغیب ہے کہ بچے کے خوف سے عورت اس عمل سے بچ جاتی ہے مگر جب حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگی کہ ہم اس خدمت کو سرانجام دیں گے تو لامحالہ زنا کا دروازہ کھلے گا۔

جیسا کہ آج مغربی ممالک میں ہو رہا ہے ان کے ہاں حرامی بچوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی کسی سے والد کا نام پوچھ لے تو اس کو غیر مہذب سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ اکثریت ایسے نوجوانوں کی ہے جن کو اپنے باپ کا علم نہیں ہوتا سرکاری کاغذوں میں بھی ماں کا نام لکھا جاتا ہے باپ کے نام کی جگہ ماں کا نام چلتا ہے۔ یہ آرٹیکل بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے زنا کی ترغیب ہے جس سے معاشرے میں بے پناہ بگاڑ آتا ہے اور اسلام میں زنا کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اس عمل کے مرتکب کو سخت سزا دی جائے گی۔

دفعہ نمبر 26: تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشو ونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت رواداری اور دوستی و ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لئے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی ....

اسلام میں تعلیم حاصل کرنے کا منشأ و مقصود اس سے مختلف ہے اور تعلیم کے حصول کے فضائل بھی اس وقت حاصل ہوں گے جس وقت مقصود وہی نظریہ ہو جو اسلام نے بتایا ہے۔

تعلیم کا مقصد اسلام میں خوف خدا اور فکر آخرت کا حصول ہے اور تعلیم کا مقصد بندگی کا فروغ، آزادی، مطلق العنانی اور بے قاعدہ زندگی کا قلع قمع کر کے فرائض پر عمل کو ممکن بنانا اور آخرت کی تیاری کے لیے سازگار ماحول فراہم کرنا ہے۔ یہ اسلامی تعلیم کے حصول کا مقصد ہے۔

جبکہ مغربی فکر بالکل اس کے برعکس ہے لہٰذا یہ شق بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 27: ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

اس شق میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمام ایسے پروگرامز جو کسی علاقے کی ثقافتی حصہ میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ ان کا دین سے تضاد ہو اس میں شرکت کی سب کو قانوناً آزادی ہے مثلاً پتنگ بازی، ہولی وغیرہ میں شرکت کرنا اس کا حق ہے۔

جبکہ اسلام کسی ایسے کھیل کی یا پروگرام میں شرکت کی اجازت نہیں دیتا جو منشأ اسلام کے خلاف ہو۔ اس آرٹیکل سے ڈانس کے پروگرام تھیٹر ڈرامے، غیر اسلامی تفریحات، جشن وغیرہ سب کو قانونی تحفظ دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ شق بھی اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

احکام اور حقوق میں فرق

اسلام ایک عالمگیر دین ہے جس میں مکمل ضابطہ حیات ہے ہر ایک کیلئے مسائل و احکام طے ہیں اور ہر انسان اور اس کے گرد و نواح میں موجود چیزوں کے حقوق مقرر ہیں مگر ان کی حیثیت اور ہے اور مغرب جب کسی کا حق ثابت کرتا ہے تو اس کی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے۔

اسلام میں احکام (فرائض) نافذ کیے جاتے ہیں جس سے ہر ایک کو احسن طریقے سے حق خود بخود مل جاتا ہے الگ سے حقوق کی فہرست تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے نہ اس کے مطالبے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ ایک حکم کے بجالانے سے ہی کئی حقوق خود بخود اداء ہو جاتے ہیں۔

اصل نافذ کرنے کی چیز احکام و فرائض ہوتے ہیں تمام سلف وخلف کا طریقہ کار اور مکمل انسانی تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بطور قانون نافذ ہونے والی چیز احکام ہوتے ہیں نہ کہ حقوق۔ کتب فقہ میں بھی احکام کو تفصیلی طور پر بیان کیا جاتا ہے اسلامی فقہ ہی اسلامی قانون ہے۔

اگر حقوق کا ذکر کیا بھی جائے تو وہ اخلاقی پہلو سے قابل عمل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے مثلاً والدین کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب دی جائے گی نافرمانی کرنے والے

کیلئے وعید ہوگی۔ اس کو اخلاقی طور پر مجبور کیا جائے گا اور سمجھایا جائے گا کہ والدین کی خدمت کرے لیکن اس حق عدولی کی وجہ سے اس کو تعزیر کرنا سزا دینا جیل میں رکھنا یا اس جیسی کوئی اور سزا دینا یہ اسلامی طرز عمل نہیں۔

لیکن مغرب میں احکام نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس کو قانون بنا کر نافذ کرسکیں اس لیے کہ وہ تمام اعلیٰ اتھارٹی کا انکار کر چکے ہیں۔ خیر اور شر کسی اور ہستی یعنی خدا سے طے کروانے کی بجائے ہر بندہ خود خیر اور شر کا تعین کرے گا۔ جب ہر ایک کو اختیار ہے تو درحقیقت خیر کوئی چیز نہ رہے گی ہر طرف مطلق العنانی ہوگی کیونکہ کوئی آدمی کسی بات کو خیر قرار دے گا دوسرا اس کے برعکس نظریات و کردار کو خیر اور حق قرار دے گا اس لیے وہ اخلاقیات کو بطور قانون نافذ کرنے پر مجبور ہیں۔

حق کو بطور قانون نافذ کرنے کا نقصان:

احکام کو قانونی شکل دینے اور حق کو بطور اخلاقیات کے پیش کرنے میں ایک حکمت بالغہ ہے جو آج تک اہل مغرب کی فہم میں نہیں آئی۔

حقوق کا حصول اگر قانون کی سطح سے ہٹ کر اخلاقی طور پر کیا جاتا ہے مثلاً والدین کی خدمت کیلئے قانون سے نہیں بلکہ ذہن سازی ترغیبات وترہیبات سے کام لیا جائے تو معاشرے میں امن وسکون اور محبت پھیلتی ہے۔ جیسا کہ اسلام کے دور میں ہوتا رہا ہے یہ دنیا مثل جنت بن جاتی ہے۔ جب حق کو بطور قانون نافذ کردیا جائے تو اس قانون کے نفاذ سے حق تو مل جائیں گے لیکن امن وسکون کا جنازہ نکل جائے گا محبتیں نفرتوں میں تبدیل ہو جائیں گی سکون کی بجائے معاشرے میں بے سکونی کی فضاء عام ہوجائے گی جیسا کہ مغرب میں اس کا عملی نمونہ دیکھا جاسکتا ہے۔ مال ودولت اولاد گھر بار سب کچھ ہونے کے باوجود دل ویران ہے ہر فرد پریشان ہے بے چینی وناچاکی کی فضاء ہے۔ محبتیں ناپید ہیں۔

ظاہر ہے جب والدین کی عزت واحترام دل میں نہ ہو صرف قانون کی وجہ سے حق ادا کرنا پڑے اور نہ ادا کرنے پر سزا کا پیغام سننا پڑے تو ایسی خدمت سے والدین کی رضا

مطلوب نہ ہوگی۔ ہندوستان میں یہ قانون ایک دفعہ نافذ ہو چکا ہے مگر اس کے کوئی اچھے نتائج ظاہر نہیں ہوئے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل مغرب اپنی اس غلط قانون سازی کا تدارک کرتے اور اخلاقیات کو قانون بنانے سے پرہیز کرتے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہو گیا۔ اہل مغرب سے مرعوب ذہنوں نے اپنی سابقہ تاریخ کو چھوڑ کر اپنے عالی شان ماضی پر پردہ ڈال کر خود ان کے قانون کی طرح کا ڈھانچہ مذاہب سے اور شریعت سے تلاش کرنا شروع کر دیا اور اسلام جو حقوق مسلمانوں کو یا غیر مسلموں کو دیتا ہے یا دیگر حقوق جو ایک اسلامی معاشرے میں رہنے والے فرد کو حاصل ہوتے ہیں اس کو ہیومن رائیٹس کی سی ترتیب دے کر تیار کر دیا۔ یہ عمل اس حد تک قابل تحسین ہے کہ مغرب کا منہ بند کروانے کیلئے ایک اچھا حربہ ہے وہ ہر وقت حقوق انسانی کی رٹ لگاتے رہتے ہیں اگرچہ اس کی مخالفت میں ان سے کوئی بازی نہیں لے سکتا جیسا کہ بعض مخلص دین دار لوگوں نے یہ کام کیا ہے اس حد تک یہ کام قابل مدح ہے لیکن کچھ لوگ ایک جداگانہ سوچ رکھتے ہیں مثلاً یوں کہنا کہ اسلام سے روشنی پا کر ہیومین رائیٹس کا یہ چارٹر تیار کیا گیا ہے۔ اور یہ کہنا کہ درحقیقت یہ ہمارے گھر کے چراغ ہیں جس سے غیروں نے اپنے چمن روشن کر لیے وغیرہ وغیرہ پھر اسلام اور ہیومین رائیٹس کی ہم آہنگی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور لفظ کے ظاہر کو دیکھ کر حقیقت حال کی طرف التفات کیے بغیر اس کی اسلام کاری شروع کر دی جاتی ہے یہ طریقہ کار غلط ہے یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اسلام وکفر جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔

مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب دو کناروں کی طرح ہیں جن کا آپس میں ملنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے جیسا کہ ایک مغربی مفکر کہتا ہے (سموئیل ہنٹنگٹن) کہ اسلامی تہذیب اور مغربی فکر و فلسفہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں یہ تضاد تشدد کی حد تک ہے۔

یہ اس بندے کا تبصرہ ہے جو مغرب کو اچھی طرح سے جانتا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں کچھ حقیقت سے ناآشنا یا مغربی قہقہوں سے متاثر ہو جانے والے افراد کہتے ہیں۔

اقتباس:

حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب اصولی طور پر اسلام کے حق میں ایک معاون واقع ہوا اس نے اسلام کے بہت سے نئے امکانات کھولے۔ (اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب: ص۱۰) بلکہ دور حاضر میں ایک طبقہ اس طرح کی سوچ وفکر رکھتا ہے کہ مغربی تہذیب اسلام کی معاون و مددگار رہے یہ تہذیب اسلام سے ہی متفرع ومتشرح ہے۔

پھر اس دعویٰ کو دلیل سے ثابت کرنے کیلئے آزادی و مساوات کی روشنی میں اسلام کو مغرب کے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آزادی ومساوات کا معنی ومفہوم واقسام وغیرہ شروع کے ابواب میں تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں اس کی روشنی میں یہ ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔ جب ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی تو دین کی غلط تشریحات کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت کرسکیں کہ اسلام اور مغرب میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔

حقوق کو قانون کا درجہ دینے کا دوسرا نقصان:

احکام کو قانون بنا کر نافذ کرنے سے قانونی شقیں کم بنیں گی حقوق سب کو خود بخود ملتے رہیں گے آئے روز قانون سازی کا عمل نہ کرنا پڑے گا۔ جبکہ حقوق کو قانونی طور پر نافذ کرنے میں ایک بڑی خرابی ہے کہ قانون سازی کا عمل مستقل اور مسلسل جاری رہتا ہے۔ جیسا کہ مغربی دنیا میں آج کل ہو رہا ہے ہر تیسرے دن کوئی نیا قانون وجود میں آجاتا ہے۔

تیسرا نقصان:

حقوق کو اخلاقیات کی بجائے قانون سے لینے کی مہم کی وجہ سے بے شمار قوانین وجود میں آتے ہیں اور اتنے قوانین بن جاتے ہیں کہ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے قوانین کو توڑنے کی سزا کی زد میں آجاتے ہیں۔ ماحول کے حوالے سے نافذ قوانین کی دو مثالیں:

1)۔ اگر کسی کا کتا دن میں دو مرتبہ سے زیادہ بھونکا تو کتے کے مالک کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا کیونکہ اس نے دوسروں کے آرام میں خلل ڈالا ہے۔

2)۔ اگر کسی کو خراٹے لینے کی بیماری ہے اور رات کو خراٹے لیتا ہے اور بیوی اس کے خراٹوں سے تنگ ہے۔ بیوی نے پولیس کو شکایت کردی کہ یہ میری نیند میں خلل ڈالتا ہے تو مرد اس جرم میں بھی جیل جائے گا۔

غرض اس طرح کے بے شمار قوانین ہیں جن کے بارے میں آدمی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسا کرنے کی وجہ سے جرمانہ ہوسکتا ہے۔ کسی مملکت میں قوانین کی کثرت اس مملکت کے لوگوں کا اخلاقی طور پر کمزور ہونے کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی بڑی تہذیبوں میں سے کسی تہذیب میں اس قدر قوانین نافذ نہ تھے۔ یہ بے شمار قوانین مغربی اخلاقیات کے مرہون منت ہیں۔

اسلام کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں قوانین کم ہیں، ہزاروں میں سے کوئی ایک فرد ملتا ہے جو جرم کی پاداش میں جیل گیا ہو۔ اگر جیل جائے گا بھی تو ایسے عمل کی بنا پر جائے گا جو اس نے بالقصد کیا ہوگا نہ کہ مغرب کی طرح اتنے قوانین ہوں کہ بچنے کی صورت ہی مشکل ہو۔

اسلام میں بہت سے مسائل اخلاقیات سے حل کر لیے جاتے ہیں حقوق کی ادائیگی اسی حوالے سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ امن ومحبت کا گھوارا ہوتا ہے۔

اسلامی فقہ اسلامی قانون ہے:

اسلامی قوانین کئی صدیوں تک نافذ رہے ہیں انہی قوانین کی وجہ سے سب کو حقوق ملتے تھے اسلامی نظام حکومت وقوانین ایک مثالی قانون کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

o۔ اسلامی فقہ ہی اسلامی قانون ہے۔ o۔ اسلامی قانون کیا ہے؟

فقہاء امت علیہم الرحمتہ نے قرآن وسنت میں غور وخوض کر کے ہر ہر مسئلے کا حل لکھ دیا ہے مثلاً اگر فلاں مسئلہ پیش آئے تو اس کا حکم یہ ہے اور اگر فلاں صورت پیش آ جائے تو اس کا یہ حکم ہے۔ کتب فقہ ہی اسلامی قانون کی کتابیں ہیں ان کتب میں بندوں کے متعلق شریعت کے احکام درج ہیں۔ اسلامی عدالتیں اور قاضی حضرات انہی کو مدنظر رکھ کر فیصلہ سناتے تھے۔

اسی مرتب شدہ اسلامی قانون کو کافی وشافی سمجھا جاتا تھا مگر دور حاضر میں بعض

حضرات کا نظریہ ہے کہ اسلامی قانون کو بھی اسی طرح مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس طرح ہیومین رائیٹس کا دستور ہے اسی طرح اسلام کا بھی دستور ہونا چاہیے جس طرح اُس میں عورتوں کے حقوق کی بات ہے اسی طرح اسلام بھی عورتوں کے حقوق دیتا ہے مگر ہمیں واضح شقیں بنانی چاہئیں۔

☆۔مثلاً اسلام میں ذمیوں کے حقوق
☆۔اسلام میں عورتوں کے حقوق
☆۔اسلام میں غریبوں کے حقوق
☆۔اسلام میں زوجہ کے حقوق
☆۔اسلام میں اولاد کے حقوق
☆۔اسلام میں اقلیتوں کے حقوق
☆۔اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق
☆۔اسلام میں والدین کے حقوق
☆۔اسلام میں اظہار رائے کا حق
☆۔اسلام میں مذہبی آزادی کا حق

اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایسا دستور جس میں حقوق کا بیان ہو وہ خطبہ حجۃ الودع سے بنایا جاسکتا ہے خطبے کی شقوں کو مدنظر رکھ کر ایسا قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے جو تمام اقوام کیلئے قابل عمل ہو......وغیرہ وغیرہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں ان سب کے حقوق طے ہیں ان کو حق دیا جاتا ہے۔مگر حق ادا کرنے کا طریقہ کار دین اسلام میں اہل مغرب کے طریقے سے مختلف ہے۔ اسلام میں احکام کا نفاذ ہوتا ہے حقوق خود بخود ادا ہوتے رہتے ہیں مثلاً غریبوں کا حق ہے کہ ان کی مدد کی جائے تو اسلام نے امیروں کو حکم دیا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔

زوجہ کے حقوق ہیں تو اسلام نے زوج یعنی مرد کو حکم دیا کہ اس کے حقوق ادا کرو۔

الغرض فقہ میں تمام احکام درج ہیں کہ فلاں بندے پر فلاں چیز لازم ہے فلاں چیز فرض ہے فلاں واجب ہے۔احکام کو نافذ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ حق سب کو مل جاتا ہے اور محبتیں بڑھتی ہیں۔کیونکہ دینے والا اس لیے خوش ہے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کی ہے لینے والا اس لیے خوش ہے کہ حق مل گیا۔اہل مغرب کا طریقہ اس سے مختلف ہے۔وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ہر بندے کو اس کا حق ملنا چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ حق کیسے ملے؟

ان کے پاس لوگوں کو حق دلوانے کی ایک ہی صورت ہے کہ حق کو قانون بنا کر نافذ کیا جائے اور عدالتی سطح پر اس کا نفاذ کروایا جائے۔

احکام وہ نافذ کر ہی نہیں سکتے کیونکہ کسی کی بات کو حکم تسلیم کرنے کیلئے اس کو حاکم جاننا ضروری ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے پھر وہی بتائے گا کہ شر کیا ہے خیر اور اچھائی کیا ہے۔ مگر وہ لوگ اپنے کو بائیبل وقرآن غرض ہر طرح کی مذہبی جکڑ بندی سے آزاد کر چکے ہیں اور خدا اور مذہب کو معاملات میں لانا پسند نہیں کرتے اپنے کو ان سب چیزوں سے آزاد سمجھتے ہیں (مذہبی آزادی کا حق) اس نعرے کا بھی یہی مطلب ہے۔ اگر کوئی فرد مذہب کو مانتا بھی ہے تو ان کو اس وقت تک کوئی اعتراض نہیں جب تک وہ اپنے خدا و مذہب کو معبد اور مندر تک رکھے عبادات کے علاوہ معاملات اور اختلاقیات میں خدا و مذہب کو دخل اندازی کی اجازت نہیں وہ عبادت کی اجازت اس لیے نہیں دیتے ہیں کہ وہ مالک و خالق ہے بلکہ اس لئے عبادت کی اجازت ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو سکون حاصل کرنے کا پورا حق ہے کوئی سکون اے۔سی لگا کر حاصل کرنے کو سمجھتا ہے اور کوئی مزے مزے کے کھانے کھا کر نفس پروری کرتا ہے کوئی عبادت کر کے سکون حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس طرح سکون حاصل کر سکتا ہے۔

بہر حال اپنے سے اعلیٰ اتھارٹی کسی کو سمجھ کر اس کے سامنے سر تسلیم خم ہونے کا فلسفہ ان کے ہاں سراسر باطل و ناحق ہے خواہ وہ عیسائیت میں ہو یا اسلام میں ہو یا ہندوازم اور دیگر مذاہب میں ہو۔ لہٰذا حکم دینے والی کسی ذات کا وجود ان کو تسلیم نہیں جب حاکم کا وجود ہی تسلیم نہیں تو کسی بات کو حکم کیونکر ٹھہرا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ محض اپنی عقل سے حق طے کرتے ہیں کہ فلاں کا فلاں حق ہے اور جب حق کو قانون بنا کر پیش کیا جائے اور عدالتی طور پر نافذ کر دیا جائے اس سے چند حقوق تو اگرچہ مل جائیں مگر محبت و مروت کا جنازہ نکل جائے گا۔

اس مجبوری کی بنا پر وہ نظام حکومت چلانے کیلئے حقوق کو قانونی شکل دیتے ہیں کیونکہ مذہب سے روگردانی کر چکے ہیں حالانکہ قانون بننے کے لائق احکام ہوتے ہیں اور

حقوق کو اخلاقی طور پر حاصل کیا جاتا ہے یا حکم کے نافذ ہونے سے خود بخود مل جاتے ہیں۔

اہل مغرب کی نقل کرتے ہوئے بعض حضرات دین اسلام سے حقوق کی فہرست تیار کرتے ہیں اور انسان کیلئے ایسے ایسے حقوق قرآن وسنت سے ثابت کرتے ہیں جن کا تذکرہ تک کسی امام نے نہیں کیا۔ سلف وخلف میں سے کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ یہ چیزیں بھی اسلام سے ثابت ہوسکتی ہیں۔

دَورِ حاضر میں نئی نئی چیزوں کو اسلام کی طرف منسوب کیا جارہا ہے کہ یہ بھی اسلام سے ثابت ہیں مثلاً:

☆۔ مذہبی آزادی کا حق ☆۔ آزادی اظہار رائے ☆۔ حقوق کی یکسانیت

تعجب ہے کہ کسی فقیہ کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ یہ بھی انسان کا حق ہے اس پر بھی دلائل دینے چاہئے۔ مگر انہی پچاس سالوں میں آخر کیا ضرورت پیش آ گئی ہے کہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی ہے' حقوق کی یکسانیت ہے' اظہار رائے کی آزادی ہے۔

حالانکہ پہلے بھی کسی کو اسلام پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا اور لوگوں کو حق ملتے تھے' ہر بندہ اپنی بات لوگوں کو کہتا تھا تبادلہ خیالات کیے جاتے تھے۔ اگر ان مذکورہ باتوں کا یہی معنی ہے تو ان کی اجازت تو پہلے سے اسلام نے دے رکھی ہے مگر انہی پچاس سالوں میں ان عنوانات پر قلم اٹھائے جانے لگے اور ان کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور شدت سے زور دیا جانے لگا کہ اسلام میں آزادی ہے مساوات ہے۔ حق اظہار رائے ہے......وغیرہ۔

ان کے اثبات کیلئے دلائل قرآن وسنت سے دیئے جاتے ہیں حالانکہ انہی آیات واحادیث پر قدیم مفسرین ومحدثین نے بہت کچھ لکھا مگر ایسا نتیجہ غالباً کسی نے نہیں نکالا جو دورِ حاضر میں بعض حضرات ان نظریات کو ثابت کرکے نکالتے ہیں۔

درحقیقت یہ نظریات اہل مغرب کا اختراع ہیں انہوں نے یہ نظریات انہی ملحدانہ بنیادوں پر کھڑے کیے ہیں جو فلسفہ مغرب کی اساس ہیں یعنی مذاہب کوئی چیز نہیں ہیں اپنی زندگی کے بارے میں ہر بندہ خود مختار ہے کسی غیر یعنی مذہب وغیرہ سے رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے

بلکہ محض عقل سے رہنمائی لی جائے گی کائنات میں سب سے اعلیٰ اور اہم انسان ہے لہٰذا یہ کسی کا پابند نہیں۔اسی روشنی میں انہوں نے نظریات گھڑے ہیں اور پوری دنیا میں انہی نظریات کو پھیلا رہے ہیں۔ یہ کسی مذہب کی ترجمانی نہیں کرتے۔اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ یہ انسانیت پرستی ونفس پروری کی ایک تحریک ہے جس کی طرف اقوام عالم کو بلا رہے ہیں بہرحال ایسی ہی بنیادوں پر ان کے نظریات ہیں۔

چونکہ آج کل غالب قوت ان کو ہی سمجھا جاتا ہے اور ان کی مادی ترقی کو ان کے نظریات کی مرہون منت سمجھا جاتا ہے۔اہل مغرب کا مادی غلبہ ان نظریات کی طرف توجہ دلوانے کا سبب بنتا ہے۔ظاہراً محض الفاظ پر غور کیا جائے اور پس منظر کی طرف دھیان کیے بغیر ان نظریات کو دیکھا جائے تو ان نظریات میں بہت سی اچھی باتیں نظر آتی ہیں مگر جب الفاظ کا طلسم ٹوٹتا ہے اور پس منظر کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو حقیقت حال سمجھ آتی ہے اور ان نظریات کا خبث باطن ظاہر ہو جاتا ہے مگر اہل پاک و ہند سیاسی آزادی کے باوجود بھی غلاموں والی ذہنیت رکھتے ہیں اور مغربی اقوام سے حد درجہ مرعوب ہیں ان کے پھیلائے ہوئے نظریات کے محض الفاظ اور ظاہری معانی سے چند حاصل ہونے والے فوائد کو مدنظر رکھ کر ان کو مسلمہ اصول کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔

بعض حضرات تو دین سے ان نظریات کی توثیق پیش کرنے لگتے ہیں۔

مثلاً: اسلام میں بھی آزادی ہے۔اسلام بھی حقوق مساوی دیتا ہے۔اسلام میں بھی اظہار رائے کا مکمل حق ہے۔ایک حد تک اسلام بلکہ تمام مذاہب ان جزئیات کا حق بندوں کو دیتے ہیں مگر اہل مغرب نے یہ نظریات جس بنیاد پر قائم کیے ہیں اس بنیاد کو سامنے رکھ کر جب اس کی تشریح کی جاتی ہے تو کوئی بھی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔

مثلاً: آزادی اظہار رائے اس کا ایک عام مفہوم ہے کہ ہر بندے کو اپنا مافی الضمیر دوسرے کے سامنے پیش کر سکنے اور خیالات کے تبادلہ سے آپس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا حق ہر مذہب دیتا ہے اس سے کوئی مذہب منع نہیں کرتا۔

تو پھر سوال یہ ہے کہ کونسی اظہار رائے کی آزادی مطلوب ہے؟

مطلق العنانی، یعنی ایک شخص جو بھی رائے قائم کرنا چاہے کرے اور اپنی اس رائے کی تشہیر کرنے کا مکمل حق رکھتا ہے یہ چاہے بزرگ ہستیوں کی آبرو ریزی کرے یا مذاہب کا مذاق اڑائے اور اس استہزاء اور مذاق اڑانے کو اپنا حق سمجھے۔

کچھ حضرات اسلام سے اظہار رائے میں آزادی کے دلائل دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ نعرہ اہل مغرب کی اختراع ہے اور اس کے پیچھے وہی ملحدانہ ذہن ہے اور اس کا اظہار وہ گاہے بگاہے کرتے رہتے ہیں:

☆۔کبھی مذاہب کا مذاق اڑا کر ☆۔اور کبھی انبیاء کی گستاخی کر کے

☆۔اور کبھی بزرگ ترین ہستیوں کے خاکے بنا کر

پھر بھی تعجب ہے کہ ان نظریات کی تاویل کر کے ان کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اسلامی نظریات اور مغربی افکار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غیر اسلامی شقوں کی اسلام کاری

1۔مذہبی آزادی کا حق:

ہیومین رائیٹس کے سترھویں آرٹیکل میں آزادی مذہب کو ثابت کیا گیا ہے اور اس کو انسان کا حق قرار دیا گیا۔ ہر فرد کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادیِ مذہب کا پورا حق حاصل ہے اور اسے مذہب یا عقیدہ تبدیل کرنے اور مذہبی رسمیں ادا کرنے کی پوری آزادی ہو گی......

اس میں صاف لکھا ہے کہ مذہب بدلنا انسان کا حق ہے دن کو مسلمان تو رات کو چاہے عیسائی ہو جائے اس سے اگلے دن ہندو پھر عیسائی الغرض اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ بلا روک ٹوک مرتد ہو سکتے ہو۔ آزادیِ مذہب کا یہی مطلب ہے۔ بعض حضرات یہ نظریہ رکھتے ہیں اور آزادیِ مذہب کے اثبات میں قرآن سے دلیل دیتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ:

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی

(سورۃ بقرہ: آیت نمبر 256)

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے چھانٹ کرر کھ دی گئی ہے۔

2۔ قال اللہ تعالیٰ:

ولو شاء ربک لَاٰمَن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین. (سورۃ یونس: آیت نمبر 99)

ترجمہ: اگر تیرے رب کی مشیت ہوتی کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں تو تمام اہل زمین ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ مومن ہو جائیں۔ (محسن انسانیت اور انسانی حقوق: ص 128)

ان دو آیات سے استدلال کر کے آزادیِ مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان آیات میں صرف اتنی بات ہے کہ ہم نے حق اور باطل کو واضح کر دیا ہے۔ مگر کسی کو حق (اسلام) قبول کرنے پر مجبور نہیں کریں گے لیکن اسلام میں داخل ہونے کے بعد اور اس کی روحانیت سے آشنائی کے بعد اگر کوئی لوٹ کر کوئی بھی دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے تو اس کو اجازت نہ ہوگی بلکہ قید کر کے اس کے اسلام کے بارے میں جملہ اشکالات دور کیے جائیں گے اگر پھر بھی مسلمان نہیں ہوتا تو اس کو قتل کیا جائے گا۔

کمافی الشامیة:

اعلم ان کل مسلم مرتد فانه یقتل ان لم یتب الا المرأة والخنثی ومن اسلامه تبعا والصبی اذا اسلم والمکره علی الا سلام. (الشامیہ: ج 4، ص 248)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اور جمیع فقہاء محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ مرد مرتد کو

سمجھانے کے بعد اگر وہ باز نہیں آتا تو اس کو مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور عورت بچے اور خنثی کو قتل نہ کریں گے مگر قید میں ڈال دیں گے ان کو مجبور کریں گے اس کے مزید تفصیلی احکام کیلئے کتب فقہ کی طرف مراجعت فرمائیں۔ الغرض مسلمانوں کو آزادی سے مذہب تبدیل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک صرف ایک ہی مذہب حق ہے جس کو اللہ نے خود بیان کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ان الدین عند اللہ الا سلام

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک قابل تقلید قابل عمل اور رضا خداوندی حاصل کرنے والا صرف ایک ہی دین ہے وہ ہے دینِ محمد ﷺ جس جماعت کا یہ عقیدہ ہو وہ آزادی مذہب کی بات کیسے کر سکتی ہے۔

نوٹ: آزادی مذہب سے یہ مراد لینا کہ حق اور باطل میں سے ایک کا انتخاب کرنے کی اسلام نے جازت دی ہے یہی آزادی مذہب ہے۔ اس طرح کا مطلب مراد لینا سمجھنے والے کی غلطی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ آزادی مذہب کی اصطلاح ہیومن رائیٹس میں جو استعمال ہوتی ہے وہ ہے دین بدلنے کی آزادی، خیر اور شر کیا ہے یہ طے کرنے کی آزادی۔ اب کوئی آدمی دعویٰ کرے کہ ہیومین رائیٹس میں جو حقوق دیئے گئے ہیں اسلام نے بھی وہ دیئے ہیں پھر ہر ایک کو لیکر اسلامی جواز کی دلیل پیش کرے اور دعویٰ کرے کہ میں ان الفاظ سے ایک اور معنی لیتا ہوں میری مراد ہیومین رائیٹس والا معنی نہیں ہے میری منشأ اور ہے تو کہا جائے گا کہ آپ کی یہ بحث فضول ہے کیونکہ کلام کی مراد متکلم ہی طے کرتا ہے چنانچہ اہل مغرب برملا طریقے سے ان اصطلاحات کی وضاحت کرتے ہیں ماقبل ابواب میں بحث ہو چکی ہے۔

2۔ اظہار رائے کی آزادی:

شق نمبر 24 کے تحت اقوام متحدہ اعلان کرتی ہے کہ

''ہر فرد کو اظہار رائے کی آزادی ہے''۔

اس آرٹیکل کا اسلامی جواز پڑھنے سے پہلے اس جملے میں چھپے ہوئے کفر والحاد سے

آ گاہی ضروری ہے یہی وہ شق ہے جس کی رو سے اہل مغرب انبیاء کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی توہین کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور مذاہب عالم اور مذہب اسلام کا استہزاء اڑانا اپنا حق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہر فرد کو آزادی ہے کہ وہ رائے قائم کرے وہ رائے اسلام کے حق میں بھی ہوسکتی ہے اور اسلام کے خلاف بھی ہوسکتی ہے جب رائے قائم ہوچکی تو اس کو اس رائے کی تشہیر کا بھی مکمل حق ہے لہذا یہ جو کچھ کہنا چاہے کہہ دے کوئی روکنے والا نہیں ہے یہ لوگ انبیاء کی بے حرمتی کا جواز اس شق سے پیش کرتے ہیں۔

آزادی اظہار رائے کی اسلام کاری:

جناب محمد ثانی صاحب اپنی کتاب آزادی اظہار رائے کا حق ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اقتباس:

قرآن کریم کی سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر 38 میں فرمایا کہ:

وہ اپنے معاملات آپس میں مشورے سے چلاتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 159 میں ہے:

(اے پیغمبر) ان کے قصور معاف کردو ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کرو...... (محسن انسانیت اور انسانی حقوق ص 120)

یہ آیات حقیقت میں مشورہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اس کو حق اظہار رائے کیلئے پیش کررہے ہیں۔

مشورہ اور حق اظہار رائے میں آزادی:

مشورہ کرنا سنت ہے جس میں ترتیب یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی کسی معاملے میں اپنے ساتھیوں سے رائے طلب کرتا ہے وہ ساتھی مشورہ لینے والے کو اپنی معلومات کے مطابق اس کام کے نفع ونقصان سے آگاہ کردیتے ہیں یا اپنی سمجھ کے مطابق جو ان کو اچھا لگتا ہے اس کا اظہار

کردیتے ہیں۔غرضیکہ یہ سارا معاملہ اور رائے پیش کرنا مشورہ لینے والے کیلئے ہوتا ہے۔

جبکہ اظہار رائے میں آزادی کا مطلب یہ ہے کہ جو جی میں آئے خیال قائم کرے پھر اس کی ترویج کرے اس کے ضمن میں اگرچہ مشورہ بھی آجاتا ہے مگر اظہار رائے میں آزادی کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ اظہار رائے کی آڑ میں بزرگ ہستیوں کے خلاف زبان درازی کی جائے' جو جی میں آئے کہتے چلے جاؤ۔

جس پاکیزہ ہستی کی چاہیں آبروریزی کریں اظہار رائے کی تشریح میں یہ سب کچھ آتا ہے اسلام میں اس کی گنجائش نہیں اسلام کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ سرتسلیم خم کرلینا چھوٹے سے چھوٹے کام میں شریعت کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے مطلق آزادی کسی چیز میں نہیں ہے لہٰذا قرآن کی آیات سے آزادی اظہار رائے کا جواز تلاش کرنا صحیح نہیں۔

3۔انسانی مساوات کا حق:

اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو مٹی سے پیدا کیا ہے سب انسان عبد ہونے میں مساوی ہیں اور قانون کے نفاذ میں سب مساوی ہیں لیکن یوں کہنا کہ سب کیلئے ایک جیسا قانون بنایا گیا ہے' سب کے لئے ایک جیسے احکام ہیں' مرد' عورت احکام ومسائل میں مساوی ہیں یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ شق نمبر 16 میں درج ہے۔

شق نمبر 16:

بالغ مردوں عورتوں کو بلا امتیاز نسل مذہب اور قومیت کے شادی کرنے ازدواجی زندگی گزارنے اور نکاح فسخ کرنے میں برابر کا حق حاصل ہوگا............۔(ص:210)

آیت کا ترجمہ:

کسی مومن مرد اور کسی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملہ میں فیصلہ کردے تو پھر اسے اپنے معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔

یہ مذکورہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی اکرم ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید کے لئے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش

سے نکاح کا پیغام دیا تھا حضرت زینب کو اپنے نسلی اور خاندانی فخر کے باوجود اس حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا اور اس طرح نسلی امتیاز کے بت کو توڑ کر نسل انسانی میں مساوات کا بہترین عملی نمونہ کاشانہ نبوت سے سماج کے سامنے پیش کیا گیا۔

اس عبارت سے ڈاکٹر صاحب انسانوں میں مساوات ثابت کرر ہے ہیں اس درجہ تک تو بات بالکل درست ہے کہ نسلی امتیاز اور قومی تشخص کی بناء پر کسی کو ترجیح نہ دی جائے گی اس حد تک بات سو فیصد صحیح ہے مگر جب عنوان قائم کیا گیا مثلاً انسانی مساوات۔ انسانوں میں تو مرد بھی ہے عورت بھی لہٰذا یہ دونوں برابر کے حق دار ہوں گے جیسا کہ اہل مغرب کا نظریہ ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق ان الفاظ کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ مغرب حق اور باطل کو خلط ملط کر کے پیش کرتا ہے اگر کلی طور پر رد کیا جائے پھر بھی غلط ہے اگر اثبات کیا جائے پھر بھی غلط ہے۔لہٰذا توضیح کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی مساوات کا عرف عام میں اور اہل مغرب کی اصطلاح اور رائج الوقت مفہوم یہ ہے کہ مرد وعورت یکساں حق کے حامل ہیں ان کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔

جو شخص مساوات انسانی پر دلیل دے گا وہ بھی اسی نظریے کی توثیق پیش کرتا ہے۔

حالانکہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق مساوی نہیں ہیں اسلام میں عدل ہے۔ مساوات عدل کی ایک صورت ہے اس لئے مساوات کو قدر واہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وگرنہ کلی طور پر مساوات والا قانون کہ ہر ایک کا مختلف الجنس ہونے کے باوجود حصہ برابر ہے یہ قانون میں نقص کی دلیل ہے۔اسلام قانون سازی میں انسانی مساوات کا ہرگز حامی نہیں ہے۔

اسلام میں مرد وعورت کی میراث میں فرق ہے جیسے قرآن میں اللہ جل شانہ نے فرمایا:

قال اللہ تعالیٰ:

للذكر مثل حظِ الا نثيين. (سورۃ النساء)

مرد کیلئے حصہ دو عورتوں کے حصوں کے برابر ہے۔

اسی طرح مرد وعورت کی دیت میں فرق ہے طلاق کا حق صرف مرد کو ہے عورت کو

نہیں بعض مسائل میں عورت کے ساتھ نرمی ہے مثلاً ارتداد کرنے کی صورت میں مرد کو قتل کیا جاتا ہے اور عورت کو فقط عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔

کمافی الشامیہ:

اعلم ان کل مسلم مرتدفانه يقتل ان لم يتب الا المرأة والخنثى ومن اسلامه تبعاً والصبى اذااسلم والمكره على الا سلام (الشامیہ: ج4، ص245)

اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر مرد مرتد ہو جائے تو اس کو قتل کیا جائے گا الا یہ کہ وہ توبہ کرے مگر عورت کو اور خنثیٰ کو قتل نہ کریں گے بلکہ ان کو اسلام پر مجبور کیا جائے گا ان کو قید میں ڈال دیا جائے گا۔عورت کے رہنے کیلئے گھر اور گھریلو اخراجات مرد کے ذمہ ہیں ظاہر ہے جب ذمہ داریاں زیادہ ہوں گی تو حقوق بھی زیادہ ہوں گے۔اسی طرح عبادات سے لیکر معاملات تک بے شمار مسائل ایسے ہیں جو مرد وعورت کے درمیان مختلف ہیں۔مغربی نظریہ مساوات سے متأثر ہو کر مساوات کلی کا دعویٰ کرنا اور ہر چیز کو اسی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کرنا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ انسانوں میں کلی مساوات ہرگز نہیں ہے مذہب کی بنیاد پر مسائل میں فرق ہوگا اسی طرح مرد وعورت ہونے کی حیثیت سے فرق ہوگا۔جبکہ اہل مغرب کے نزدیک مساوات انسانیت کی بنیاد پر ہے جو بھی انسان ہے وہ برابر ہیں خواہ مذہب جو بھی ہو مرد ہو یا عورت ہو۔

اس لئے انسانی مساوات کو اسلام سے ثابت کرنا صحیح نہیں کیونکہ اسلام میں مساوات انسانیت کی بنیاد پر نہیں ہے۔اور نہ ہی قانون سازی میں مساوات کو بنیاد بنایا گیا ہے بلکہ قانون کو نافذ کرنے میں مساوات ہے۔اسلامی قوانین میں عدل ہے کیونکہ وہ قوانین عادل جل جلالہ نے تیار کیے ہیں اور یہ ضابطہ حیات نقص سے پاک ہے کیونکہ کس انسان کا کیا حق ہے یہ وہ طے کر سکتا ہے جو مکمل طور پر حالات اور بندوں کی طبیعت اور صلاحیت کو جانتا ہو پھر جاننے کے بعد ان کی صلاحیت کو مدنظر رکھ کر ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالے اور پھر جس کی جس قدر ذمہ داریاں ہوں گی حقوق بھی اس قدر ہوں گے۔انسانوں کی صلاحیت اور طبیعت کو سب سے زیادہ جاننے والے

اللہ جل شانہ ہیں وہ طے فرمائیں گے کہ اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور کیا حقوق ہیں۔

عام طور پر اسلام پر یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں آدھا حصہ ملتا ہے اور جزئیات کو لیکر اعتراضات کیے جاتے ہیں حالانکہ جب تک کسی قانون کی جمیع جزئیات آپ کے سامنے نہیں ہیں تو اس قانون کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام نے جس طرح بہت سے حقوق میں عورت کو پیچھے رکھا ہے اسی طرح بہت سی ذمہ داریوں سے بھی بچایا ہے۔ عام طور پر اعتراض کرنے والا ایک پہلو کو دیکھتا ہے۔ کئی معاملات میں عورت اور مرد کو برابر حق دے دیا جاتا ہے اور کئی معاملات میں عورت کے لیے مردوں سے زیادہ سہولت والا قانون ہوتا ہے مثلاً ایک انسان کی بنیادی ضروریات میں تین چیزیں اہم ہیں:

رہنے کے لئے (مکان) پہننے کے لئے (کپڑے) کھانے کیلئے (روٹی)۔

اسلام نے ان تینوں چیزوں سے عورت کو بے نیاز کر دیا بلکہ مرد کے ذمہ لگایا کہ تمہاری ذمہ داری ہے اس کو رہنے کیلئے مکان، پہننے کے لئے کپڑا، کھانے کے لئے خوراک دو۔ عورت کا نان نفقہ یعنی مکمل ضروری اخراجات مرد کے ذمہ ہیں۔ اگر مساوات کو پیمانہ بنایا جائے تو نہ صرف حقوق میں برابری ہوگی بلکہ ذمہ داریوں میں بھی برابری ہوگی۔ جیسا کہ مغرب میں آجکل ہو رہا ہے جس کی بدولت عورت اپنے مقام کو کھو بیٹھی ہے اور خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔

حقوق کی یکسانیت

ایک شق میں تمام انسانوں کے حقوق یکساں شمار کیے ہیں کہ مرد عورت، نکاح کرنے میں فسخ کرنے میں برابر ہیں کسی کو مذہب، قوم یا نسل کی وجہ سے امتیازی حق نہ دیا جائے گا۔

اس تصور کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔

کیونکہ حقوق کا مساوی ہونا کمال نہیں ہے بلکہ حقوق کے نفاذ میں مساوات قابل محمود ہے۔ حقوق میں مساوات کا مطلب ہے کہ کافر و مسلم سب برابر ہیں مرد

عورت حقوق میں یکساں ہیں۔ اسلام میں ہر ایک کے حقوق الگ الگ ہیں ہر ایک کے حفظ مراتب کا لحاظ رکھا ہے حقوق مساوی نہیں ہیں بلکہ طے شدہ کم زیادہ حقوق کے نفاذ میں مساوات کو لازمی قرار دیا ہے کہ جو حق جس کا طے ہے وہ حق بلا امتیاز اس کو دیا جائے نہ یہ کہ جس کے تعلقات ہیں وہ تو لے جائے اور دوسرے کھڑے دیکھتے رہیں۔

جمہوریت کیا ہے؟

جمہوری نظام کی اسلام میں گنجائش ہے یا نہیں اس بات کا فیصلہ کرنے سے قبل یہ دیکھنا ہوگا کہ جمہوریت کس کو کہتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟ جمہوریت کن بنیادوں پر قائم کی جاتی ہے۔

جمہوریت کیا ہے اس کے بارے میں جاننے کیلئے ہمارے سامنے دو طرح کے افراد ہیں۔

نمبر 1: وہ لوگ جنہوں نے اس نظام کو تیار کیا ہے اور اس نظام کو ایک عالمی نظام کے طور پر پیش کیا ہے۔

نمبر 2: وہ افراد جنہوں نے غلام ہونے کی حیثیت سے اس نظام کو قبول کیا اور اس کی چند انتظامی خوبیاں دیکھ کر مداحین کی صف میں شامل ہو گئے۔

اصول یہ ہے کہ اصطلاح قائم کرنے والا گروہ ہی حق دار ہوتا ہے کہ بتائے میری مراد اس اصطلاح سے یہ ہے اسی طرح کسی نظام کو متعارف کروانے والا ہی اس نظام کی اصل حقیقت سے آگاہ کر سکتا ہے اور اس نظام کی بنیادوں کے بارے میں اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ اور ان اصولوں پر روشنی ڈال سکتا ہے جن کو سامنے رکھ کر اس نے نظام تیار کیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی وہی تشریح بیان کریں گے جو اہل مغرب کے مفکرین نے بیان کی ہے۔

ان کی نظر میں ایک انسان کی حیثیت کیا ہے؟

قدرت نے انسان کو عقل دی ہے یہ اپنے معاملات میں بالکل مطلق العنان ہے یہ کسی سے رہنمائی حاصل کرنے کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی رہنمائی کیلئے عقل کافی ہے وحی، خدا، رسول سے رہنمائی حاصل کرنے کا فلسفہ سراسر لغو ہے۔ اس نے دنیا میں کیسے رہنا ہے کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟ کیا کھانا ہے کیا پہننا ہے؟ کیسے پہننا ہے؟ یہ آزاد ہے اپنی عقل سے

طے کرے گا جو دل میں آئے کرے۔ انسان اپنے علاوہ کسی خارجی طاقت کے سامنے جواب دہ نہیں نہ ہی یہ کسی خارجی طاقت خدا/رسول کا پابند ہے یعنی کہ یہ مکمل آزاد ہے۔ انسان کی ایک خصوصیت یہ ٹھہری کہ یہ آزاد ہے دوسری حیثیت انسان کی یہ ہے کہ سب برابر ہیں۔

کیونکہ عقل سب کو دی گئی ہے لہٰذا سب انسان برابر ہیں مرد ہو، عورت ہو، مسلمان ہو یا کافر ہو۔

جمہوریت کی بنیاد:

جمہوریت کی بنیاد انہی دو نظریوں پر ہے کہ ہر شخص آزاد ہے اور سب کے سب انسان برابر ہیں عالم و جاہل، مسلم و کافر، مرد و عورت سب برابر ہیں حقوق میں بھی ذمہ داریوں میں بھی۔

لہٰذا ووٹ کا حق سب کو برابر ہوگا مسلم ہو یا کافر مرد ہو یا عورت عالم ہو یا جاہل۔

چونکہ انسان آج ترقی کی معراج پر جا چکا ہے اس نے اپنی عقل سے سمندروں، ہواؤں، کوہساروں اور جنگلوں کو مسخر کر لیا ہے۔ یہ اپنے علاوہ کسی خارجی طاقت کا قائل نہیں ہے خارجی طاقت خواہ دیوتا ہو یا خدا مذہبی افکار کو پرانے لوگوں کی باتیں تصور کیا جاتا ہے۔ اچھا کیا ہے برا کیا ہے خود انسان طے کرے گا اس نے زندگی کیسے گزارنی ہے یہ خود طے کرے گا۔ انفرادی معاملات میں تو انسان آزاد ہے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں جو دل میں آئے کر گزرے لیکن اجتماعی معاملات میں چونکہ اس نے لوگوں کے ساتھ مل کر چلنا ہے اور اجتماعی معاملات کو بھی انسان کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے لہٰذا ایک طریقہ کار ہونا چاہیے کہ قانون وہ بنے جسے انسان چاہیں۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں کی چاہت کے مطابق کیسے بنائیں ہر ایک کی رائے پر تو عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ لوگ اپنے نمائندے بنائیں گے وہ پارلیمنٹ کے نمائندے عوامل کی ترجمانی کریں گے۔ اور عوام کی خواہش کے مطابق قانون تشکیل دیں گے۔

عوام جس چیز کو بھی پسند کریں اور لوگوں کی اکثریت اس چیز کو پسند کر رہی ہو تو وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنے قانون بنوا سکتے ہیں جس سے اس چیز کا حصول آسان ہو جائے گا۔

مثلاً کسی ملک کے لوگ چاہتے ہیں کہ لواطت عام ہونی چاہیے مرد کی مرد سے

شادی کا حق دیا جائے جمہوری نظام میں دیکھا جائے گا کہ اکثر لوگ اس قانون کے موافق ہیں یا مخالف اگر مخالف ہیں تو اس کو قانون نہ بنایا جائے گا اور اگر موافق ہیں تو اس کو قانون کی حیثیت دی جائے گی۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں بلکہ کئی ممالک میں یہ واقعہ پیش آ چکا ہے۔

اس نظام کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ انسان کسی شریعت، رسول وخدا کے احکام کا پابند نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی کیسے گزارنی ہے یہ خود طے کرے گا انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی معاملات میں بھی۔ اجتماعی معاملات میں زندگی گزارنے کا طرزِ عمل طے کرنے کیلئے اور باہمی تعلقات کو بندوں کی چاہت کے مطابق بنانے کیلئے اور خواہشات کے حصول کو آسان بنانے کیلئے ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی جس سے ہر قانون بندوں کی مرضی کے مطابق بن سکے اور انسان اپنی من چاہی زندگی آسانی سے بسر کر سکے لہٰذا اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے اہلِ مغرب نے ایک نظام پیش کیا جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ قانون سازی کا حق' کیا صحیح ہے کیا غلط کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے یعنی ہر طرح کے قانون بنانے کا حق عوام کو دیا جاتا ہے۔

حالانکہ اسلامی تصور میں قانون اللہ تعالیٰ مقرر فرماتے ہیں حکومت صرف نافذ کرتی ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ چلو اہلِ مغرب تو اپنے کو مذہب سے آزاد خیال کرتے ہیں مگر ہم تو مسلمان ہیں اس نظام سے مدد لیکر اسلامی قانون نافذ کر سکتے ہیں وہ اس طرح کہ اکثر لوگ اس بات پر ووٹ دیتے ہیں کہ ہم تمام ان احکام کو لاگو کرتے ہیں جو شریعت محمدی ﷺ میں آئے ہیں۔

جواب نمبر 1: بیری کے درخت کو کبھی آم نہیں لگا کرتے۔ کفر کو بنیاد بنا کر اسلام کی عمارت قائم نہیں کی جا سکتی۔

جواب نمبر 2: اگر بالفرض اسلامی نظام نافذ بھی ہو جائے تو جس طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی گنجائش ہے اسی طرح قانوناً جمہوریت کے ہوتے ہوئے عدمِ نفاذ کی بھی اتنی ہی گنجائش ہوگی۔

اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ اس طریقے سے اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا کیونکہ جمہوریت کی بنیاد دو چیزوں پر ہے آزادی اور مساوات۔ ہر ایسا قانون جو آپ جمہوریت کی

رو سے پاس کروانا چاہتے ہیں اس میں کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہئے جو آزادی کے منافی ہو یا مساوات کے خلاف ہو۔

اقوام متحدہ کے ممبر ممالک ایک عالمی منشور کے پابند ہیں تمام ممالک کیلئے اپنی قانون سازی میں اس منشور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔اس منشور کی بیشتر شقیں اسلام کے خلاف ہیں جن کی تفصیل ماقبل ابواب میں گزر چکی ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور جمہوریت میں بنیادی فرق:

جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہے سپر اتھارٹی عوام کو حاصل ہے (من حیث المجموع) عوام مل کر جس چیز کو چاہیں جائز قرار دیں جس کو چاہیں ناجائز قرار دیں۔جو چاہیں قانون بنالیں۔

جبکہ اسلام میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ خدا ہے سپر اتھارٹی اللہ ہے۔صحیح کیا ہے غلط کیا ہے عوام یا پارلیمنٹ کے نمائندے طے نہیں کریں گے بلکہ اللہ جل شانہ طے کریں گے حکومت صرف نافذ کرے گی۔

مثال: طاقت کا سرچشمہ عوام ہے یا خدا قانون عوام کے کہنے سے بنے گا یا خدا کے حکم سے اس کی وضاحت کیلئے ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

مسلمان کسی غیر مسلم شخص کو اپنا خلیفہ مقرر نہیں کر سکتے کیونکہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی %51 مسلمان تو کیا %80 بھی مل کر اس کو اپنا خلیفہ بنانا چاہیں تو یہ مسلمانوں کا خلیفہ نہ بنے گا کیونکہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ خلیفہ مسلمان ہونا چاہیے۔کافر خلیفہ اس لیے نہیں بن سکتا کہ سپر اتھارٹی نے اس کو قبول نہیں کیا۔

جبکہ جمہوری نظام میں طاقت کا سرچشمہ سپر اتھارٹی عوام ہے اگر %51 مسلمان مل کر کسی کافر کو اپنا امیر مقرر کر لیتے ہیں تو جمہوری نظام کی بدولت وہ ان کا حاکم بن جائے گا۔کیونکہ اس نظام میں سپر اتھارٹی عوام ہے جس کو چاہے امیر مقرر کرے۔

جب طاقت کا سرچشمہ عوام ہے تو قانون کیا ہوگا۔کس کو کیا سزا دینی ہے کتنی دینی ہے یعنی قانون بنانے کا کام عوام کرے گی جس کی شکل یہ ہوگی کہ یہ اپنے نمائندوں کو

پارلیمنٹ بھیجیں گے وہ قانون سازی کریں گے۔عوامی رائے کے ساتھ۔

جبکہ اسلام میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں ہے بلکہ سپر اتھارٹی خدا ہے وہ ہی قانون مقرر کرے گا۔ وہ ہی بتائے گا کس کی کیا ذمہ داریاں ہیں کس کے کیا حقوق ہیں۔فقہ اسلامی کو خدائی قانون کی مرتب شدہ شکل کہا جاسکتا ہے۔کس کے لیے کیا حکم ہے مرتب انداز میں درج ہے سینکڑوں سال مسلمان اس قانون پر عمل کرتے رہے ہیں۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ جمہوریت میں ایک انسان/فرد کی حیثیت یہ ہے کہ قدرت نے اسے عقل ودیعت کی ہے اگر یہ عقل کے پالینے کے بعد پھر بھی کسی خارجی طاقت' خدا' رسول' قرآن یا کسی اور ذریعہ سے اپنی زندگی کے بارے میں کمانڈ حاصل کرتا ہے۔کسی اور سے اپنے رہنے کے اصول طے کرتا ہے تو یہ بڑی شرم کی بات ہے۔اس کو ان چیزوں سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ خود طے کرے گا کہ اس نے کیسے رہنا ہے۔عوام کی اجتماعی رائے سے قانون بنانے کے طریقے کو جمہوریت کہتے ہیں یا یوں کہیں کہ اجتماعی معاملات میں انسان کی چاہت کے مطابق طریقہ زندگی طے کرنے کا نظام ہے اسی عوامی رائے کو حاصل کرنے کیلئے ووٹ لیے جاتے ہیں پارلیمنٹ بنائی جاتی ہے ووٹ کا حق مرد و عورت، مسلم و کافر، یہودی و عیسائی، عالم و جاہل سب کو برابر ملے گا۔کیونکہ عقل کی وجہ سے مرد و عورت مسلم و کافر سب برابر ہیں۔

بعض حضرات کو محض ووٹنگ کا نظام دیکھ کر اور پارلیمنٹ کی ترتیب دیکھ کر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ نام انہوں نے اسلام سے لیا ہے کچھ حضرات تو باقاعدہ دلائل بھی دیتے ہیں کہ اسلام میں اس نظام کا تصور موجود ہے۔

جمہوریت کے متعلق بنیادی باتوں کی وضاحت کے بعد میں ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ جمہوری نظام کے حامی حضرات کے دلائل کو ذکر کر کے ان کا ردّ کیا جائے۔

ان بنیادوں کو سامنے رکھ کر جب اس نظام کی طرف دیکھا جائے تو بغیر کسی الجھن کے یہ سارا سسٹم سمجھ میں آجائے گا۔حق کو باطل سے الگ کرنے میں مدد ملے گی۔بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جمہوریت میں اصل مسئلہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس میں حاکمِ مطلق

خدا کی بجائے عوام کو تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے یہ اسلامی نہیں ہے لہٰذا ہم طے کر لیتے ہیں کہ حاکم مطلق اللہ ہی ہے عوام نہیں ہے اب تو کفر یہ تخم کی ہی بیخ کنی ہو گئی لہٰذا اس کو اسلامی جمہوریت تسلیم کیا جانا چاہے۔ میں کہتا ہوں یہ صرف اپنے آپ کو مطمئن کرنے کیلئے باتیں ہی ہیں وگرنہ اپنے انجام وحقیقت کے اعتبار سے اس سسٹم میں عملاً حاکمیتِ مطلق عوام ہی کی رہتی ہے کیونکہ عملی طور پر مرکزی اختلاف جمہوریت اور اسلامی طرزِ حکومت میں اس بات کا ہوتا ہے کہ اسلامی طرزِ حکومت میں خیر (حکمِ خدا) کو نافذ کیا جاتا ہے جس سے حقوق خود بخود ادا ہو جاتے ہیں جبکہ جمہوریت میں عملاً ہر آدمی خیر کی تخلیق وتفسیر کا حق رکھتا ہے نتیجتاً کوئی چیز خیر نہیں رہتی اور سیاست کا نظام حقوق کی بنیاد پر چلتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جمہوریت میں عملاً حقوق کو نافذ کیا جاتا ہے خیر کو نافذ نہیں کیا جاسکتا جب کہ اسلامی حکومت میں خیر (احکام) کو نافذ کیا جائے گا۔

خیر (احکام) کی بجائے حقوق کی سیاست:

جمہوری عمل کے اندر جس جدوجہد کی گنجائش ممکن ہے وہ حقوق کی جدوجہد ہے نہ کہ خیر کی اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی انقلابی جماعتیں جب جمہوری عمل میں شامل ہوتی ہیں تو ان کی سیاست بھی دیگر لادینی جماعتوں کی مانند تدریجاً، حقوق کی سیاست، پر منتج ہو جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذرا وضاحت طلب اور پیچیدہ ہے لہٰذا ہم ایک ایک کر کے تمام عقدوں کو کھولنے کی کوشش کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا اسلامی محاکمہ بھی کرتے رہیں گے۔ جمہوری سیاست کی فضا میں کسی خیر کی دعوت ایک مہمل شے بن کر رہ جاتی ہے کیونکہ جیسا کہ بتایا گیا ہے جمہوری سیاست بنیادی طور پر ہر فرد کا حق تسلیم کرتی ہے کہ اسے اپنے تصور خیر کے تعین کا مساوی حق حاصل ہے نیز کسی ایک تصورِ خیر کو کسی دوسرے تصورِ خیر پر کوئی اقداری برتری حاصل نہیں۔ اسلامی تعلیمات وتصورات کو مغربی تناظر میں پہچاننا مسلم مفکرین کی سب سے سخت غلطی ہے۔ ان غلطیوں میں سے ایک بنیادی اور اہم ترین غلطی حقوق العباد کو ہیومن رائٹس کے تناظر میں سمجھنا ہے۔ عام طور پر ہیومن رائٹس کا ترجمہ غلط طور پر 'انسانی حقوق' کر کے نہ صرف انہیں حقوق العباد کے ہم معنیٰ متصور کر لیا جاتا ہے بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے کہ ہیومن

رائٹس سب سے پہلے اسلام نے دنیا کو عطا کیے نیز خطبہ حجۃ الوداع میں حضور پر نور ﷺ نے انہی حقوق کی تعلیمات دی تھیں (نعوذ باللہ) ان دونوں کا فرق ایک آسان مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کریں ایک دستوری جمہوری ریاست کے دو مرد آپس میں میاں بیوی بن کر رہنا چاہتے ہیں ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہیں ایسا کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ اگر اس سوال کا جواب کسی مذہب (اسلام، عیسائیت وغیرہ) کے عالم سے پوچھا جائے تو وہ اس کا جواب ارادۂ خداوندی سے ظاہر ہونے والے خیر یعنی اللہ کی کتاب کی روشنی میں دے گا۔

مثلاً ایک مسلمان عالم یہ کہے گا کہ چونکہ قرآن یا سنت میں اس کی ممانعت ہے لہٰذا کسی بھی فرد کو ایسا کرنے کا 'حق' حاصل نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ شخص جو 'ہیومن رائٹس' کو اعلیٰ ترین قانون مانتا ہو اس فعل کو اس دلیل کی بنا پر جائز قرار دے گا کہ چونکہ ہر شخص کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی خوشی کا سامان اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہے مہیا کر لے، لہٰذا اگر دو مرد آپس میں شادی کر کے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جس کی بنیاد پر مغربی دنیا میں دو مردوں کی شادی، زنا بالرضا، اغلام بازی وغیرہ کو قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے۔ ایک دستوری جمہوری ریاست میں افراد کے پاس ہمیشہ یہ حق محفوظ ہوتا ہے کہ وہ ارادۂ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر ہیومن رائٹس کی آڑ میں عملِ لواطت کا جواز حاصل کر لیں۔ اس مثال سے واضح ہو جانا چاہیے کہ 'حقوق العباد' کا جواز اور اس کی ترتیب ارادۂ خداوندی سے طے ہوتی ہے یعنی ایک انسان (عبد) کو کسی عمل کے حق ہونے یا نہ ہونے کا علم اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت سے ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں ہیومن رائٹس کا جواز آزادی یا انسانی خواہشات ہوتی ہیں۔ چنانچہ بحیثیتِ مسلمان نہ تو ہم یہ مانتے ہیں کہ انسان آزاد ہے، بلکہ وہ عبد ہے، اور نہ ہی اس کے کسی ایسے ماورائے اسلام حق کو مانتے ہیں جس کا جواز ارادۂ خداوندی سے باہر ہو اور جس کے مطابق اسے اپنی خواہشات کی ترجیحات طے کرنے اور انہیں حاصل کرنے کا اخلاقی اور قانونی حق حاصل ہو، بلکہ اس کا حق بس اتنا ہی ہے جو اس کے خالق نے اسے اپنے نبی کے ذریعے بتا دیا اس کے علاوہ وہ جو بھی فعل سر انجام دے گا نافرمانی اور

ظلم کے زمرے میں شمار ہوگا اور جسے ختم کر دینا ہی 'عدل' کا تقاضا ہے۔ انسان کا کوئی ایسا ذاتی حق ہے ہی نہیں کہ جس کا جواز خود اس کی اپنی ذات ہو، چہ جائیکہ وہ حق نا قابلِ تنسیخ بھی ہو۔ ہیومن رائٹس کی بالا دستی ماننے کا مطلب ہی انسان کے حق کو خیر پر فوقیت دینا اور اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ انسان اپنا حاکم خود ہے نیز 'خیر و شر' کا معیار خواہشاتِ انسانی ہیں نہ کہ ارادۂ خداوندی۔

اس بحث سے تحریکاتِ اسلامی اور علماء کرام کی اس حکمتِ عملی کی غلطی خوب واضح ہو جانی چاہیے جسے انہوں نے دستوری حقوق کے تناظر میں تحفظِ اسلام کے لیے اپنا رکھا ہے۔ جب کبھی حکومتی مشینری یا بیرونِ ملک ریاستیں و ادارے تعلیمات و اظہارِ اسلام کے خلاف کوئی حکمت عملی اپناتے ہیں تو اس کی مخالفت مسلمانوں کے حق کے نام پر کی جاتی ہے، مثلاً فرض کریں اگر کوئی حکومت مسلم عورتوں کے اسکارف پہننے پر پابندی لگا دے تو کہا جاتا ہے کہ ایسا کرنا تو مسلمان عورتوں کا حق ہے اور ہیومن رائٹس اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اگر یہ حکمتِ عملی مغلوبی حالت کی بجائے کسی علمی دلیل کی بنا پر اپنائی گئی ہے تو پھر یاد رہے کہ اظہارِ اسلام کو 'خیر مطلق' (absolute good) کی بجائے ہیومن رائٹس کی پناہ میں بطور 'ایک حق' کے پیش کرنا درحقیقت یہ نہ صرف اسلام کے نظامِ زندگی ہونے بلکہ اس کے خیرِ مطلق ہونے کا بھی انکار ہے۔ کیونکہ اگر اظہارِ اسلام محض ایک فرد کا حق ہے تو پھر دوسرے افراد کے اپنے اظہارِ خیر کے حق کو بھی لازماً ماننا پڑے گا۔ اسلامیت بطورِ حق ماننے کے بعد امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سرے سے جواز باقی ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ تعینِ خیر کو فرد کا حق سمجھنا اظہارِ ذات کے تمام طریقوں کو برابر ماننے کے مترادف ہے۔ اس حکمتِ عملی کے نتیجے میں ہم اسلام کو ایک غالب خیر مطلق کی بجائے کثیر الانواع تصوراتِ خیر میں سے ایک تصورِ خیر کے طور پر محفوظ کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں اور بالآخر اسلام کو سرمایہ داری کے اندر سمو دینے کا باعث بنتے ہیں۔ 'اسلامیت کا ایک حق' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام بہت سے نظام ہائے زندگی میں سے ایک ہے اور یہ تمام نظام ایک مشترکہ عالمی نظام کا حصہ ہیں اور یہ عالمی نظام سرمایہ داری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ تضاد ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک طرف تو اسلامی تحریکات ریاست اسلام کے غلبے کے لیے حاصل کرنا چاہتی

ہیں لیکن ساتھ ہی وہ ہیومن رائٹس کو بھی مانتی ہیں جس کا اوّلین تقاضا ہی یہ ہے کہ ریاست خیر کے معاملے میں غیر جانبدار رہے، فیاللعجب۔

یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہیومن رائٹس درحقیقت حقوق العباد کی ضد ہیں کیونکہ موخر الذکر رو یہ انسان کو عبد اور اوّل الذکر اسے الہٰ گردانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہیومن رائٹس پر مبنی دستوری جدوجہد خیر کو فرد کا نجی مسئلہ بنا دیتی ہے جو سرے سے اسلامی دعوت ہی کی نفی ہے۔ ہیومن رائٹس فلسفے کے مطابق تمام تصوراتِ خیر وشر اور زندگی گزارنے کے تمام طریقے برابر حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا معنی ہے 'نظام ہدایت' کا رد، یعنی اس بات کا انکار کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر وشر بتانے کے لیے ہدایت کا کوئی سلسلہ انبیاء کرام کے ذریعے قائم کیا ہے اور انبیاء کرام کی تعلیمات خیر وشر طے کرنے کا کوئی حتمی معیار ہیں۔ یہ اس لیے کہ نظامِ ہدایت کا معنی ہی یہ ہے کہ تمام انسانوں کی خواہشات کی ترتیب ہرگز مساوی معاشرتی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ شخص جس کی خواہشات کی ترتیب تعلیمات انبیاء کا مظہر ہیں تمام دوسری ترتیبوں پر فوقیت رکھتی ہے، دوسرے لفظوں میں نظامِ ہدایت مساوات کا نہیں بلکہ حفظِ مراتب کا متقاضی ہے جس میں افراد کی درجہ بندی کا معیار تقویٰ ہوتا ہے نیز اسلامی معاشرے وریاست کا مقصد جمہوری معاشرے کی طرح ہر فرد کو اپنی اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے کے مساوی مواقع فراہم کرنا نہیں بلکہ ان کی خواہشات کو نظام ہدایت کے تابع کرنے کا ماحول پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریۂ ریاست میں citizen (ایسی عوام جو اصولاً حاکم اور فیصلہ کرنے والی ہوتی ہے) اور عوامی نمائندگی (Representation of citizens) کا کوئی تصور ہے ہی نہیں کیونکہ یہاں عوام citizen نہیں بلکہ رعایا ہوتی ہے اور خلیفہ عوام کا نمائندہ نہیں ہوتا کہ جس کا مقصد عوام کی خواہشات کے مطابق فیصلے کرنا ہو بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے جس کا مقصد رعایا کی خواہشات کو شریعت کے تابع کرنے کے لیے نظام ہدایت کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جمہوری سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ خیر وشر اور اپنی منزل کا تعین انسان خود طے کرے گا اور ہر شخص کا تصورِ خیر اور زندگی گزارنے کا طریقہ مساوی معاشرتی حیثیت رکھتا ہے اور ریاست کا

مقصد ایسی معاشرتی صف بندی وجود میں لانا ہے جہاں ہر فرد اپنی خواہشات کو ترتیب دینے اور انہیں حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ مکلّف ہوتا چلا جائے۔ اسی معنی میں جو ریاست جتنی زیادہ جمہوری ہوتی ہے اتنی ہی غیر اسلامی کیونکہ جمہوریت میں پیری مریدی کا تعلق الٹ ہو جاتا ہے، یہاں عوام بجائے مرید کے پیر (فیصلہ کرنے اور ہدایت دینے والے) بن جاتے ہیں اور حاکم جس کا کام لوگوں کی رشد و ہدایت کا انتظام کرنا ہوتا ہے اس معنی میں مرید ہو جاتا ہے کہ ہر کام سے پہلے عوام الناس کی خواہشات کی طرف دیکھتا ہے۔ لوگوں نے ووٹ کو بیعت کا متبادل سمجھ لیا ہے حالانکہ ووٹ تو بیعت کی عین ضد ہے۔ بیعت کا مطلب حصول ہدایت کے لیے عوام کا اپنے نفس کو کسی بلند تر ہستی کے سپرد کر دینا ہے جبکہ ووٹ کا معنی عوام کی حکمرانی قبول کر کے حاکم کا خود کو ان کے نفس کے سپرد کر دینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بیعت عوام کی اطاعت (Submission) کا مظہر ہوتا ہے جبکہ ووٹ ان کی حکمرانی (sovereignty) خود مختاری کا مظہر ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ چونکہ ہیومن رائٹس اور جمہوری نظریات (framework) تمام تصوراتِ خیر کو اخلاقاً و قانوناً مساوی گردانتے ہیں لہٰذا جمہوری جدوجہد کا مقصد ایسی ادارتی صف بندی کا انتظام کرنا ہوتا ہے جس کے ذریعے plurality of goods (مختلف الانواع تصوراتِ خیر) کا حصول ممکن ہو سکے اور ایسی فضا میں تحریکاتِ اسلامی کے لیے اصولاً ممکن نہیں رہ جاتا کہ معاشرے میں پنپنے والے کسی بھی ایسے تصورِ خیر کی مخالفت کر سکیں جسے ہیومن رائٹس سے تو تحفظ حاصل ہو لیکن اس کے اظہار سے اسلامی تشخص کی نفی ہو۔ ہیومن رائٹس اور جمہوری فلسفے کے تناظر میں یہ بات ہی مہمل ہوتی ہے کہ میں کسی شخص کے عمل پر اس بنیاد پر تنقید کروں کہ وہ میرے تصورِ خیر سے متصادم ہے۔ مثلاً شہر لاہور میں ہونے والی عورتوں کی حیا باختہ میراتھن ریس کے خلاف جب دینی تحریکوں اور علماء کرام نے احتجاج کیا تو جدیدیت کے دلدادہ صدر مشرف صاحب نے ہیومن رائٹس کی درست ترجمانی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو میراتھن نہیں دیکھنا چاہتے وہ اپنا ٹی وی بند کر لیں، مگر دوسروں پر تنقید کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اس رویے کا خوبصورت نام ٹولرنس (tolerance) ہے (جس کا ترجمہ غلط طور پر 'رواداری' کر لیا گیا ہے) س کا مطلب یہ ہے کہ جب تمام افراد کی

ذاتی خواہشات کی ترتیب اور زندگی گزارنے کے طریقے مساوی ہیں، تو ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسرے کی خواہشات کا احترام کرے اور اسے برداشت کرے۔ آزادی کے اصول پر معاشرتی تشکیل تبھی ممکن ہے جب افراد اظہارِ ذات (freedom of expression) کے تمام طریقوں کو یکساں اہمیت دیں اور انہیں برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں، یعنی ٹولرنس کا مظاہرہ کریں۔ ٹولرنس کے فلسفے کے تحت قائم ہونے والے معاشروں میں کس کس قسم کے اعمال اور اظہارِ ذات کے کن کن ممکنہ طریقوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ چند روز قبل ہونے والے ان دو واقعات سے لگائیں۔ امریکہ میں ایک عورت کو چوبیس گھنٹے میں درجنوں مردوں کے ساتھ 'بدکاری کا عالمی ریکارڈ' بنانے کے اعزاز میں انعام سے نوازا گیا۔ اسی طرح چند ماہ قبل امریکہ میں پانچ ہزار سے زیادہ مردوں اور عورتوں نے مکمل برہنہ حالت میں سڑکوں پر احتجاجی جلوس نکالا، یہ ہے ٹولرنس کا اصل مفہوم (العیاذ باللہ من ذالک)۔ فلسفہ ٹولرنس درحقیقت ایمان کی نفی کے مترادف ہے کیونکہ ٹولرنس کا مطلب ہے کہ میں یہ مان لوں کہ اوّل تو برائی کوئی شے ہی نہیں اور اگر مجھے کوئی عمل اپنے تصورِ خیر کے مطابق برائی نظر آتا بھی ہے تو میں اسے برداشت کروں، نہ یہ کہ اسے روکنے کی فکر اور تدبیر کروں۔ بلکہ جمہوری قدر plurality of goods کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں دوسرے شخص کے ہر عمل کو قدر کی نگاہ سے دیکھوں، اگر وہ اپنی ساری زندگی بندروں کے حالات جمع کرنے پر صرف کر دے تو نہ صرف یہ مانوں کہ ایسا کرنا اس کا حق تھا بلکہ دل کی گہرائیوں سے کہوں کہ 'واہ جناب! کیا ہی عمدہ تحقیقی کام کیا ہے' اسی طرح اس عالمی ریکارڈ یافتہ زانیہ کے 'حق' اور اس کی صلاحیتوں کا معترف ہو جاؤں وغیرہ۔ Plurality of goods پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ میں اسلام کے واحد حق ہونے نیز اس حدیث مبارکہ کا انکار کردوں جس میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا

من رای منکم منکر افلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فا لم یستطع فبقلبہ فذالک اضعف الایمان "تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے روک دے، اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے ایسا کر دے، اگر اس کی استطاعت بھی نہیں رکھتا تو اپنے دل سے ایسا کر دے (تہہ دل سے اسے برا جانے اور اس

بات کا پختہ تہیہ رکھے کہ جب کبھی زبان اور ہاتھ سے اسے روکنے کی استطاعت آجائیگی روک دوں گا) اور یہ (دل سے اسے ایسا کرنا) تو ایمان کا سب سے کمزور ترین درجہ ہے: (مسلم)۔

چنانچہ جمہوری ریاستی تناظر میں اہم شے یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے تصوراتِ خیر کو ممکن (realize) بنانے کا حق حاصل کرنے کا مکلّف ہوتا چلا جائے۔ جمہوری عمل صرف ریاستی سطح پر ہی نہیں بلکہ معاشرتی سطح پر بھی اغراض پر مبنی معاشرہ وجود میں لاتا ہے جسے سول سوسائٹی کہا جاتا ہے۔ اس میں حق کو خیر پر فوقیت ہوتی ہے اور نتیجتاً plurality of goods کے اس ڈھانچے میں ہر فرد اپنے آپ اور دوسروں کو 'مجرد فرد' (historical and social anonymous individual) کے طور پر پہچانتا ہے نہ کہ ماں باپ، بھائی بہن، استاد شاگرد، میاں بیوی، پڑوسی وغیرہ کے طور پر۔ اس فرد کے پاس پہچان (adentity) کی اصل بنیاد ذاتی اغراض ہوتی ہیں، وہ یہ تصور کرتا ہے کہ میری طرح ہر فرد کے کچھ ذاتی مفادات ہیں اور ہمارے تعلقات کی بنیاد اور مقصد اپنے اپنے مفادات (self-interests) کا حصول ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ ایسا فرد جس بنیاد پر تعلقات استوار کرتا ہے وہ اس کی اپنی اغراض (interests) ہوتی ہیں اور انہی اغراض اور حقوق کے تحفظ کی خاطر وہ جدو جہد کرتا ہے۔ چنانچہ اس معاشرت میں ہر شخص اپنے مفادات کے تحفظ و حصول کے لیے اپنی اغراض کی بنیاد پر interest - groups (اغراض پر مبنی گروہ) بناتا ہے، مثلاً محلّہ و مارکیٹ کمیٹیاں، مزدور تنظیمیں، اساتذہ وطلبہ تنظیمیں، سارفین وتاجروں کی یونین، عورتوں اور بچوں کے حقوق کی تنظیمیں ودیگر این جی اوز وغیرہ اور انجمنوں کا قیام اس کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں جہاں تعلقات کی بنیاد صلہ رحمی یا محبت نہیں بلکہ ان کی اغراض ہوتی ہیں۔ ذاتی اغراض کی ذہنیت (rationality) درحقیقت محبت کی نفی ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشروں میں افراد ایک دوسرے سے صرف اسی وقت اور اتنا ہی تعلق قائم کرتے ہیں جس سے ان کی اپنی اغراض پوری ہوتی ہوں۔ مثلاً ایک مذہبی معاشرے میں استاد کا تعلق اپنے شاگرد سے باپ اور مربی کا سا ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ سوسائٹی میں یہ تعلق ڈیمانڈ راور سپلائیر (Demander and Supplier) کا ہوتا ہے یعنی استاد محض ایک خاص قسم کی خدمت مہیا کرنے والا جبکہ طالب علم زر کی

ایک مقررہ مقدار کے عوض اس خدمت کا طلب گار ہوتا ہے اور بس۔ شاگرد سے فیس لینے کے علاوہ استاد کی اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور یہی حال شاگرد کا ہوتا ہے۔ ہر وہ تعلق جس کی بنیاد طلب و رسد (Demand and saupply) اور زر (money and finance) کی بنیاد پر استوار نہ ہو سرمایہ دارانہ معاشرے میں لا یعنی مہمل، بے قدر و قیمت اور غیر عقلی (irrational) ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معیارِ عقلیت کے مطابق عقل مندی (Rationality) اسی کا نام ہے کہ آپ ذاتی غرض کی بنیاد پر تعلق قائم کریں۔ تمام سوشل سائنسز اس بات پر زور دیتی ہیں کہ ایک معاشرہ جس میں ہر فرد کو دوسرے فرد سے بس اتنی سی دلچسپی ہو کہ جتنی اس کی اپنی غرض پوری کرنے کے لیے ضروری ہے وہی ایک مہذب اور سب سے مناسب ترین معاشرہ ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے کہ ایک آزادی پسند شخص محض غرض ہی کی بنیاد پر کسی دوسرے فرد سے تعلق قائم کر سکتا ہے نیز کسی شخص میں اپنی ذاتی غرض سے زیادہ دلچسپی نتیجتاً دوسرے شخص کی آزادی میں مداخلت کا باعث بنتی ہے (اس کی مثال خاندان کے نظام سے سمجھی جا سکتی ہے)۔ جتنے زیادہ افراد ان اداروں پر منحصر ہوتے چلے جاتے ہیں سول سوسائٹی اتنی ہی مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ نتیجتاً ذاتی اغراض، حقوق کی ذہنیت و سیاست پختہ ہوتی چلی جاتی ہے جو لبرل سرمایہ دارانہ نظام کا اصل مقصد ہے۔ افراد کی اغراض و حقوق ہی جمہوری سیاسی عمل یعنی نمائندگی کی اصل بنیاد ہیں، یہی وہ پیمانہ ہے جس پر ریاست و جمہور کے تعلق کو پرکھا جاتا ہے، حاکم و محکوم کے درمیان یہی رشتہ ہے، قیادت اور عوام کے مابین یہی میثاق وفا ہے۔ جو اسے پورا کرے اس کی حمایت کی جاتی ہے اور جو عوام کی جھولی کو مراعات و سہولیات سے نہ بھر سکے وہ پسندیدہ نہیں ہوتا۔ اسلامی تحریکات جب جمہوری جدوجہد کو اپنا شعار بناتی ہیں تو بالآخر اغراض اور حقوق ہی کی سیاست کرتی دکھائی دیتی ہیں اور ہر ایسا ہتھکنڈا استعمال کرتی ہیں جس کے نتیجے میں انہیں عوامی مقبولیت حاصل ہو جائے چاہے اس کی قیمت انہیں اپنے اصولی مؤقف کی قربانی اور دیگر دینی تحریکات سے اجنبیت کی صورت ہی میں کیوں نہ دینی پڑے۔ چنانچہ ایک طرف تو جمہوری اسلامی تحریکیں غلبۂ دین کا نعرہ لگاتی ہیں جو اس بات کا متقاضی ہے کہ افراد کا تزکیۂ نفس اس حد تک ہو جائے کہ وہ راہِ خداوندی میں دیوانہ وار ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ ہو جائیں، لیکن دوسری طرف

جس بنیاد پر لوگوں سے ووٹ مانگتی ہیں وہ ان کی اغراض اور حقوق کا تحفظ ہے یعنی وہ ان سے کہتی ہیں کہ ہمیں اس لیے ووٹ دو کیونکہ ہم تمہارے مسائل حل کر دیں گے، فیاللعجب۔ کیا حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اس بنیاد پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی کہ اسلام لانے کے بعد تمہیں خوب مزے ملیں گے نیز اسلام تمہارے مسئلے حل کر دے گا؟ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر مسائل حل کرنے کے وعدے پر ووٹ لے کر تحریکاتِ اسلامیہ کس طرح لوگوں سے قربانی دینے کی توقع رکھ سکتی ہیں؟ جمہوری سیاست کبھی جہاد کے لیے برپا کی ہی نہیں جا سکتی کیونکہ اس کا تو مقصد ہی ایسی معاشرت کا قیام ہوتا ہے جس میں آسائشوں کا فروغ اور دنیاوی ترقی و مفادات کا حصول ایک ہدف کے طور پر قبول کر لیے جائیں۔ کون نہیں جانتا کہ انقلابِ اسلامی کا برپا ہونا دنیا کی تمام طاقتوں کو کھلا چیلنج ہے اور دور حاضر میں اسلامی ریاست جہاں بھی قائم ہوگی تو اس پر ابتلاء اور مصائب کا ایک سیلاب امڈ آئے گا جیسا کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت واضح ہے۔ اب اگر ہم لوگوں سے دنیا طلبی کی بنیاد پر تعلقات استوار کرتے رہے، ان سے یہ وعدے کرتے رہے کہ اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی مادی برکات من وسلویٰ کی طرح نازل ہونا شروع ہو جائیں گی غربت کا نام ونشاں مٹ جائے گا، آسائشوں کی فراوانی ہوگی اور جب اسلامی ریاست کو خطروں سے دوچار ہونا پڑے گا تو آخر لوگ کس بنیاد پر قربانی اور جہاد کے لیے تیار ہوں گے؟ اگر حضور ﷺ نے بھی لوگوں کو ان کی اغراض اور حقوق کی طرف دعوت دی ہوتی پھر نہ تو ہجرت حبشہ ومدینہ ہوتی، نہ ہی شعب ابی طالب کے فاقوں کی نوبت آتی اور نہ ہی بدر، احد اور احزاب کی سختیاں برداشت کرنے کی ضرورت پڑتی کیونکہ حقوق کے تحفظ کی ضمانت پر جمع کیا گیا ہجوم کبھی یہ منازل طے نہیں کر پاتا۔ یہ ہے اصل مسئلہ جمہوریت کا۔ کہاں اسوۂ رسول ﷺ جس کی پیروی دنیا کی محبت کو دل سے نکال کر شوقِ شہادت کے جذبے سے سرشار کرتی ہے اور کہاں مسلم معاشروں میں معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی خاطر چلائی جانے والی جمہوری جدوجہد جس میں مادی مفادات 'اصل زندگی' ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عوام الیکشن میں انہی افراد کو ووٹ دیتے ہیں جن سے انہیں یہ امید ہو کہ وہ ان کے 'کام نکال سکیں گے'۔ عوام تو ہمیشہ اغراض ومفادات ہی کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہے اور یہی وجہ ہے

کہ شریعت اسلامی میں احکامات اخذ کرتے وقت مجتہد کے لیے 'عوامی رائے' کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ حقوق کی بالادستی' کا ہی نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً دینی جماعتیں ووٹ لینے کے عمل کے دوران اوراس کے بعد ویسی ہی سیاست کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جو دیگر جماعتوں کا شعار ہے جیسا کہ کراچی کی شہری حکومت اور سرحد کی صوبائی حکومت کے تجربات سے عین واضح ہے۔ جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں آج دینی جماعتوں کے پاس عدلیہ اور فحاشی پھیلانے والے میڈیا کی آزادی، مہنگائی و بے روزگاری کے خاتمے، بجلی وآٹے کے بحران پر قابو اور فوجی آمریت سے چھٹکارے کے علاوہ کوئی سیاسی ایجنڈا سرے سے باقی ہی نہیں رہا اور احیائے اسلام محض ایک کھوکھلا نعرہ بن کر رہ گیا ہے۔ جمہوری دینی قوتوں کے ممبران ٹی وی مباحثوں میں جن باتوں کو اپنی سیاسی فتح کے طور پر بیان کرتے ہیں ان میں سے ایک بھی کام ایسا نہیں ہوتا جس کا غلبۂ اسلام سے دور دور تک کوئی تعلق ہو ۔ ہر سیاسی شکست کے بعد دینی تحریکات اپنی ساری قوت اس بات پر صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں کہ ایسا کیا کیا جائے جس سے اگلے الیکشن میں لوگ ہمیں زیادہ ووٹ دیں۔ جمہوری اسلامی مفکرین کے خیال میں پاکستان کے اصل مسائل فوج کی بے جا مداخلت، شخصی حکمرانی، انصاف کا فقدان، معاشی نا انصافی، غربت، مہنگائی اور بے روزگاری وغیرہ ہیں نہ کہ ترک جہاد، عدم نفاذ شریعت، شعار اسلامی سے عوامی اور حکومتی روگردانی، عریانی وفحاشی کا فروغ، سودی کاروبار، عوام الناس میں دنیاداری اور موت سے غفلت کے رجحانات کا بڑھ جانا وغیرہ۔

خوب یاد رہے کہ جمہوریت کے حصار میں حقوق کی سیاست کے علاوہ ہر دوسری دعوت ایک مہمل بات بن کر رہ جاتی ہے مثلاً آج اگر میں جلسۂ عام میں لوگوں سے کہوں کہ مجھے ووٹ دو کیونکہ میں اسلامی انقلاب برپا کر کے دکھاؤں گے ہاں اس کے بعد خود کو فاقوں اور اپنے بچوں اور کاروبار کی قربانی دینے کے لیے تیار رکھنا اور پھر انہیں یہ آیت سناؤں۔ **ولنبلونکم بشیئٍ من الخوف و الجوع و نقص من الا موال والانفس والثمرات** ۔ یعنی ہم تمھیں ضرور خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصان اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے آزمائیں گے تو یقین مانیے پاکستانی عوام تو کجا میرے اپنے گھر والے بھی مجھے ووٹ نہیں دیں

گے۔اسلامی نظریۂ ریاست عوامی نمائندگی پر نہیں بلکہ تزکیۂ عوام کے تصور پر قائم ہے، یعنی جب تک لوگ تزکیے کے عمل سے نہیں گزریں گے وہ احیاء وغلبۂ اسلام کی جدوجہد میں شریک نہیں ہو سکتے۔اس کے مقابلے میں 'انسانی حق کی خیر پر فوقیت' کا جمہوری فلسفہ تزکیۂ نفس کے رد پر مبنی ہے کیونکہ اس میں یہ بات مفروضے کے طور پر مان لی جاتی ہے کہ لوگوں کی خواہشات جیسے بھی ہیں حق اور خیر کا اظہار ہیں اور ظاہر ہے اس کے بعد تزکیۂ نفس کا سوال اٹھانا ہی بے کار ہے کیونکہ تزکیے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مجھے وہ نہیں چاہنا چاہیے جو میں چاہنا چاہتا ہوں اور 'میری چاہت' اس شے کے مطابق ہونی چاہیے جو مجھے چاہنا چاہیے دوسرے لفظوں میں میری چاہتوں کی ترتیب شارع کی مرضی کا مظہر ہونا چاہیے۔اسلامی مفکرین کی ایک غلط فہمی یہ مفروضہ بھی ہے کہ تزکیۂ نفس کے لیے کسی علیحدہ عمل اور جدوجہد کی ضرورت نہیں بلکہ یہ سیاسی وانقلابی جدوجہد کے نتیجے میں خود بخود (automatically) وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام دینی جماعتوں کے ہاں سیاسی بھاگ دوڑ (political activism)، پروگراموں کی تفصیلات اور فکری لٹریچر وغیرہ تو خوب موجود ہے مگر تزکیۂ نفس کا علیحدہ سے لائحہ عمل سرے سے مفقود ہے ظاہر بات ہے کہ ان کا یہ مفروضہ غلط ہے کیونکہ چاہتوں کی ترتیب میں یہ تبدیلی اور نفسِ امارہ سے نفسِ مطمئنہ تک کا یہ سفر سیاسی بھاگ دوڑ (مثلاً پوسٹر لگانے، ریلیاں نکالنے، دھرنے دینے)اسلامی علمی استعداد بڑھانے (مثلاً مدرسے میں تعلیم حاصل کر لینے یا دینی فکری لٹریچر پڑھ لینے)یا تقریریں سن لینے کے نتیجے میں طلسماتی طور پر خود بخود نہیں آجاتا بلکہ اسی علمیت اور عمل سے گزر کر وقوع پذیر ہوتا ہے جسے صوفیاء کرام علمِ باطن، علمِ لدنی یا علم الاحسان کہتے ہیں اور جسے انہوں نے عملاً کامیابی کے ساتھ برت کر دکھایا۔اسلامی ریاست کے احیاء وانقلاب اسلامی کی جدوجہد درحقیقت علم فقہ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔اور اہل علم خوب جانتے ہیں کہ علم فقہ کا مقصد تزکیہ نفس نہیں ہے۔تو آخر علمِ فقہ کی بنیاد پر مرتب کردہ سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں وہ تزکیۂ نفس کیسے حاصل ہو سکتا ہے جو اس علم کا موضوع ہی نہیں؟ آخر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کو **فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب** جب آپ فرائض نبوت سے فارغ ہو جائیں تو عبادت میں

لگ جائیں اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے رب کی طرف لو لگالیں۔ نیز ان ناشئۃ اللیل ھی اشد و طأً و اقوم قیلا ۔۔ بے شک رات کا قیام نفس پر قابو پانے اور بات کو درست کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ وغیرہ کا حکم کیوں دیا؟

اگر اب بھی ہم خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور جمہوری عمل کو غلبۂ اسلام کا اصل الاصول سمجھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سیکولرازم ہی اسلام کا دوسرا نام پڑ جائے کیونکہ plurality of goods ایسا سراب پیدا کر دیتی ہے جس میں سیکولر خیالات تحریکاتِ اسلام کے لیے قابلِ برداشت ہوتے چلے جاتے ہیں اور دینی قوتیں اپنے اصولی مؤقف سے پیچھے ہٹتے ہٹتے اقتدارِ اسلامی سے متصادم تصوراتِ خیر کو انسانی حقوق کی چھتری تلے برداشت کرتی چلی جاتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ اپنی اصولی جدوجہد سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں جیسا کہ پاکستان کے پچاس سال سے زائد عرصے پر محیط تجربات سے واضح ہے۔ تحریکاتِ اسلامیہ اور علماء کرام کا یہ مفروضہ سراسر غلط ہے کہ جمہوری ادارے (مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ) کوئی غیر اقداری تنظیمی ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں جن میں اسلامی انفرادیت، معاشرت اور ریاست کا قیام ممکن ہے۔ اس طریقۂ کار سے سرمایہ داری کا انہدام تو کجا، ہم اس نظام کا اسلامی جواز فراہم کرنے اور اسلام کو اس جاہلیتِ خالصہ میں سمونے کی غیر شعوری کوشش کرتے ہیں۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نام نہاد اسلامی جمہوریت کے ذریعے ہم اسلامی انقلاب تو نہ لا سکے البتہ اس جدو جہد کے نتیجے میں معاشرے میں سیکولرازم اور سرمایہ داری کے عمل کو بہر حال تقویت پہنچی۔ اسی طرح اسلامی بینکاری اور معاشیات کے ذریعے ہم غیر سرمایہ دارانہ معاشی نظام تو برپا نہ کر سکے اور نہ ہی کر سکتے ہیں البتہ اس نظام میں شرکت سے لبرل سرمایہ داری کا اسلامی جواز ضرور فراہم کرتے چلے گئے۔ تحریکات اسلامیہ کی ناکامیوں کی اصل وجہ غلط فہمی پر مبنی یہ رویہ ہے کہ جمہوری سیاسی عمل احیائے اسلام کے حصول کا محض ایک ذریعہ نہیں بلکہ اسلامی نظام اقتدار کا لازمی نتیجہ ہے۔

سرمائے کی بالادستی:

حقوق کی سیاست ریاست سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ خیر کے معاملے میں غیر جانبدار

رہے اور تمام افراد کے تصوراتِ خیر اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے پوری ریاستی مشینری کو استعمال کرے تا کہ آزادی کے اظہار کا جو بھی طریقہ افراد اختیار کرنا چاہیں کرسکیں، مگر ہیومن رائٹس کی بالادستی کے نتیجے میں جو واحد تصور خیر دوسرے تمام انفرادی تصورات خیر پر غالب آجاتا ہے وہ آزادی یعنی سرمائے میں لامحدود اضافے (عملِ تکاثر) کی خواہش ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ واحد خیر (جو درحقیقت شر) ہے جسے آزادی کا خواہاں شخص اور معاشرہ اپناتا ہے۔ ہمارا دعویٰ محض نظریاتی خام خیالی نہیں ہے بلکہ عملاً دیکھا جاسکتا ہے کہ دنیا کی ہر جمہوری ریاست کا مقصد آزادی یعنی سرمائے میں اضافے کی جدوجہد کرنا ہی ہے اور سرمائے میں اضافہ ہی تمام ریاستی پالیسیوں کی اصل بنیاد ہوتی ہے۔

اس طرح کے نظام میں کسی بھی مذہب کا نفاذ تو درکنار بقاء بھی مشکل ہے کیونکہ مذہب خیر کیا ہے، شر کیا ہے خود متعین کرتا ہے اور اس سسٹم میں خیر وشر کی تفسیر کا حق عوام کو ہوتا ہے نہ کہ کسی اور ہستی کے پاس جمہوریت کا سسٹم کن بنیادوں پر استویٰ کیا گیا تھا اس کے کیا مقاصد ہیں تفصیل سے آگاہی کے لیے دیکھیں۔ (اسلامی بینکاری و جمہوریت) (واللہ اعلم بالصواب)

اہل مغرب کی قانون سازی

☆ مغربی معاشرے کی بنیادیں سیکولرازم پر ہیں اس معاشرے میں قانون سازی بھی کسی مذہب سے رہنمائی لیکر نہیں کی جاتی بلکہ قانون سازی کا عمل محض عقل سے کیا جاتا ہے یعنی اپنا تمدنی قانون انسان خود طے کرے گا کہ مجھے معاشرے میں کس طرح رہنا ہے۔ کیا چیز غلط ہے کیا صحیح ہے خود انسان طے کرے گا۔ یعنی خود ہی حاکم اور خود ہی محکوم اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ وحی کے بغیر انسان کبھی بھی محض اپنی عقل سے ایسا قانون تیار نہیں کر سکتے جو جرائم کو روک سکے اور ہر ایک کو انصاف دلا سکے ہر ایک کو انصاف دلانا تو بہت دور کی بات ہے سب انسان مل کر بھی یہ نہیں طے کر سکتے کہ انصاف کیا ہے کہ کس کو کتنا حق دیا جائے تو انصاف ہوگا۔ آج تک انسان محض اپنی عقل سے زندگی کا قانون دریافت نہ کرسکا کہنے کو تو اگر چہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں مگر یہ تمام ''قوانین'' نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ

کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رائج الوقت قوانین بھی اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں اس لیے ہر طرف جرائم کی فضاء ہے۔

دَورِ جدید میں ان مسائل پر کہ قانون کو کس طرح تشکیل دیا جائے بے شمار لٹریچر تیار ہوا بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کیلئے صرف کر رہے ہیں۔ قانون ایک زبردست فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

مگر اب تک کی جانے والی ساری کوششیں اور کاوشیں قانون کا متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام ہیں اور کوئی ایسا لازوال قانون جو تمام علاقوں پر نافذ ہوسکتا ہو یہ تو کجا کسی ایک خاص مقام کیلئے بھی قانون بنانے سے قاصر ہیں جو اپنے اندر قانون بننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور قانون کی مکمل خاصیت اس میں شامل ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح بنیاد اور اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کے اندر ان ضروری قدروں کو یکجا کریں جو ایک قانون کیلئے لازمی ہوتی ہیں جب اسکی کوشش کرتے ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بیک وقت اکٹھی نہیں ہو رہی ہیں کیونکہ مذہبی تصورات کو تسلیم کیے بغیر ان صفات کو جمع کرنا ناممکن ہے لہٰذا سیکولر معاشرہ سیکولر بنیادوں پر منصف قانون کی تشکیل نہیں کرسکتا سیکولرازم کا دامن قیامت تک کسی اچھے منصف قانون سے خالی ہی رہے گا۔

اس سلسلے میں ماہرین قانون کی مثال ایسی ہے جو پانچ کلومینڈکوں کو ایک تھال میں رکھ کر وزن کرنا چاہتے ہیں وہ ایک کو پکڑ کر رکھتے ہیں تو دوسرے پھدک کر نکل جاتے ہیں وہ ان کو پکڑتے ہیں تو پہلے والے تھال میں نظر نہیں آتے۔اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی اب تک کی کوششیں صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں فرائڈمین Friedmann کے الفاظ ہیں۔یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔(Legal Theory .P.18)

قانون کون بنائے گا؟

سیکولر معاشرے میں یہ سوال شدت سے اٹھتا ہے کہ قانون کون بنائے گا حکم کس کا چلے گا کچھ حضرات نے یہ رائے دی کہ قوت نافذ کیے بغیر کوئی قانون قانون نہیں بن سکتا اس لیے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص ہو وہ اپنے ادنیٰ اور نیچے والوں کو حکم دے اور ان کیلئے قانون سازی کرے۔

اس طریقے سے قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان بن کر رہ جائے گا۔

اس پر شدّت سے اعتراضات کیے گئے کہ انسانوں میں سے ہی ایک انہی جیسے انسان کو کیوں ان پر مسلط کیا جائے۔ نیز حکمرانوں کی من مانیاں دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور ابھرا کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہئے چنانچہ ایسے ماہرین قانون پیدا ہوئے جنہوں نے کسی ایسے قانون کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کی پشت پر قوم کی رضا مندی نہ ہو۔ یہ نظریہ مغربی فلسفہ کے قریب تر تھا اور آج بھی قانون سازی کا عمل اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ عوامی رائے جس طرف زیادہ ہو جائے وہ قانون منظور ہو جائے گا اگر چہ معلمینِ اخلاق اور اہل علم حضرات اس قانون کو معاشرے کیلئے نامناسب خیال کرتے ہوں اس قانون کے غلط ہونے پر ان کو یقین ہو مگر اہل علم وفن کی ایک نہ سنی جائے گی اور فیصلے کا مدار اکثریت پر ہو گا۔

مثلاً امریکہ میں شراب پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی کیونکہ رائے عامہ کا مطالبہ ہے کہ اس کی اجازت ہونی چاہیے حالانکہ اس کے نقصانات سے حکومت واقف ہے اسی طرح ہم جنس پرستی قبیح عمل ہے اس کیلئے قانون بنا دیا گیا کہ مرد کی مرد سے شادی ہو سکتی ہے اس میں غیر فطری عمل کو بھی قانونی پناہ صرف اس لیے مل گئی کہ رائے عامہ کا مطالبہ تھا حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے مخالف تھے۔ قانون سازی کا عمل اس لیے کیا جاتا ہے کہ انصاف مل سکے۔ قانون کا بنیادی اور ابتدائی مقصد یہ ہے کہ ہر ایک کو انصاف مل جائے۔

انصاف کیا ہے۔ یہ کون بتائے گا ایک گروہ نے کہا کہ سیاسی طور پر اعلیٰ اقتدار والا لیکن اس کا نقص واضح ہے کہ وہ بھی تو ان جیسا انسان ہے وہ ان پر مسلّط کیوں کیا جائے دوسرا

طریقہ یہ تھا کہ عوام مل کر طے کرلیں۔ لیکن عوام میں مجموعی طور پر اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ صحیح قانون کی تشکیل کر سکیں اور ہر ایک کا حق متعین کر سکیں۔ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہنچتی ہے کہ سینکڑوں برس کی تلاش و تحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لیے بنیاد فراہم نہ کر سکا مغربی فلسفہ مقاصدِ قانون کے اہم مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہے۔

ایک طویل عرصہ تجربہ کرنے کے بعد انسان کو معلوم ہوا کہ سیکولر بنیادوں پر ایسا قانون جو انصاف دے ممکن نہیں ہے۔ بلکہ کامیاب قانون کیلئے مذہبی نظریات جزولاینفک (انتہائی ضروری) کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدائی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لیے قانون وضع نہیں کر سکتا لا حاصل سعی کو مزید جاری رکھنے کی بجائے اہل مغرب اور نیم مغرب لوگوں کو چاہیے کہ ڈاکٹر فرائیڈ مین کے الفاظ میں اعتراف کرلیں۔

ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انصاف کے حقیقی معیار کو متعین کرنے کیلئے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی۔(Legal Theory .P.18)

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کیلئے ماہرین تلاش کر رہے ہیں۔ قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے جسکی منظوری سے کسی کو قانون سازی کا درجہ عطا کیا جائے۔ مغربی ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے اگر ملک کے سربراہ کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو عقلی طور پر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور نہ عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ حق دے دیا جائے کہ جو چاہے قانون بنائے اور اپنی من مانی کرتا پھرے اور جس طرح چاہے نافذ کرے اور اگر معاشرے اور اجتماعیت کو قانون ساز قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم اور عقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کیلئے ضروری ہے۔

قانون بنانے کیلئے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام

لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل کرسکیں اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جاسکے جو سارے معاشرے کی رائے ہو موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی وملک کے افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب شدہ لوگ نمائندے کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں قانون سازی کریں۔

مگراس اصول کی غیر معقولیت اسی سے واضح ہے کہ 51% کوصرف 2 عدد کی برتری کی بنا پر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ 49% پر حکمرانی کریں مگر بات صرف اتنی ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً 51% کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے مثال کے طور پر ایک علاقے میں 4 امیدوار ہوں ایک نے 1000 ووٹ میں سے 300 حاصل کیے دوسرے نے 250 تیسرے نے 350 اور چوتھے نے صرف 100 ووٹ حاصل کیے تو 350 ووٹ حاصل کرنے والا جیت جائے گا۔ صرف یہ قانون سازی میں حصہ لے گا۔ اگرچہ اس کے ساتھ 51% کی اکثریت نہیں ہے۔

<u>مغربی فکر وفلسفہ جواب سے قاصر</u>

مغربی فلسفہ کو آج تک اس مسئلے کا کوئی واقعی حل معلوم نہیں ہوسکا کہ قانون کون بنائے گا اور کس کا حکم چلے گا اور اگر بالفرض کسی کی بات کو بحیثیت حکم تسلیم کر بھی لیں تو اس کے حکم کی پابندی کیوں کر ضروری ہے۔ آخر اس کو کیا حق ہے کہ ہم پر حکم چلائے۔ اس کی دلیل مغربی فکر وفلسفہ میں کوئی نہیں ہے۔ مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ صرف ''خدا'' ہے جس نے زمین وآسمان کا اور ساری طبعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن ومعاشرت کا بھی قانون وضع کرے اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے کہ جس کو یہ حیثیت دی جاسکے یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی اور جواب نہیں ہوسکتا۔

اس جواب کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک ڈھکن کو مختلف قسم کی شیشیوں پر

فٹ کرنے کی کوشش کرے مگر کسی پر بھی وہ راست نہ آئے پھر جس شیشی کا ہے اسی پر لگایا جائے تو بالکل ایسا فٹ آئے کہ کوشش کرنے والا بھی اپنی غلطی تسلیم کرے کہ پہلے میں غلطی پر تھا۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں نہ پہنچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں لے جائیں۔ کیونکہ انسان پر حاکم کسی انسان کو نہیں بنایا جاسکتا انسانوں کا حاکم اور قانون سازی کا حق صرف اس ذات کا ہے جس نے اسے جیتا جاگتا، ہنستا، بولتا انسان پیدا کیا وہی خالق اور مالک ہے۔

قانون کا ایک بڑا سوال ہے:

قانون کا سارا حصہ دائمی اور ناقابل تغیر ہوگا یا کچھ حصہ دائمی اور کچھ حصہ حالات وماحول کے ساتھ بدل جائے گا۔ ہر ایسا قانون جو انسان اپنی عقل وفکر سے اختراع کرے اس میں یہ فرق پیدا کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ دائمی اور ابدی حصہ کون سا ہے اور حالات کے ساتھ کس کو بدلا جاسکتا ہے کیونکہ آج کچھ لوگ کسی قانون کو دائمی خیال کریں گے اور کچھ عرصہ بعد میں آنے والے لوگوں کی عقل یہ کہے گی کہ یہ دائمی نہیں ہے بلکہ اس کو بدلنا چاہیئے۔

"یعنی کوئی دائمی قانون نافذ نہیں کیا جاسکتا"۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے کہ خدا کا قانون ہی ہمیں وہ تمام بنیادی اصول دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا جزو لازم ہونے چاہئیں یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہے کہ قانون کا کون سا حصہ دائمی ہے اور کونسا حصہ ناقابل تغیر ہے پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی برحق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کی بہت بڑی خصوصیت ہے جس کا بدل فراہم کرنا انسانوں کے لیے قطعی ناممکن ہے۔ کسی چیز کو جرم قرار دینے کیلئے کوئی دلیل تو ہونی چاہیے کہ یہ جرم کیوں ہے۔

انسانی عقل سے گھڑے ہوئے قانون کے پاس اس کا جواب نہیں ہے کہ جو عمل

امن عامہ یا نظم مملکت میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے اس کے علاوہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کسی کام کو جرم کیسے قرار دے یہی وجہ ہے کہ مغربی مروجہ قوانین کی رو سے زنا کو اصلاً جرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے عمل میں آزاد ہیں صرف وہ زنا جرم بنے گا جو جبراً کیا جائے اور اگر طرفین راضی ہیں تو حکومت گرفت نہیں کر سکتی اس لیے کہ حکومت کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ وہ ان سے کہہ سکیں کہ تم یہ نہ کرو ہاں زبردستی جبراً زنا کی صورت میں سزا ہوگی یہ ان مغربی معاشروں میں بھی جرم ہے جس طرح کسی کا مال زبردستی چھیننا جرم ہے اسی طرح زبردستی کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا بھی جرم ہے۔

دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصلاً جرم زنا نہیں ہے بلکہ زبردستی کرنا کسی کی رضامندی کے بغیر اس کی چیز میں تصرف کرنا جرم ہے۔ گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے اسی باہمی رضامندی کی شکل میں قانون زنا کا حامی اور محافظ بن جاتا ہے اور اگر تیسرا شخص مداخلت کر کے زبردستی انہیں روکنا چاہے تو اُلٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا کہ اس نے ان کی آزادی کو مجروح کیا ہے۔

حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ زنا کا ارتکاب:

1)۔ سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے۔

2)۔ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے۔

3)۔ رشتہ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے۔

4)۔ چوری اور خیانت کو فروغ دیتا ہے۔

5)۔ سارے سماج کے دل و دماغ کو گندا کر دیتا ہے۔

6)۔ قتل اور اغوا کو فروغ دیتا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر خامیاں زنا کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہوتی ہیں مگر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون میں رضامندی سے کیے جانے والے زنا کو جرم قرار دینے کی کوئی بنیادی وجہ نہیں ہے بلکہ محض ان کی عقل کے مطابق یہ انسان کا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے

زندگی گزارے۔اسی طرح انسانی قانون کیلئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے کیونکہ اکل وشرب انسان کا ایک فطری حق ہے جو چاہے کھائے پیئے۔

اگر نشے کے عالم میں وہ کسی سے گالی گلوچ ہوتا ہے کسی پر دست درازی کرتا ہے یا کوئی ایسا کام کرتا ہے جس سے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے تو پھر اس کو سزا دی جائے گی۔اصلاً شراب نوشی کا فعل قابل گرفت نہیں ہے بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایذا دینا ہے۔

حالانکہ شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے۔اور مال کے ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جاسکتی ہے۔اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے۔

شراب مجرمین کی ایک بہترین مددگار ہے جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات مفلوج ہوجاتے ہیں پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے گویا کہ یہ سب برے کاموں کی جڑ ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود انسانی عقل سے مختراع قانون اسے بند نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل و شرب پر پابندی لگائے۔اس لئے کہ سیکولر ذہنیت کے مطابق تو یہ انسان کا حق ہے جو چاہے کھائے پیئے وہ مطلق آزاد ہے کسی اعلیٰ اتھارٹی (خدا) کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

سیکولر ماہرین قانون پریشان ہیں کہ ان کے پاس اس پر پابندی لگانے کی معقول وجہ کوئی نہیں ہے حالانکہ اس سے معاشرے میں حد درجہ کا فساد آتا ہے۔اسی طرح کا معاملہ سود کا ہے کہ ہر فرد سودی کاروبار کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔اور سیکولر حکومتیں اس کو جرم قرار نہیں دے سکتیں کیونکہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔کسی بھی گناہ کے کام کو گناہ کہہ کر پابندی لگانا سیکولرازم کی بنیادوں پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔کیونکہ ان کے فکر وفلسفہ میں انسان کا کسی غیر اتھارٹی کے سامنے جواب دہ ہونے کا فلسفہ فضول ہے۔انسان کو چونکہ قدرت نے عقل عطاء کی ہے اس لیے یہ کسی کا پابند نہیں ہے۔

اس مشکل کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے کیونکہ خدا کا قانون مالک

کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذات خود اس بات کی کافی وجہ اور دلیل ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو اس کے بعد اس کیلئے اور سبب کی ضرورت نہیں اس طرح خدائی قانون ہی قانون کی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے۔

''زنا حرام ہے۔ سود حرام ہے۔ شراب حرام ہے کیوں حرام ہیں''؟

جواب یہ ہے کہ جس مالک نے تجھے پیدا کیا ہے اس کا حکم ہے کہ ان چیزوں کو میں نے حرام قرار دے دیا ہے لہٰذا ان سے بچو۔

انسانی قانون سازی کا عمل انسان کو کبھی بھی انصاف نہیں دلا سکتا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انصاف کیا ہے کس پر کیا ذمہ داریاں ڈالنی ہیں اور کیا حقوق کس کو ملنے چاہئیں انسانی عقل اس تقسیم سے قاصر ہے کیونکہ ذمہ داریاں ڈالنے کیلئے کما حقہ انسان کی صلاحیت اور استعداد کا علم ہونا اور تعبیر پذیر حالات میں اس کے احساسات کا علم ہونا ضروری ہوتا ہے پھر کچھ طے کیا جاسکتا ہے اس کی ذمہ داریاں کیا ہونی چاہئیں اور حقوق کیا ہونے چاہئیں۔ ان حالات کا علم کما حقہ اللہ ہی کو ہے وہ ہی انسانی تمدن کیلئے قانون دے سکتے ہیں وگرنہ جب انسانی عقلیں محض عقل سے قانون تیار کریں گی تو ایسا ہی ہوگا جو آج کل ہو رہا ہے مرد و عورت میں کثیر تفاوت کے باوجود ان کی ذمہ داریاں برابر کردیں اور ان کے درمیان فطری فرق کو بھی ختم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

اور حسین عنوان یہ دیا جاتا ہے کہ ہم حقوق برابر دے رہے ہیں حالانکہ حقوق کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بھی برابر کی ڈال دی جاتی ہیں جس کا تحمل کرنا عورت کیلئے آسان نہیں۔

اپنے اس غلط قانون کی بدولت اپنا خاندانی نظام وہ کھو چکے ہیں معاشرے میں بے حیائی کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں رونما ہوئی ہیں وہ سب اس غلط قانون سازی کے عمل کا نتیجہ ہے۔

اخلاقی اقدار و مذہبی عقائد کے بغیر قانون جرائم کے انسداد میں ناکام ہیں۔ محض قانون کبھی بھی مکمل طور پر جرائم کو روک نہیں سکتا بلکہ مختلف وجوہات کی بنا پر اس کے ساتھ اخلاق کا اہم رشتہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار اور مذہبی اعتقادات جرائم کے انسداد میں حد درجہ کی معاون ہوتی ہیں۔

الف)۔ مثلاً ایک مقدمہ قانون کے سامنے آتا ہے' اس وقت اگر خالص سچائی منظرِ عام پر نہ آئے تو قانون کا عادلانہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوسکتا' اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہوجائے گا' اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی گویا قانون کے ساتھ کسی ایسے ماورائے قانون تصور کی بھی لازمی ضرورت ہے' جو لوگوں کے لئے سچ بولنے کا محرک بن سکے' سچائی کے لازمہ قانون وانصاف ہونے کا اعتراف دنیا بھر کی عدالتیں اس طرح کرتی ہیں کہ وہ ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھائے اور حلف اٹھا کر اپنا بیان دے' قانون کے لئے مذہبی اعتقادات کی اہمیت کی یہ ایک نہایت واضح مثال ہے' مگر جدید سوسائٹی میں مذہب کی حقیقی اہمیت چونکہ ہر پہلو سے ختم کردی گئی ہے' اس لیے عدالتوں کی مذہبی قسمیں اب صرف ایک روایت بلکہ مسخرہ پن بن کر رہ گئی ہیں' اور ان کا کوئی واقعی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔

ب)۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قانون جس فعل کو جرم قرار دے کر اس پر سزا دینا چاہتا ہے اس کے بارے میں خود سماج کے اندر بھی یہ احساس موجود ہو کہ یہ فعل جرم ہے' محض قانونی کوڈ میں چھپے ہوئے الفاظ کی بنا پر وہ فضا پیدا نہیں ہوسکتی جو کسی جرم پر سزا کے اطلاق کے لئے درکار ہے' ایک شخص جب جرم کرے تو اس کے اندر مجرمانہ ذہن Guilty Mind کا پایا جانا ضروری ہے' وہ خود اپنے آپ کو مجرم سمجھے اور سارا سماج اس کو مجرم کی نظر سے دیکھے' پولیس پورے اعتماد کے ساتھ اس پر دست اندازی کرے' عدالت میں بیٹھنے والا جج پوری آمادگی قلب کے ساتھ اس پر سزا کا حکم جاری کرے' دوسرے لفظوں میں ایک فعل کے جرم ہونے کے لئے اس کا ''گناہ'' ہونا ضروری ہے۔

ج)۔ ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کے عمل درآمد سے پہلے سماج کے اندر ایسے محرکات موجود ہوں جو لوگوں کو جرم کرنے سے روکتے ہوں' صرف

پولیس اور عدالت کا خوف اس کے لیے کافی محرک نہیں بن سکتا کیونکہ پولیس اور عدالت کے اندیشہ سے تو رشوت' سفارش' غلط وکالت اور جھوٹی گواہیاں بھی سچا بنا سکتی ہیں اور اگر ان چیزوں کو استعمال کر کے کوئی شخص اپنے آپ کو جرم کے قانونی انجام سے بچا لے تو پھر اسے مزید کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

خدائی قانون میں ان تمام چیزوں کا جواب موجود ہے' خدائی قانون کے ساتھ مذہب وآخرت کا عقیدہ وہ ماورائے قانون فضا پیدا کرتا ہے' جو لوگوں کو سچائی پر ابھارے' وہ اس درجہ موثر ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی مفاد کے تحت جھوٹا حلف اٹھائے بھی تو اپنے دل کو ملامت سے نہیں بچا سکتا۔ اسی طرح جرم کے فعل شنیع ہونے کا عام احساس بھی محض اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹوں کے ذریعہ پیدا نہیں ہوسکتا' اس کی بھی واحد بنیاد خدا اور آخرت کا عقیدہ ہے' اسی طرح جرم نہ کرنے کا محرک بھی صرف مذہب ہی پیدا کرسکتا ہے' کیونکہ مذہب صرف قانون نہیں دیتا بلکہ اسی کے ساتھ یہ تصور بھی لاتا ہے کہ جس نے یہ قانون عائد کیا ہے' وہ تمہاری پوری زندگی کو دیکھ رہا ہے' تمہاری نیت' تمہارا قول' تمہاری تمام حرکتیں اس کے ریکارڈ میں مکمل طور پر ضبط ہوچکی ہیں' مرنے کے بعد تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور تمہارے لئے ممکن نہ ہوگا کہ تم اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکو' آج اگر سزا سے بچ گئے تو وہاں کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے' بلکہ دنیا میں اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لئے اگر تم نے غلط کوششیں کیں تو آخرت کی عدالت میں تمہارے اوپر دہرا مقدمہ چلے گا اور وہاں ایک ایسی سزا ملے گی جو دنیا کی سزا کے مقابلے میں کروڑوں گنا سخت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو قانون سے الگ کریں تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کوئی دلیل نہ ہوگی کہ بادشاہ اور خود قانون بنانے والے بھی اس قانون کے پابند ہیں اور بادشاہ بھی قانون کا ماتحت ہے کیونکہ جن افراد نے خود اپنی رائے سے قانون بنایا ہو جن کی اجازت سے وہ قانونی طور پر جاری ہوا ہو جو اس کو باقی رکھنے یا بدلنے کا حق رکھتے ہوں آخر کس بنیاد پر وہ اس کے ماتحت ہوجائیں جب انسان ہی قانون ساز ہو تو بالکل فطری طور پر وہ خدا اور قانون دونوں کا جامع ہوجاتا ہے وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ایسی حالت میں قانون سازوں کو قانون کے

دائرے میں لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی ایسی صورت حال میں کبھی بھی قانون کی نظر میں سب برابر نہیں ہوسکتے اگر بالفرض تحریری طور پر قرار دے بھی دیا جائے تو عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔صرف خدائی قانون میں ہی یہ ممکن ہے کہ ہر شخص کی حیثیت قانون کی نظر میں یکساں ہو اور ایک حاکم پر اسی طرح عدالت میں مقدمہ چلایا جاسکے جس طرح محکوم پر چلایا جاتا ہے کیونکہ ایسے نظام میں قانون ساز خدا ہے اور باقی لوگ امیر وغریب' شہنشاہ وگدا گرسب کے سب اس کے بندے اور محکوم ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں اور یکساں طور پر وہ اس قانون کے پابند ہیں۔

آج انسان نے اپنی عقل کی بنیاد پر اتنی ترقی کرلی ہے کہ کسی زمانے میں انسان یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے ایسے کام یہ انجام دے سکتا ہے۔ہوا کو مسخر کرسکتا ہے سمندروں اور کہساروں پر حکومت کرسکتا ہے۔طبعی قانون کے ایسے ایسے رموز واسرار کا انکشاف جس کا علم انسان کو صدیوں سے نہ ہوسکا اب انسان ان کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔طبعی قانون کے بارے میں جانکاری ان دوصدیوں میں اس قدر کی ہے کہ پہلے انسان اس سے ناآشنا تھا مثلاً۔دنیا میں سب سے پہلا فوٹو ایک فرانسیسی سائنس دان نے 1826ء میں کھینچا اس میں آٹھ گھنٹے کا وقت لگا۔

لیکن دورحاضر میں آٹھ گھنٹے میں ہزاروں تصویریں کھینچی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح انسان کی آج باریک بینی کے مطالعے کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے ذرے اور ایٹم کی بھی قسموں کو جانتا ہے۔لہٰذا بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آج انسان اس قابل ہوگیا ہے کہ کسی خارجی رہنمائی (وحی) کے بغیر بھی اپنا تمدنی قانون انداز رہن سہن طے کرسکتا ہے اور دنیا میں امن قائم کرسکتا ہے۔

جواب: طبعی قوانین کے جاننے میں تو انسان نے ترقی کی ہے کہ فلاں چیز کس طرح عمل کرتی ہے۔فلاں چیز کس طرح وجود میں آتی ہے وغیرہ۔

مگر تمدنی قانون کے سلسے میں انسان آج بھی وہیں ہے جہاں پر ہزاروں سال پہلے تھا۔تفصیل کے ساتھ جواب تو مندرجہ بالا مضمون میں گزر چکا ہے کہ انسانی دماغ ایسی استعداد ہی نہیں رکھتا کہ وحی کے بغیر اور خدا کو مانے بغیر اپنا تمدنی قانون طے کرلے۔

اجمالاً جواب یہ ہے کہ اگر انسان عقل وشعور کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ یہ حقیقت تک رسائی کرسکتا ہے اپنی عقل سے تمدنی' معاشرتی' اخلاقیاتی معاملات کے ضوابط طے کرسکتا ہے۔تو اس کی یہ نام نہاد عقل اس کو رب کی نافرمانی سے کیوں نہیں روک رہی۔اس کی عقل جرائم کے انسداد میں اس کی معاون کیوں نہیں بن رہی۔آج کا انسان بھی اسی طرح کی بگڑی ہوئی حرکتیں کیوں کرتا ہے۔جیسا کہ نوح علیہ السلام کے زمانے کے لوگ کیا کرتے تھےاور حرص اور لالچ میں آج بھی بھائی بھائی کو قابیل اور ہابیل کی طرح قتل کررہا ہے۔انسان کی عادات وخصائل' اسی طرح کی ہیں جیسا کہ آج سے پہلے تھیں اور بعض حضرات کا یہ کہنا کہ مذاہب نے جو قانون دیا ہے وہ اس دور کیلئے تھا اب انسان مہذب بن چکا ہے اس کے لئے کوئی اور قانون ہونا چاہئے۔

یہ ان کج فہمی ہے۔اخلاقیات اور معاملات اور معاشرت کے اعتبار سے انسان ویسا ہی ہے۔اس کی لالچ اور حرص ویسی ہی ہے جیسے صدیوں پہلے انسانوں کی تھی۔بے حیائی اور عریانی کی طرف رغبت اسی طرح ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عریانی اور فحاشی کو فروغ دے رہا ہے۔جب آج کے انسان کے اور صدیوں پہلے انسان کے امراض ایک جیسے ہیں تو دوا بھی ایک جیسی ہوگی۔جرم ایک جیسا ہے تو سزا بھی ایک جیسی ہوگی۔(واللہ اعلم بالصواب)

خصوصیات دینِ اسلام

اسلام میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو کسی مذہب میں بھی نہیں ہیں چہ جائیکہ کسی عقلی تخیل سے تیار کردہ نظام زندگی میں ہوں۔

1)۔ اسلام کا کوئی بھی قانون عقل کے خلاف نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ کچھ احکام عقل سے بالاتر ہونے کی وجہ سے اولاً سمجھ میں نہ آئیں۔

کیونکہ انسانی عقل وفہم محدود ہے اس کی پرواز بھی محدود ہے۔وحی الٰہی کے بہت سارے احکام کی حکمتیں انسانی عقل کی پرواز سے ماوراء ہونے کی وجہ سے اور بلندو بالا ہونے کی وجہ سے عقل میں نہیں آتیں۔ظاہر سی بات ہے ایک لیٹر کے برتن میں ایک لیٹر ہی دودھ ڈالا جاسکتا ہے اس سے زیادہ دودھ اس برتن میں نہیں آسکتا کیونکہ اس کا ظرف چھوٹا ہے۔

اسی طرح عقل کے ظرف میں کچھ چیزوں کی حکمتیں آ جاتی ہیں اور اسلام کی کچھ چیزوں کی حکمتوں سے عقل نا آشنا رہتی ہے اس لیے کہ اس کا ظرف چھوٹا ہے۔ نہ کہ اسلامی احکام عقل کے خلاف ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:

فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا ط لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون o

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا اور اس اصلی فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا یہی دین اسلام سیدھا دین ہے کہ جو اس اصلی فطرت کے مطابق ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

دوسری خصوصیت:

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی جو تفصیل شریعت اسلامیہ نے کی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی ملت و مذہب سے ملنا دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے۔ شریعت اسلامی نے ایک طرف خدا اور بندے کے تعلق کو مضبوط بنانے کیلئے معرفت و عبودیت کے طریقے بیان کیے ہیں۔ تو دوسری طرف سیاست ملکیہ اور انداز تمدن اور اصول معاشرت اور باہمی رابطے کے ایسے اصول وقوانین بتائے ہیں جن کو سن کر اقوام عالم انگشت بدنداں ہیں۔

تیسری خصوصیت:

شریعت اسلامیہ کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے افراط و تفریط سے پاک ہے شریعت اسلامیہ شدت وخفت کے بین بین ہے۔

چوتھی خصوصیت:

مذہب اسلام تمام انبیاء کی شریعتوں کا خلاصہ ہے اور تمام حکماء کی حکمتوں کا عطر ہے اسلام نے کوئی خیر نہیں چھوڑی جس کا حکم نہ دیا ہو کوئی شر اور برائی نہیں چھوڑی جس سے منع نہ کیا ہو۔

کمافی الحدیث:

كما روى عن زيد بن ارقم عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: ماتركت من خير الا وقد امرتكم به وما تركت من شر الا وقد نهيتكم عنه(رواہ الطبرانی، الحدیث)

ترجمہ: زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: میں نے کوئی خیر اور بھلائی نہیں چھوڑی کہ جس کا تم کو حکم نہ دیا ہو اور کوئی شر اور برائی ایسی نہیں چھوڑی کہ جس سے تم کو منع نہ کر دیا ہو۔

پانچویں خصوصیت:

اسلام کے اصول میں کسی جگہ بھی تناقض اور کسی قسم کا تعارض نہیں ہے۔

بہرحال نجات کا راستہ صرف اور صرف ایک ہی ہے وہ ہے دین اسلام اس کے سوا سب گمراہی وضلالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ان الدين عندالله الا سلام(بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔

الباب السادس

جدیدیت کیا ہے؟

جدیدیت یوں تو ایک نئی اصطلاح ہے جس کا ماخذ مغربی فکر وفلسفہ ہے لیکن یہ اصطلاح سے زیادہ ایک خاص رویے مزاج اسلوب زندگی طور طریقے اور ایک خاص فکر ونظر کا نام ہے۔

جس میں عقل کو امام تصور کیا جاتا ہے اور تمام چیزوں کو محض عقل کی روشنی میں جانچا پرکھا جاتا ہے حتیٰ کہ وحی الٰہی ذاتِ خداوندی اور ذات پیغمبر بھی صرف اور صرف عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے قابل ہیں۔ مابعد الطبعیات کے سوالات آخرت کی زندگی کے سوالات کا جواب ریاضی کی طرح دو جمع دو چار کی طرح دینا چاہتے ہیں لہٰذا عقلی قوتوں کے ذریعے لامحدود کائنات کے اسرار کو پانے کی ناممکن جستجو کرنے والے کا دوسرا قدم ہمیشہ سائنس اور فلسفہ کے خلاء میں معلق رہتا ہے۔

جدیدیت لفظیت پر اصرار کرتی ہے وہ قرآن وسنت اور احادیث کے الفاظ کو لغت عرب اور محاورہ عرب اور زمان ومکان میں محصور سمجھتی ہے انکی تعلیمات کو اسی وقت کیلئے موزوں قرار دیتی ہے جدیدیت کے خیال میں قرآن کریم اور سنت نبوی واحادیث مبارکہ کی نئ تشریحات پیش کرنا ضروری ہیں کیونکہ قدیم تشریحات صرف عرب کے معاشرتی تناظر میں کی گئی تھیں آج دور جدید ہے لہٰذا وہ قابل عمل نہیں اس طرح جدیدیت قرآن وسنت کے عالمگیر ہونے سے انکار کرتی ہے۔جدیدیت اپنے عہد کے غالب رجحانات سے مغلوب اور مرعوب ہوتی ہے یہ فلسفہ اور سائنس کو اپنے دین کا اہم عنصر سمجھتی ہے اور اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ فلسفہ وسائنس کو دین وحی سے بھی اعلیٰ سمجھتی ہے اور فلسفیانہ مباحث اور سائنسی معلومات کو براہین قاطعہ سمجھتے ہیں۔جدیدیت کے علم بردار ماضی میں عقل محض اور یونانی فلسفہ سے متاثر تھے اور دور حاضر میں مغرب کی چکا چوند تہذیب اور مادی ترقی سے بے حد متاثر ہیں۔

جدیدیت کے علم بردار مسلمہ عقائد وافکار کا کسی جگہ کلی طور پر انکار کر دیتے ہیں اور کسی جگہ تاویل سے کام لیتے ہیں اور کئی جگہ تحریف دین کے مرتکب ہوتے ہیں۔جدیدیت عارضی زندگی تک محدود رہتی ہے یعنی مادی وسائل کا حصول زندگی کی رنگینیوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا جدیدیت کا مطمع نظر ہوتا ہے اعلیٰ معیار زندگی مادی ذرائع کا حصول اور ترقی کا عنوان دے کر ان میں زیادہ کشش پیدا کی جاتی ہے اور موت وآخرت کی تیاری سے یکسر غفلت ہوتی ہے۔

دَور حاضر میں جدیدیت کی ایک خالص مذہبی شکل ہے یہ شکل قرآن وسنت کو ماخذ دین تسلیم کرنے کے باوجود کیمونزم، سوشلزم مغربی نظام وغیرہ کی اسلام میں پیوند کاری کرتی ہے۔جدیدیت کا خاص وصف ہے اجتہاد کا عنوان دے کر سلف سے اعراض کرنا اور قرآنی آیات میں تدبر وتعقل کے نام پر الحاد کا دروازہ کھولنا، تحقیق کے نام پر مذہب سے نجات حاصل کرنا۔اپنے ماضی کی بلکہ سلف کی تشریحات کو پرانے لوگوں کے خیالات اور روشنیوں سے ناآشنا کہہ کر تحقیر کرنا۔جدیدیت میں تمتعِ دنیا اور لذت کا حصول ہی مقصد ہوتا ہے دینی مدارس، علماء کی تضحیک اور اجتہاد کے نام پر الحاد کی ترویج کرنا۔یہ مختصر سا خلاصہ ہے جدیدیت کا۔

جدیدیت کا آغاز وارتقاء

دعوی جدیدیت:

جدیدیت ایک عالمگیر تہذیب وثقافت اور اقدار کا دعویٰ کرتی ہے اس کی بنیاد عقل پرستی پر ہے اور یاد رکھیں عقل کی بنیاد پر آفاقی اقدار تعمیر نہیں کی جاسکتیں کیونکہ عقل ایک خاص تاریخ، تہذیب' ثقافت، زمان ومکان میں محصور ہوتی ہے عقل اپنی تاریخ سے اوپر نہیں اٹھ سکتی لہٰذا عقلیت کی بنیاد پر عالمگیریت کا دعویٰ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے اور خیال عبث ہے۔ عقل پرستوں کا گروہ تقریباً ہر دور میں وقفہ وقفہ سے سر اٹھاتا ہے۔ اور معاشرے کے دین ومذہب کو اولاً عقل کے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر ہم آہنگی ممکن نہ ہو تو عقل کی ناقص کسوٹی سے دین کو پرکھتے ہیں اور اس کو عقل وحالات کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرون اولی میں جدیدیت:

جدیدیت کا فتنہ اس امت میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت سے موجود تھا پھر ان فتنوں میں اضافے ہوتے رہے لیکن ان کا تدارک بھی وقتاً فوقتاً کیا گیا۔

پہلی صدی اور دوسری صدی اس امت کی تاریخ میں فرقوں کی کثرت کے حوالے سے یادگار ہے اس دور میں نہ صرف یہ کہ بے شمار فرقے وجود میں آئے بلکہ ان فرقوں کے آگے ذیلی فرقوں کی تعداد اصل فرقوں سے بھی بڑھ گئی عقلی موشگافیوں نے صرف امت کو ہی نہیں ان فرقوں کو بھی پارہ پارہ کر دیا تھا مثلاً خوارج کے ذیلی فرقوں کی تعداد (51) سے زیادہ اور معتزلہ کے فرقوں کی تعداد (52) سے زائد تھی اسلام کی تاریخ میں ایسا خطرناک دور پھر کبھی نہیں آیا۔

یہ فرق باطلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکے ان کے عقلی دلائل اور بنیادیں وقت کے ساتھ ساتھ اپنی موت آپ مر گئیں۔

تیسری صدی کے بعد تو بالکل مٹ گئے ان فتنوں میں بقاء کی صلاحیت نہ تھی۔ ان کا علمی طور پر کثرت کے ساتھ رد کیا گیا۔

جدیدیت کے نمائندہ مکاتب:

چھٹی صدی سے بارہویں صدی تک جدیدیت کے نمائندہ مکاتب فکر اور شخصیات مندرجہ ذیل ہیں:

خوارج، مرجیہ، جہمیہ، معتزلہ، اخوان الصفاء، معبدالجہنی، عیلان دمشقی، واصل بن عطا، عمرو بن عبید، جہم بن صنوان ابراہیم بن سیار بن ہانی الظلام

یہ لوگ بھی عقل کو اولین ترجیح دیتے تھے جو چیز دین میں عقل سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن میں نہ آتی تو اس چیز کا انکار کردیتے اس میں طرح طرح کی تاویلات کر کے اس کو عقل وفلسفہ کے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

متقدمین میں سے جدیدیت کا مقابلہ کرنے والے:

اللہ جل شانہ دین اسلام کی حفاظت کیلئے ہر دور میں ایسے افراد پیدا فرما دیتے ہیں جو دین کی صحیح تعلیمات کو محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں عوام یا فرق باطلہ کی طرف سے کوئی غیر صحیح بات دین کے نام پر مشہور ہو جاتی ہے تو اس کو وہ رد کردیتے ہیں اور امت میں صحیح تعلیمات نبوی ﷺ کا احیاء کرتے ہیں اور بدعات کو شدت کے ساتھ رد کرتے ہیں۔

دوسری تیسری صدی میں جن جن فتنوں نے سر اٹھایا خاص طور پر معتزلہ اور خوارج اپنے ساتھ ایسے عقلی وٹھوس دلائل رکھتے تھے کہ بہت سے اہل علم بھی ان کے تانے بانے کا شکار ہو گئے۔ بڑے بڑے ادب وفلسفہ کے ماہران عقلی دلائل ومنطقی براہانات کے اسیر ہو گئے مثلاً علامہ زمخشری جس کو جاراللہ زمخشری کہا جاتا تھا۔ ادب کا امام تھا تفسیر کشاف اس کے علم وفن کا آج بھی مظاہرہ کرتی ہے۔ لیکن عقیدتاً یہ معتزلہ میں سے تھا۔ بہت سے اس کے علاوہ افراد تھے جو علم وفن میں امام کا درجہ رکھتے تھے لیکن عقیدتاً معتزلہ میں سے تھے۔

نظام قدرت ہے یہ سب خس و خاشاک زمانے کی نظر ہو گیا اور اہل سنت و الجماعت کا مسلم عقیدہ لوگوں میں چلا اور سواداعظم انہی عقائد کو اپناتا رہا۔

اہل سنت کے عقائد کی ترجمانی توضیح وتشریح۔ان عقائد کو قرآن وسنت سے ثابت کرنا اور مخالفین کی طرف سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کا احسن طریقے سے جواب دینا اور امت کے عام افراد (جو علم میں تبحّر نہیں رکھتے) ان کی رہنمائی کا سہرا مندرجہ ذیل ہستیوں کے سر پر ہے جنہوں نے کٹھن مراحل میں مشکلات کو برداشت کرکے صحیح تعلیمات کی طرف رہنمائی کی ہے۔

امام ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر باقلانی، امام احمد، امام غزالی، امام فخر الدین رازی، ابن تیمیہ، علامہ سعد الدین تفتازانی، امام الحرمین ابوالمعالی اور ابوالمظفر، ان حضرات نے فکری طور پر جدیدیت کا قلع قمع کیا۔فرق باطلہ کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گیں۔ چند مندرجہ ذیل ہیں:

1)۔ متقدمین میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے الرسالہ اور کتاب الام میں بعض فتنوں کا رد پیش کیا ہے۔

2)۔ امام ابوحنیفہ نے الفقہ الاکبر کے ذریعے ان فرقوں کی بنیادوں کو منہدم کیا ہے۔

3)۔ امام ابوالحسن اشعری نے مقالات الاسلامیین ۔

4)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کو حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے۔

5)۔ امام غزالی نے تو تمام فلسفہ باطلہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ان کی شاندار کتب میں سے المستصفی، تہافۃ الفلاسفہ ہے۔

6)۔ امام ابن تیمیہ کی الرد المنطقیین اور منہاج السنہ۔

7)۔ امام طحاوی کی عقیدہ طحاویہ۔

8)۔ شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کی حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء۔

مندرجہ بالا کتب میں ان حضرات نے اپنی کتب کے اندر اٹھنے والے فتنوں کا زبردست رد کیا ہے اور قرآن وسنت کی صحیح تعلیمات کی طرف اور منہاج النبی ﷺ کی طرف صحیح رہنمائی کی ہے اور امت مسلمہ کے لئے ڈھال بنے مخالفین کی طرف سے کیے جانے

والے اعتراضات کا قلع قمع کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبور کو منور فرمائے۔ آمین!

جدیدیت کی تشکیل نو

امام غزالی کے نفیس کام کے نتیجے میں یونانی فلسفے کی علمی روایت نے دم توڑ دیا تو ساتھ ہی تمام جدت پسندوں اور عقل کے پجاریوں کے دلائل کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد 18 اٹھارھویں صدی عیسوی تک عالم اسلام میں جدیدیت کی لہر سر نہ اٹھا سکی ہر طرف اسلام کا غلبہ و دور دورہ تھا مسلمان علمیت میں بہت مضبوط رہے تمام فلسفی مل کر بھی امام غزالی کے اعتراضات کو من حیث الکل توڑنے سے قاصر تھے بالآخر یونانی فلسفے کا جنازہ نکل گیا۔

یونانی فلسفہ کے بعد حالات نے ایک نئی کروٹ لی اور سترھویں صدی عیسوی میں فلسفہ مغرب نے جو جنم لیا تھا پھیلنا شروع ہوا۔

سترھویں صدی کا فلسفہ یونانی فلسفے سے قدرے مختلف تھا اس کے نتیجے میں یورپ نے مادی ترقی کے نئے مظاہر و مناظر پیش کیے مغرب نے فلسفہ جدید اور سائنس میں قدم رکھا اگرچہ یہ دونوں چیزیں فلسفہ یونان ہی سے لی گئی تھیں مگر انہوں نے اس یونانی فلسفہ میں کچھ اضافے کر لیے اور فلسفہ جدید پیش کیا۔ جس کے نتیجے میں ایک نئی علمیت وجود میں آئی اور قدیم سائنس کی جگہ سوشل سائنس نے لے لی۔ یہی دو چیزیں مغرب کی ترقی کا باعث بنیں۔ پھر مغربی ترقی اور سائنسی انکشافات کا طلسم تمام دنیا پر تو چلنا ہی تھا مگر عالم اسلام کے خطے بھی اس سے متأثر ہوئے۔ وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے مسلمانوں میں جدیدیت پسند طبقہ دوبارہ پیدا ہونا شروع ہو گیا اکبر بادشاہ نے تو دین اکبری کی بنیاد رکھ لی یہ بھی جدت پسندی کی ایک شکل تھی۔

دین عیسوی میں جدیدیت کی ایک شکل (پروٹسٹنٹ)

۱۵۴۶ء میں ایک عیسائی رہنما فوت ہوا اس کا نام مارٹن لوتھر تھا اس نے پاپائیت کے خلاف بغاوت کی پاپائیت کے خلاف آواز اٹھانے والا یہ پہلا آدمی تھا اس نے پوپ کی اتھارٹی ماننے سے انکار کر دیا اور نظریہ یہ پیش کیا کہ صرف یہی خدا کا نائب نہیں ہے اسی کو بائبل کی توضیح وتشریح کا حق نہیں ہے بلکہ ہر عیسائی خود مطالعہ کر کے رب سے رہنمائی حاصل

کرسکتا ہے۔

عیسائی بادشاہوں نے مارٹن لوتھر کی سپورٹ کی اور پوپ کے خلاف اس کی مدد کی کیونکہ بادشاہ بھی پوپ کے آگے کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے پوپ بہت مضبوط تھا۔ الغرض اصلاح دین کی تحریک کے نام سے مارٹن لوتھر نے عیسائیت میں ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی جو آج کل (پروٹسٹنٹ) فرقہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مارٹن لوتھر کی اصلاح دین کی تحریک کامیاب ہوئی پوپ کا رعب و دبدبہ ختم ہوگیا اور ایک نیا دین عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آیا جس کو اپنانا بھی قدرے آسان تھا اور پوپ کی اجارہ داری سے بھی نجات دلاتا تھا۔ حکومتی سرپرستی بھی اسی فرقہ کو حاصل ہوگئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی تیزی سے پروٹسٹنٹ فرقہ پھیلا۔ عیسائیت میں دنیا طلبی جرم کے قریب عمل سمجھا جاتا تھا اور پروٹسٹنٹ فرقے کا عقیدہ ہے کہ جس کا آخرت میں مقام جاننا ہو تو دیکھ لو اس کے پاس دنیا کا مال و متاع کتنا ہے جس کو دنیا میں کثرت سے ملا ہے۔ آخرت میں بھی اس کو کثرت سے دیا جائے گا۔

غرضیکہ اس شخص نے تمام عیسائیت کا ایسا نقشہ پیش کیا جو ان کی دنیاوی زندگی کے ہم آہنگ تھی۔ بالفاظ دیگر دین کو ماحول کے مطابق بنا کر پیش کیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خود عیسائی اصلی تعلیماتِ مسیح کے مطابق طرز زندگی اختیار کرتے مگر انہوں نے خود کو بدلنے کی زحمت کی بجائے دین کی تعلیمات بدل دیں اور ان میں طلب دنیا و جاہ کا جواز پیدا کر کے پیش کیا۔ یہ عیسائیت میں جدیدیت کی ایک شکل تھی۔

دینِ اکبری (جدیدیت کی ایک شکل)

مارٹن لوتھر ۱۵۴۶ء میں فوت ہوگیا مگر اس کے گہرے اثرات موجود تھے اور مسلمانوں میں ۱۵۴۶ء میں اکبر بادشاہ پیدا ہوا اکبر اگرچہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا خود بھی مذہبی آدمی تھا۔

اکبر کے سامنے ماقبل والا سارا دور تھا وہ اس تحریک دین اور اس کی کامیابی سے بھی واقف تھا اور اس کے حرم میں رہنے والی عورتیں بھی غیر مسلم تھیں ان کئی وجوہات نے مل کر اسکو دین اکبری ایجاد کرنے پر آمادہ کیا۔

ملاعبدالقادر نے ایک فہرست بیان کی ہے جس میں اکبر بادشاہ کی تحریف کا بیان ہے اس کا بھی نظریہ تھا کہ اسلام تو ایک ہزار سال پرانا ہو گیا ہے اور زمانہ بڑی تیزی سے گزر رہا ہے ان موجودہ حالات کو دیکھ کر حالات کے موافق دین میں تجدید کرنی چاہیے اور لوگوں کے موافق دین کو بنا کر پیش کرنا چاہیے تاکہ عمل کرنا آسان ہو۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ کام کرے گا کون؟ تو اس نے خود ہی اس کا حل بھی پیش کر دیا میں بادشاہ ہوں اس وقت میں جو سمجھ سکتا ہوں وہ سب سے بہتر ہے۔

لہٰذا میں جو حکم جاری کروں گا اس کا ماننا سب پر لازم ہوگا۔

1)۔ السلام علیکم کا طریقہ پرانا ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کلمہ کی جگہ اللہ اکبر کہا جائے اور جواب دینے والا کہے جل جلالہ۔

2)۔ شراب کی حرمت کا حکم بھی قابل عمل نہیں رہا اب دور بدل گیا ہے لہٰذا شراب کو میں حلال قرار دیتا ہوں۔

3)۔ بعض لوگ نکاح نہیں کر سکتے خواہشات تو سب ہی انسانوں کی ہوتی ہیں زنا سے رکنے کا حکم پرانا ہو گیا ہے لہٰذا اب ضروری ہے کہ اس کو جائز قرار دیا جائے۔

4)۔ اونٹ اور بیل کو حرام قرار دے دیا۔

5)۔ داڑھی رکھنا قانوناً اور شرعاً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پہلی مرتبہ داڑھی کا مذاق اڑانے کیلئے مجمعے قائم کیے گئے۔

6)۔ اکبر کو مشورہ دیا گیا کہ مسلمانوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اس کے ختنے کرتے ہیں اور یہ سنت ہے اس نے حکم جاری کر دیا کہ 15 سال سے پہلے کوئی بھی ختنہ نہ کروائے۔

7)۔ علوم عربیہ کی تعلیم ختم کر کے اس کی جگہ طب اور فلسفہ کی تعلیم کو عام کیا اور اس کا نظریہ یہ تھا کہ معاشرے کو فائدہ طب و فلسفہ سے ہوگا۔

آج ہمارے جدت پسند طبقہ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ مغربی تعلیم کو عام کرو اسی سے معاشرے میں ترقی کر سکتے ہو اور عربی تعلیم سے معاشرے کو کیا ملے گا اس بات کی سب کو فکر لاحق

ہوتی ہے کہ مولویوں کو سائنس اور کمپیوٹر کیوں نہیں سکھایا جاتا یہ سیکھ کر معاشرے میں کام کر سکتے ہیں۔

لیکن اس بات کی طرف کسی کو التفات نہیں ہوتی کہ انجینئر اور ڈاکٹر کو قرآن سکھایا جائے مارٹن لوتھر سے متاثر ہو کر اکبر نے یہ کارنامے انجام دیئے مارٹن لوتھر نے تو چند مسائل کے پیش نظر مذہب کی اصلاح کا فیصلہ کیا تھا جبکہ اسلام میں تو ان مسائل کا تصور بھی نہیں ہے مثلاً:

1)۔ جو نئے مسائل پیدا ہوتے تھے عیسائیت کے مذہب میں ان کا حل نہ تھا۔

2)۔ پاپائیت نے جاگیرداری قائم کر لی تھی اس سے تنگ آ کر اس نے بغاوت کی تھی۔

مگر یہ وجوہات اسلام میں تو نہیں پائی جاتیں اسلام میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر وسعت رکھی ہے کہ کوئی بھی قدیم و جدید مسئلہ اصولوں کی روشنی میں حل کیا جا سکتا ہے اور پاپائیت بھی اسلام میں موجود نہیں ہے۔ کہ مولوی صاحب یا مفتی صاحب کو اس قدر اختیار ہو کہ جو چاہے تفسیر اور تشریح کر دیں۔

دَورِ حاضر کے جدت پسند بھی انہی دو باتوں کو لیکر شور مچاتے ہیں کہ دین میں اجتہاد کیا جائے اور حالات کے مطابق مسائل کا استخراج کیا جائے آسان الفاظ میں یوں سمجھیں کہ اجتہاد کے نام پر دین میں الحاد پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور اس الحاد کا شرعی جواز بھی تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

عصرِ حاضر کے متجددین

آج کل کا تعلیم یافتہ طبقہ دینی امور کو بھی عیسائیت کی طرح سمجھتا ہے۔ کہ اسلام کے بیان کردہ احکام ہزار سال پرانے ہو چکے ہیں اور اب دور حاضر میں جدید مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اس کیلئے اجتہاد کی بحث چھیڑتے ہیں حالانکہ درپیش تقریباً سب مسائل کا جواب موجود ہے اگر بالفرض موجود نہ بھی ہو تو ایسے اصول موجود ہیں جن کی رہنمائی سے ہم مسائل کے جواب تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن جدت پسندوں کی ایک جماعت اس بات پر مصر ہے کہ اجتہاد کی اجازت دی جائے کوئی کہتا ہے کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دو کہ اگر کسی مسئلہ شرعیہ میں الجھن پیش آئے تو یہ حل کریں گے اور کچھ حضرت کا کہنا ہے کہ قابل اور ذی استعداد شخص کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔

اجتہاد کا مطالبہ صرف اس لیے ہے کہ اپنی من چاہی خواہشات کو دین کہہ کر عمل کرنے

کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔اجتہاد کا مطالبہ اس لیے بھی ہے کہ جب اجتہاد کا خزانہ ہاتھ لگ جائے گا تو اس کے ذریعے سود کی بھی گنجائش نکال لی جائے گی اور اس کے علاوہ وہ غیر شرعی امور جو عوام میں رائج ہیں۔ان کو اجتہاد کا لبادہ اوڑھا کر اسلامی جواز فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

حالانکہ اجتہاد کی مطلق اجازت تو کسی کو بھی نہیں ہوتی بلکہ اجتہاد کی کچھ حدود ہیں اور کچھ شرائط ہیں کچھ اصول وضوابط طے ہیں جن کی طرف دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے۔جدت پسندوں کے جزوی اعتراضات کا جواب دینے کی بجائے ہم اجتہاد کی شرائط وحدود بیان کردیتے ہیں اس کے بعد جو بھی مدعی اجتہاد ہوگا۔اس میں ان شرائط کو دیکھ لیں گے اگر پورا اترے تو اس کو اجازت ہے وہ بھی ان مسائل میں جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے کیونکہ کسی بھی منصوصی مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے اور ایسا مسئلہ جس پر اجماع ہو چکا ہے اس میں بھی اجتہاد کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

جدیدیت میں انسان پرستی کی مختلف شکلیں

انفرادی انسان پرستیIndividual human worship:

لبرل ازم، لیبر یٹرین۔اس مکتب فکر میں فرد کی آزادی کے دائرے کو وسیع کرنا سب سے اہم قدر ہے اس مکتبِ فکر کے یہاں آزادی کا انفرادی دائرہ اجتماعی دائرے کے مقابلے میں اہم ہے لہٰذا یہ مکتب فری مارکیٹ پر یقین رکھتا ہے۔آزادانہ مقابلہ کا قائل ہے۔ ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق مارکیٹ سے حصہ ملنا چاہیے۔ Each according to his abilityاس مکتب کے یہاں منفی آزادی (Positive Freedom) کا تصور ملتا ہے۔

اجتماعی انسان پرستی

نیشنل ازم (قوم)،سوشل ازم (کلاس)،فاشزم (فرد کی پرستش اجتماعیت کے لیے)،ریس ازم (نسل)،کمیونزم (کمیونٹی)، Feminism عورت (Gender) اس مکتب میں مثبت آزادی (Positive Freedom) کا تصور ملتا ہے۔

فاشزم اجتماعیت کی وہ شکل ہے جہاں اجتماعیت کسی ایک فرد میں حلول کر جاتی ہے فرد کی پرستش اس اجتماعیت کی اصل پرستش ہے اجتماعیت کا اظہار کسی ایک فرد کی پرستش کی صورت

میں ہوتا ہے جونجات دہندہ ہوتا ہے۔مسولینی،اسٹالن،اس کی مثال ہیں۔

انسان پرستی کی یہ دونوں شکلیں اصلاً آزادی کے تصور کی دو شکلیں ہیں انفرادی آزادی جسے Negative Freedom کہا جاتا ہے دوسرا اجتماعی آزادی جسے Positive Freedom کہا جاتا ہے لبرل ازم وغیرہ منفی آزادی کے حامل ہیں جہاں فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جاتی ہے مثبت آزادی کے حاملین میں انارکرزم،فیمن ازم،نیشنل ازم،فاشزم سوشلزم وغیرہ ہیں جہاں اجتماعیت کے ذریعے کسی گروہ یا طبقے یا صنف یا نوع و نسل کی آزادی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

تہذیب اسلامی کے بارے میں نظریات

پہلا نظریہ:

زمانہ قدیم سے ہی تقریباً ہر قوم میں اپنی تہذیبی برتری کا زعم رہا ہے کسی میں کم تو کسی میں زیادہ اور کسی میں بہت زیادہ غرضیکہ دو متضاد تہذیبیں اپنا الگ الگ اثر رکھتی ہیں اسلامی سوسائٹی کیا ہے یہ ایک مستقل تہذیب ہے جس کے بنیادی عقائد و مسائل وحی الٰہی سے لوگوں کو سکھائے گئے ہیں اور اس کے علاوہ باقی اکثر تہذیبوں میں مختلف تہذیبوں سے روشنی لے کر اس کا ڈھانچہ تعمیر کیا گیا ہے۔

اسلامی تہذیب کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ جس طرح دوسری قدیم تہذیبیں خاص اثر کی وجہ سے وجود پذیر ہوئی ہیں اسی طرح اسلامی تہذیب نے بھی کئی دوسری مہذب تہذیبوں سے روشنی حاصل کر کے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے ۔یہ نظریہ سراسر لغو ہے اس نظریے کی وضاحت کیلئے ڈاکٹر غلام جیلانی کی کتاب (ہماری عظیم تہذیب) سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

اقتباس:

> ''اسلام جہاں بھی پہنچا اس نے وہاں کی تہذیب سے کچھ نہ کچھ لے لیا آتش پرست کی مقدس آگ چراغ مسجد بن گئی اور ان کے کلس ہمارے مینار بن گئے یوں رفتہ رفتہ ایک ایسی حسین عظیم اور طاقت

ور تہذیب وجود میں آ گئی جس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
ہماری تہذیب کے اثرات ہر ملک کے علوم وفنون' تعمیرات' لباس'
مصوری اور رہن سہن میں پائے جاتے ہیں''۔(ہماری عظیم تہذیب' ص23)

جناب کا خیال مذکورہ بالکل فاسد ہے کیونکہ اسلامی تہذیب فکر وفلسفہ اور اسلامی سوچ کسی غیر تہذیب سے اخذ کردہ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ وحی الٰہی سے ماخوذ ہے اسی سے اس تہذیب نے رہنمائی پائی ہے اس تہذیب کے ظاہری برگ و بار بدائع وضائع دیکھ کر دوسروں کے مشابہ قرار دینا سراسر غلطی ہے۔

دوسرا نظریہ:

اسلامی تہذیب کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے یہ دونوں ایک عالمگیر وجود رکھنے کی حامل ہیں کیونکہ دونوں میں سے ایک کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے تو دوسری کی بنیاد شعور انسانی پر ہے وحی الٰہی اور شعور انسانی اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے دونوں کی کوشش معاشرے کی اصلاح ہے لہٰذا ان میں کوئی مغایرت نہیں ہے افہام و تفہیم سے آپس کی کشیدگی دور ہوسکتی ہے اور بعض حضرات کا تو یہ نظریہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی شکل جدید کا نام ہی مغربی تہذیب ہے۔ افضال ریحان کی کتاب سے لیا گیا اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

اقتباس:

''عصر حاضر کی دنیا پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دو اعلیٰ ترین اور شاندار تہذیبیں اسلامک سولائزیشن اور ویسٹرن سولائزیشن باہم مقابل آتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اگرچہ دونوں کی اپنی اپنی خصوصیات اور اپنا اپنا پس منظر ہے جس کی بناء پر کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں باہم ایک دوسری کی ضد ہیں جن میں ٹکراونا گزیر ہے لیکن ان پر جوش نعروں کے باوجود ہمارا مشاہدہ ہنوز دونوں کو قریب آتے بلکہ ایک

یونیورسل کلچر کا حصہ بنتے دیکھ رہا ہے کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے تو دوسری کی شعور انسانی پر۔ وحی اور شعور انسانی چونکہ دونوں انسان کیلئیے ایک ہی منبع حقیقی یعنی پروردگار کی طرف سے ودیعت کردہ تحفہ ہیں اس لئے ان میں مغایرت نہیں ہوسکتی گو مفادات کے کچھ بیوپاری مشرق ومغرب میں اسی کیلئے کوشاں ہیں لیکن عالمگیر انسانی فطرت پر نگاہ رکھنے والے صاحبان بصیرت دونوں کو حریف کی بجائے حلیف کی صورت اختیار کرتے دیکھ رہے ہیں''۔(اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب:ص21)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب دونوں تہذیبوں کو حریف نہیں بلکہ حلیف گردانتے ہیں حالانکہ خود وضاحت کررہے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی بنیاد وحی پر ہے اور مغربی فکر وفلسفہ کی بنیاد عقل انسانی، شعور انسانی پر ہے۔شعور انسانی اور وحی الٰہی کو ایک ہی طرح کی حیثیت دے رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وحی الٰہی میں خطا کا امکان نہیں ہے اور شعور انسانی میں خطا نہ ہو بالکل حقیقت تک رسائی میں کامیابی ہوجائے اس کا امکان بہت کم ہے اگر وحی الٰہی کو نظر انداز کر کے شعور انسانی کو ہی رشد وہدایت کا ماخذ تسلیم کرلیا جائے تو کئی اعتراضات اٹھیں گے۔

1)۔ شعور انسانی رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوجانے کے بعد وحی الٰہی کی ضرورت نہ تھی اور وحی کا نازل کرنا ایک عبث کام قرار پائے گا۔اس لیے کہ مقصد تک تو رسائی شعور انسانی سے کی جاسکتی تھی۔پھر وحی کی کیا ضرورت تھی۔

2)۔ بہت سارے عقل وشعور کے شہسوار فلسفیانہ بحثوں میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں آج تک عقلی طور پر یہ بیان نہیں کرسکے کہ انسان دنیا میں کیونکر آ گیا اور مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ جب عقل وشعور کے مدعی اپنے ماضی اور مستقبل سے بے خبر ہیں تو ان کے ظنیات وقیاسات حال کی زندگی میں بھی قابل قبول نہیں ہونے چاہئیں۔

الغرض وحی الٰہی کے بغیر رہنمائی ناممکن ہے۔

دونوں نظریوں میں امرِ مشترک:

ان دونوں نظریوں میں اگر چہ بہت فرق ہے لیکن اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں وہ امر مشترک یہ ہے کہ اسلامی تہذیب باقی تہذیبوں سے ایک جداگانہ تصور نہیں ہے بلکہ انہی تہذیبوں سے ماخوذ ایک شکل ہے یا پھر ان ہی کی ارتقائی شکل وجود میں آ کر ایک تہذیب عالمی ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے۔

پہلا نظریہ جو اسلامی تہذیب کے بارے میں پیش کیا گیا اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسلامی تہذیب جب باقی تہذیبوں سے ہی کچھ نہ کچھ لے کر تعمیر کی گئی ہے تو ان باقی تہذیبوں میں اور اسلامی تہذیب میں فرق نہ ہونا چاہیے۔

دوسرا نظریہ جو اسلامی تہذیب کے بارے میں پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کی ایک شکل جدید مغربی فکر و فلسفہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے عقل و شعور سے یہ تیار شدہ تہذیب اسلامی تہذیب کے مقابل نہ ہونی چاہیے کیونکہ ان دونوں کا ماخذ و منبع ایک ہی رب کی طرف سے عطا کردہ ہے۔

دونوں نظریوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ اسلامی تہذیب ان کے مقابل اور حریف نہیں ہے بلکہ دونوں تہذیبوں کی حلیف ہے۔

تہذیبِ اسلامی کے بارے میں تیسرا نظریہ:

اسلامی تہذیب کے بارے میں تیسرا نظریہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اسلامی فکر و فلسفہ۔ اسلامی نظریہ حیات۔ اسلامی طرز زندگی ایک نیا جداگانہ تصور ہے جو نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے جس تہذیب کا منبع و علمیت وحی سے ماخوذ ہے اور اس کا بہترین اور آئیڈیل دور دورِ نبوت ہے پھر وہ دور جو اس سے قریب ہے پھر وہ دور جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے غرض تمام گذشتہ و پیوستہ تہذیبوں سے الگ ایک تصورِ حیات ہے مغربی تہذیب کے اصول و مبادی اس سے یکسر مختلف ہیں ان دونوں میں ہم آہنگی ناممکن ہے۔ یہی نظریہ صحیح اور قرین قیاس ہے۔

تہذیبِ مغرب کے گمراہ کن اثرات

قدیم اعتراضات:

چالیس پچاس سال قبل مستشرقین کی طرف سے یا مغربی مفکرین کی طرف سے یا ہمارے یہاں جن لوگوں نے مغربی تعلیم حاصل کی تھی ان کی طرف سے اسلام پر یا عمومی طور سے مذہب پر جو اعتراضات ہوتے تھے اور شکوک وشبہات ظاہر کیے جاتے تھے وہ اعتراضات کی حیثیت سے ہوتے تھے اور ان کی شکل واضح ہوتی تھی اس لیے ان اعتراضات کو سمجھنا اور ان کا مناسب جواب دینا آسان ہوتا تھا۔

مذہب پر جدید حملہ:

لیکن اب مستشرقین نے، مغرب کے عام مفکرین نے پھر ان کی تقلید میں ہمارے یہاں تجدد پسندوں نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے یہ لوگ بظاہر اسلام یا عمومی طور پر مذہب کی تعریف کرتے ہیں مگر مذہب کا جو تصور ان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ دراصل دین میں تحریف کے مترادف ہوتا ہے یہ سارے گروہ اپنی مکمل کوشش اسی بات پر صرف کررہے ہیں کہ اسی قسم کے مسخ شدہ تصورات رواج پا جائیں عام لوگ ظاہری الفاظ پر جاتے ہیں اور ان تصورات کو قبول کر لیتے ہیں یہ معاملہ صرف اسلام کے ساتھ ہی پیش نہیں آرہا ہے بلکہ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں کی طرف سے تمام مشرقی ادیان پر حملہ ہورہا ہے۔

ہندوؤں کی عام طور پر یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کو یاد بھی نہیں رہا کہ ان کا دین کیا تھا مغرب کی طرف سے کی جانے والی تفسیر کو آنکھیں بند کرکے قبول کرتے چلے گئے۔ چنانچہ ہندوؤں میں خود ایسے مصنف پیدا ہوگئے ہیں جو انہی مغربی تفسیروں کو اصل اور ہدایت کے نام سے پیش کرتے ہیں مثلاً وویکا نند، رادھا کرشن وغیرہ نے تحریف کا دروازہ کھولا۔

مستشرقین کی طرف سے جو اسلام یا محض مذہب کے متعلق جو ایسے خیالات کی اشاعت ہورہی ہے اس میں بڑا دخل مغرب کی مسخ شدہ ذہنیت کا ہے اس کا سلسلہ پندرھویں صدی میں نشاۃ

ثانیہ کی تحریک سے شروع ہوا تو بڑھتا ہی چلا گیا اس طرح گمراہیوں کی شکلوں میں اضافہ ہوتا گیا ان گمراہیوں کی فہرست ذکر کرنے سے قبل ان گمراہیوں کی ترویج عام ہونے کی وجہ ذکر کرتے ہیں۔

علماء سے الحاد کی توثیق:

بعض مستشرقین نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے وہ علماء ومشائخ کے پاس جاتے ہیں اور استفادہ کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور اپنے سوالات ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جن کے صحیح مفہوم اور پس منظر سے علماء پوری طرح واقف نہیں ہوتے اس دجل سے جوابات طلب کر لیتے ہیں اور پھر اِسی کی تائید میں علماء کے ارشادات وتحریرات دکھاتے ہیں۔

اس کی واضح ترین مثال فرانس کا مستشرق ہنری کوربن (Henry Corbin) ہے جسکو کو زمانہ حال کا سب سے بڑا مستشرق قرار دیا گیا۔ وہ ہر مسئلہ میں یہی کرتا اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے علماء ایران سے دریافت کرلیا ہے اس طریقہ کی بدولت اس نے ایران میں اس قدر رسوخ قائم کرلیا ہے کہ تصوف اور معقولات کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا کام حکومت ایران نے اسی کے سپرد کردیا ہے۔ اسی طرح ابن عربی کی کتابوں کی طباعت بھی اس کے ذمہ لگادی۔

جب مکمل اختیار ایک مستشرق کو دے دیئے تو پھر تحریف فی الدین کا دروازہ تو کھلنا ہی تھا اس کی ایک مثال ذکر ہے۔

مثال:

اس مستشرق کے نزدیک ابن عربی نے معرفت کا ذریعہ تخیل کو قرار دیا ہے یہ واقعہ بطور مثال ذکر کیا ہے وگرنہ گمراہی پھیلانا ان کا مشن ہے ہدایت کے نام پر ضلالت پھیلاتے ہیں رہبری کے روپ میں رہزنوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔

نوٹ:

یہ صدی دین کو رد کرنے کی نہیں ہے کہ ایک چیلنج کرنے والا اٹھے اور کسی مذہب کی علمیت کو اور بنیادی تعلیمات کو عقلی طور پر غلط ثابت کرنے کیلئے کھڑا ہو جائے بلکہ اس صدی میں اور گزشتہ صدی میں بھی یہی ہوا اور ہو رہا ہے کہ خیر خواہی اور تفہیم کے انداز میں اسلام کی اور دیگر

مذاہب کی برملا تعریف کرتے ہیں اور چھپے الفاظ میں منطقی انداز میں مذہب کے بارے میں لوگوں کو بدظن کیا جاتا ہے یا کم ازکم شکوک ضرور پیدا کرتے ہیں طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ایسی اصطلاحات جو اسلام میں مقبول ہیں ان کو اپنے بیانات میں استعمال کرتے ہیں اور بڑی چابک دستی سے اصطلاحی لفظ کے سیاقِ اصلی کی جگہ کوئی اور سیاق جو کہ دراصل الحاد ہوتا ہے اس اصطلاحی لفظ کے ساتھ لگاتے ہیں اور بطور پس منظر بیان کرتے ہیں اور لوگوں کو قائل کرتے ہیں۔

مغربی ذہن کی گمراہیاں

1)۔ عقائد، عبادات اور اخلاقیات کو دین کا لازمی جزء نہ سمجھنا بلکہ ان میں سے ایک کو خصوصاً اخلاقیات کو اپنانا اور باقیوں کو چھوڑ دینا۔

2)۔ عبادات کو محض رسوم سمجھنا اور رسوم ہی کی حیثیت سے قبول یا رد کرنا۔

3)۔ اخلاقیات کو ہی مکمل دین سمجھنا اور مذہب کو صرف ایک اخلاقی نظام کہنا۔

4)۔ مذہب کو صرف ایک معاشرتی ادارہ سمجھنا مذہب کو معاشرے کی تنظیم کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھنا۔

5)۔ عقائد اور مذہب کو قدیم زمانے کے انسان کے ناپختہ ذہن کا مظہر کہنا۔

6)۔ مذہب کو انسانی ذہن کی تخلیق سمجھنا بلکہ یوں کہنا کہ انسانی ذہنی ترقی کے ساتھ مذہب بھی بدلتا رہتا ہے۔ خدا یا خدا کا تصور بھی ارتقاء پذیر ہے۔

7)۔ وسعت نظری یا آزاد خیالی کے اصول کے تحت غلط عقائد کو بھی وہی مقام دینا جو صحیح عقائد کو حاصل ہونا چاہئے۔

8)۔ معجزات اور کرامات کا انکار یا عقلی تاویل۔

9)۔ ہر دینی مسئلہ کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھنا بلکہ دین کو انسانی فکر کا نتیجہ تصور کرنا اور جو چیز عقل انسانی سے ماوراء ہے اسے انسان کی سطح پر لانے کی کوشش کرنا۔

10)۔ سائنس اور دین میں اس طرح مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کہ دین سائنسی نظریوں کے تابع ہو جائے سائنس کو آخری معیار سمجھنا۔

11)۔ احکام فقہ کو انسانی قوانین کی طرح سمجھنا۔

12)۔ یہ دعویٰ کرنا کہ دین سیدھی سادی چیز ہے اور علماء امت نے اسے پیچیدہ بنا دیا ہے دین میں سادگی پیدا کرنے کا دعویٰ۔

13)۔ تحقیق کو دینی اصولوں کے ماتحت نہ رکھنا بلکہ تحقیق برائے تحقیق۔

14)۔ یہ نظریہ کہ خالص علم کوئی چیز نہیں ہے بلکہ علم صرف وہ ہے جس کے ذریعے مادی چیز بنائی جا سکے یعنی علم کو صرف ایجادات کا ذریعہ سمجھنا۔

15)۔ اپنی ذاتی رائے سے دین کی تفسیر کرنا اور تفسیر کا حق عام کر دینا۔

16)۔ دین و دنیا کو یا تو بالکل الگ کر دینا یا پھر دین کو دنیا کے تابع کر دینا دوسرا رجحان آج کل زیادہ غالب ہے۔

17)۔ مقدس کتابوں سے سائنسی اصول اخذ کرنے کی کوشش کرنا۔

18)۔ کسی نہ کسی نظریہ کائنات کو لازمی طور پر دین کا جزء شمار کرنا اور اس حیثیت کو نظر انداز کرنا کہ کسی بھی دین میں کائنات کے نظام کا تصور ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل اللہ کی بڑائی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

19)۔ انفرادیت پرستی کا زور اس کے پہلو ہیں ایک تو ہر فرد کو دین کے معاملے میں رائے دینے کا حقدار سمجھنا دوسرا استعداد کے سوال کو نا قابل توجہ خیال کرنا۔

20)۔ دینی علوم کے بڑے بڑے اماموں کو محض افراد سمجھنا اور انہیں صرف اتنی اہمیت دینا جتنی کہ عام فرد کو دی جاتی ہے۔

21)۔ ہر معاملے میں تحریری ثبوت تلاش کرنے کی فکر کرنا۔

22)۔ علماء پر آزادی فکر چھیننے کا اور دوسری طرف مذہبی جمود کا الزام لگانا۔

23)۔ علماء کو یہ طعنہ دینا کہ ان کی ذہنیت ازمنہ وسطی کی سی ہے۔

24)۔ اس بات سے قطعی بے خبری کہ اسلام کے دینی علوم کے مماثل علوم مغرب میں موجود نہیں۔ دینی علوم کو مغربی علوم خصوصاً جدید علوم کے دائرے میں بند کرنے کی کوشش کرنا۔

25)۔ صحت مند جانور کو انسانی زندگی کا معیار بنانا۔

26)۔ جدیدیت الفاظ کے جادو سے کام لیتی ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کر کے سوچنے کی طاقت سے معطل کر دیتی ہے۔

چنانچہ کسی چیز کی تحسین کیلئے اسے جدید یا سائنٹیفک کہہ دینا کافی سمجھا جاتا ہے یا اس طرح کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں آزادی، انسانی مسرت، خوش حالی، زندگی کا معیار بلند کرنا، روزمرہ کی زندگی، عام آدمی، وغیرہ کے الفاظ مدح وذم کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

27)۔ انسان کی مادی ترقی کو ہر چیز کا معیار بنانا قناعت سے انکار کرنا۔

28)۔ مذہب کے خلاف کام اس کی مخالفت کر کے کرنے کا رواج ختم ہو چکا ہے آج کل مذہب کی مخالفت اور مذہب کو نقصان پہنچانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں تحریف کی جاتی ہے اس کی مروجہ اصطلاحات کو اصل پس منظر سے ہٹا کر پیش کیا جاتا ہے اور غلط پس منظر پیش کیا جاتا ہے اصطلاحات کی غلط تشریح لوگوں کو سمجھائی جاتی ہے۔ یعنی اصطلاح مذہبی رہے مگر اس سے مراد لیا جانے والا معنی ملحدانہ ہو۔

☆

عصرِ حاضر کے جملہ اعتراضات کا حل

اعتراضات کا حل جاننے سے قبل ہم ایک نظر ان اعتراضات کی بنیاد پر ڈالتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے لے کر اب تک جو بھی اعتراضات اِسلام پر اُٹھائے گئے ہیں وہ اہلِ مغرب کی طرف سے ہوں یا نو تعلیم یافتہ افراد کی طرف سے، وہ سب کے سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ نظر ان پر طائرانہ نظر ڈالے تو وہ بخوبی جان لے گا کہ ان اعتراضات کی بنیاد مندرجہ ذیل نظریات پر ہے:

آزادی۔ مساوات۔ ترقی۔ سائنٹِفک میتھڈ

ان کے متعلق کافی دوافی بحث عنوانات کے تحت گزر چکی ہے اور مَیں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ ان نظریات سے جو کچھ اہلِ مغرب مراد لیتے ہیں اس کا اِسلام سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا ان کی بنیاد پر اُٹھائے جانے والے اعتراضات کی بھی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی۔

یہ بات ہر مسلمان کو اپنے دِل میں جما لینی چاہیے کہ اِسلامی مسائل کو پرکھنے کا آلہ جس طرح بائبل کو بنانا غلط ہے اِسی طرح اِسلام کی جزئیات کو مغربی تصورات اور افکار پر پرکھنا بھی غلط ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دینِ مبین کی بنیاد وحی الٰہی پر رکھی ہے جو کہ عقل سے بالاتر ہے تو اِس کے مسائل کا حسن و قبح سائنس یا دیگر علوم سے معلوم کرنا درست نہ ہوگا جن کی پرواز مشاہدے یا عقل سے بڑھ کر نہیں۔ لہٰذا یہ وحی سے ثابت شُدہ مسائل کا حسن و قبح جاننے کا پیمانہ اور آلہ کیسے بن سکتے ہیں۔ آج کل تمام اعتراضات کا منہج صرف یہ ہے کہ دینِ مبین کو پرکھنے کے آلات ہی ناقص ہیں۔ جب ان ناقص آلات سے یا غلط زاویۂ نظر سے اِسلام کے عالی شان قصر کو دیکھا جاتا ہے تو بے شمار کمیاں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں اور اپنی تاریخ پر ہزاروں سوالات اُٹھتے ہیں، اپنے اسلاف کی کاوشیں بے معنی نظر آتی ہیں۔ اِن حالات میں بعض مخلص حضرات نادانی میں اپنے اسلاف کو درست ثابت کرنے کے لیے اور تاریخ پر اُٹھنے والے ہزاروں سوالات سے بچنے کے لیے یہ روش اختیار کرتے ہیں کہ موجودہ سوالات و اعتراضات کا جواب اسی تناظر میں دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ مخلصانہ مگر غیر حکیمانہ کاوش اور بھی ہزاروں سوالات کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

مثلاً ماقبل بیان کیا کہ لفظ ترقی سے اہلِ مغرب صرف مادی ترقی مراد لیتے ہیں اور اِسی سے قومیں ایک دوسرے پر فخر کرتی ہیں تو کچھ مخلص حضرات ترقی کے اِسی

معنی کو ہی اصول اور بنیاد سمجھتے ہوئے اِسلام اور تاریخِ اِسلام سے مختلف نظائر پیش کرتے ہیں کہ اُمّتِ مسلمہ بھی مادی ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہی اور اپنے اسلاف کی کوششوں کو درست ثابت کرنے کے لیے اور تاریخ سے اِس داغ کو دھونے کے لیے مسلمان سائنس دانوں اور ان کی ایجادات کو نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے اور اس بات کی طرف التفاف نہیں کیا جاتا کہ مادی ترقی مسلم امہ کا کبھی ہدف ہی نہیں رہا۔ ان کے نزدیک تو ترقی یہ تھی کہ بندہ کا تعلق اپنے مولیٰ سے مضبوط ہو۔ جس قدر تعلق مضبوط ہوگا اتنا ہی ترقی یافتہ ہوگا۔ تو اسلاف کی محنت کو اس زاویہ سے دیکھو گے تو فقہاء کا کام عیب معلوم نہ ہوگا۔ یہی حال ہے تمام مغربی افکار کا جب اسلام کا اس ناقص دوربین سے مشاہدہ کیا جاتا ہے تو نقص نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر تحریر میں مَیں نے ان کا نقص واضح کیا ہے کہ یہ آلات، نظریات وافکار اِسلام کی جزئیات کو ثابت کرنے کے لیے کسی بھی طرح موزوں نہیں۔ اِسلام دینِ الٰہی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہی بتا سکتا ہے کہ مسئلہ کس طرح ہے اور کیوں ہے۔

جو حضرات اِسلامی جزئیات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں قرآن وسُنت کے علاوہ کسی دوسری چیز مثلاً سائنس یا قدیم فلسفہ، جدید فلسفہ وغیرہ سے تو وہ لوگ اپنی اس عبث حرکت پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مخاطب قرآن وسُنت کو تو مانتا نہیں ہے لہٰذا تم اس کی سطح پر آ کر دلیل دو تا کہ مذہب اسلام کی حقانیت واضح ہو کہ اِس کو کسی بھی معیار پر چیک کر لو یہ درست اور حکمتوں سے بھرپُور رہے۔ مثلاً سائنس یا عمرانی علوم کے ذریعے دینِ اِسلام کی جزئیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اِس خیال کو ردّ کرنے کی بجائے میں ایک سوال قارئین سے پوچھتا ہوں کہ ایک مسلمان اور عیسائی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ ایک یہودی اور مسلمان میں کیا فرق ہوتا

ہے؟ ایک ہندو اور سکھ کو مسلمان سے الگ کیوں سمجھا جاتا ہے؟ تو آپ کا جواب یہی ہوگا کہ عیسائی کو ہم اپنے سے الگ اِس لیے سمجھتے ہیں کہ وہ حق اور باطل کو جاننے کا معیار بائبل قرار دیتا ہے۔ ہندو حق اور باطل کو جاننے کا معیار اپنی مذہبی کتاب (وید) کو قرار دیتا ہے۔ سکھ صحیح اور غلط کا معیار گرنتھ کو ٹھہراتا ہے۔

مسلمان ان سب سے الگ اِس لیے ہیں کہ وہ صحیح و غلط، حلال و حرام جاننے کا معیار و پیمانہ وحی (قرآن و سُنت) کو ٹھہراتا ہے۔ اِسی طرح لبرل ازم یا سکولر خیالات کا مالک انسان صحیح و غلط کو جاننے کا معیار شعورِ اِنسانی (سائنس، تمام علوم طبعی) کو ٹھہراتا ہے۔

ان معیاروں کے مختلف ہونے کی وجہ سے یہ افراد الگ ملّت و الگ قوم کا حصّہ سمجھے جاتے ہیں۔

اگر کوئی انسان یہ کہے کہ میں ایک لمحہ کے لیے بائبل کو یا گرنتھ کو اصول اور کسوٹی مان لیتا ہوں۔ پھر اِسلامی مسائل کے متعلق بات کرتے ہیں۔ اِس صورت میں اگر وہ اپنا مکمل دین بائبل یا گرنتھ سے ثابت بھی کر دے تو اس کا آخر میں نتیجہ کیا نکلے گا کہ اِس شخص نے کفر کی کسوٹی اور منہاج کو اصول کے طور قبول کیا اور اِسی کو مضبوط کیا۔

کفر کے پلڑے میں بیٹھ کر اگر چند جزئیاتِ اِسلام ثابت بھی کر دی جائیں تو نتیجہ فتح کفر ہی کی سمجھی جائے گی۔ آپ کی لمبی لمبی مباحث اور شاندار مکالمے بے اثر اور فضول ہوں گے کیونکہ باطل سے آپ کی جنگ صرف اور صرف اِس لیے تھی کہ وہ قرآن و سنّت کو منہاج و اصول نہیں مانتا تھا۔ قرآن و سُنّت کی حقّانیت کا قائل نہیں تھا۔ اپنے مسائل کا حل احکم الحاکمین کے علاوہ کسی اور چیز میں تلاش کرتا تھا۔

اگر شریعت کے مسائل کی دلیل قرآن و سُنت سے ہی دینے کو لازم سمجھا جائے اور اس کے علاوہ کسی اور کو پیمانہ تسلیم نہ کیا جائے خواہ سائنس ہو یا عصرِ حاضر کے مسلمہ

نظریات تو تمام اعتراضات کا غبار اِسلام سے چھٹ جائے گا۔ ماقبل میں عصرِ حاضر کے نظریات غلط ہونے پر بحث گزر چکی ہے۔ اگر مسلمان بھی نادانی سے انہی کے اصولوں کو اصول وکسوٹی مانے تو جھگڑا کس بات کا ہے۔

محترم! آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

جو آخر میں ثابت کرنا تھا اس سے تو آپ نے پہلے ہی دست برداری کا اعلان کر دیا۔

اگر کوئی سوال کے جواب میں قرآن وسُنت سے دلیل لینے کے بعد بھی سائنٹفک میتھڈ کی دلیل کا طالب ہو اور کسی اور دلیل کا مطالبہ کرے تو اس کو شریعت کی جزئیات سمجھانے کی بجائے اس کے ایمان کے گراف پر محنت کرنی چاہیے۔ اب یہ رواج عام ہو رہا ہے کہ مسئلہ کی قرآنی دلیل آجانے کے بعد عقلی دلیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو کہ عبث وفضول ہے۔

اگر حکمت کے طور پر کوئی علمی حکمت بتانی بھی ہو تو اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ مخاطب کی ذہنی سطح کو ضرور دیکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عقلی حکمتوں کو علت اور مسئلہ کے ہونے کی وجہ سمجھتا رہے۔ اِسلامی مسائل کی علتیں تو محض احکامِ الٰہی سے ثابت ہیں۔ باقی حکمتیں تو وقت، علاقہ، ماحول، حالات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہیں۔ اہلِ عِلم کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام میں شعور بیدار رکھیں کہ فلاں مسئلہ کا حکم اس طرح ہونے کی وجہ صرف اور صرف حکمِ الٰہی ہے۔

اگر مسائلِ شرعیہ کی دلیل قرآن وسُنت سے دینے کو لازم سمجھا جائے اور اِس کے علاوہ کسی اور چیز کو اصول، کسوٹی اور پیمانہ تسلیم نہ کیا جائے۔ خواہ سائنس ہو یا عصرِ حاضر کے مسلمہ نظریات۔ تب ہی اِسلام سے تمام اعتراضات کا غبار چھٹ سکتا ہے۔

o……☆……o

خاتمہ

زمانہ جس طرح خیر القرون سے دور ہوتا جا رہا ہے اس میں گمراہیاں ظلمتیں اور اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں شب دیجور کا یہ منظر ایمان والوں کے لیے کٹھن ہے نئے نئے فتنے جنم لے رہے ہیں۔ ان حالات میں رحمت عالم ﷺ کی تعلیمات کے علاوہ کوئی اور قلعہ و آماجگاہ طوفان گمراہی سے ہمیں نہیں بچا سکتا جس طرح چودہ سو سال قبل وہ ہادی عالم تھے آج بھی وہی ہادی عالم ہیں جس طرح چودہ سو سال قبل ان کی تعلیمات سے کفر و جہالت کے بادل چھٹ گئے اور ایک غیر مہذب قوم مختلف قوموں کو بڑی شان سے لیکر چلی۔ ان کی معاشرت و طرز زندگی محبت و خلوص کے ایسے عالی شان واقعات تاریخ نے رقم کئے کہ پوری انسانی تاریخ اس سے خالی نظر آتی ہے۔ یہ سارے علم و حکمت، محبت و امن کے خزانے انہوں نے رحمت عالم ﷺ سے حاصل کیے تھے آپ کے اخلاق و سیرت کو اپنا کر دنیا و آخرت کی سروری کے اہل ہوئے تھے۔

آج بھی فلاح، ترقی، کامرانی، عظمت و شرافت دنیا و آخرت کی کامیابی صرف اور صرف آپ ﷺ کے طریقوں میں ہے آپکی سنت کے علاوہ باقی تمام طریقے گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

یہ آیت ہر زمانے والوں کے لیے ہے اور ہر جگہ والوں کے لیے ہے تمام قسم کے زمان و مکان کی قید کے بغیر ہے۔ آپ ﷺ بہترین نمونہ جس طرح عرب والوں کے لیے ہیں اسی طرح عجم والوں کے لیے بھی ہیں۔ جس طرح چودہ سو سال قبل اس کا مصداق رحمت عالم ﷺ تھے آج بھی اس کا مصداق آپ ﷺ ہی ہیں۔ جب سے امت مسلمہ نے کامرانی کے نقشے اس کے علاوہ چیزوں میں تلاش کرنا شروع کر دیئے اسی دن سے تنزلی کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ اور فتنوں کے دروازے کھل گئے۔

دَورِ حاضر میں تو تمام جدید و قدیم فتنے شکلیں بدل بدل کر ایمان پر شب خون مار رہے

ہیں۔ دورِ حاضر میں فتنوں سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔

ارشاد نبوی ﷺ

قال رسول الله ﷺ امابعد فان خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد ﷺ وشر الامور محدثاتها وكل بدعة ضلالة

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا حمد وصلاۃ کے بعد بلاشبہ بہترین بات کتاب اللہ ہے اور بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے برے ترین امور نئے پیدا ہونے والے معاملات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

یہی وہ دَور ہے جس میں اعمال کی قیمت بڑھادی گئی ہے آپ نے فرمایا کہ آخری زمانہ میں جب دین اجنبی ہوجائے گا اس وقت ایک سنت پر عمل کرنے والے کو 100 شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

حدیث نبوی ﷺ

وعن ابى هريره رضى الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من تمسك بسنتى عند فسادامتى فله اجر مائة شهيد

وفى المرقاة. (بسنتى عند فسادامتى) اى عند غلبة البدعة والجهل والفسق فهم فله اجر مائة شهيد

بدعت وجہالت اور فسق کے غلبہ کے وقت ایک سنت پر عمل کرنے سے 100 شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔ یہی وہ فتنوں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں جتنے فتنے منڈلاتے پھرتے ہیں پہلے کبھی اسلام پر اتنی شدت سے حملہ آور نہ ہوئے تھے۔

اٹھارہویں انیسویں صدی میں جو اعتراضات کیے جاتے تھے ان کو سمجھنا اور ان کا جواب دینا قدرے آسان تھا مگر اب دشمن نے انداز بدل لیا ہے رہبروں کے روپ میں رہزنی

کی جاتی ہے پہلے اسلام و دیگر مذاہب کی تعریفات کرتے ہیں پھر مروجہ اصطلاحات کا غلط مطلب و غلط تشریحات پھیلاتے ہیں۔

فتنوں کی مختلف شکلیں:

ایک زمانہ تک عقلیت و یونانی فلسفہ کا غلبہ تھا لوگ عقل وفلسفہ کی کسوٹی پر اسلام کے مسائل واحکام پرکھتے تھے اس بنیاد پر اعتراضات اٹھاتے تھے جیسا کہ معتزلہ۔ پھر ایک دور آیا کہ عقلیت وفلسفہ کی بنیادوں کو امام غزالی نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا کئی سو سال تک یونانی فلسفہ پر موت طاری رہی۔

18 صدی میں یہ ایک نئی شکل میں سامنے آیا جس کو فلسفہ جدید یا مغربی تہذیب سے تعبیر کر سکتے ہیں اسی کے تیار کردہ اصول ومبادی کی بنیاد پر اعتراضات اٹھائے جاتے تھے۔ پھر مشاہدہ (سائنس) کو بطور دلیل تسلیم کرنے کا رواج عام ہوا۔ کہ بندہ کہتا تھا میں ہر اس چیز کا مانوں گا جس کو دیکھ لوں اور اگر میں نہ دیکھ سکوں تو اس کا انکار کروں گا۔ مشاہدے کی موجودہ شکل سوشل سائنس ہے۔ پھر اسلام پر اعتراضات نے ایک نیا رخ بدلا اور سائنس کے اعتبار سے جو بات خلاف ہوتی اس کو اعتراض بنا کر پیش کیا جاتا۔ کچھ مفکرین نے وجدان کو بڑی اہمیت دینی شروع کی اور اسلام میں نقص تلاش کرنے لگے۔

فتنوں کا دَور:

اب یہ تمام اعتراضات بیک وقت اسلام کا رخ کیے ہوئے ہیں یونانی فلسفہ بھی مغربی فلسفہ میں کبھی کبھی جھلک دکھاتا ہے۔ عقلیت کا تو خاص اثر 17 صدی کے بعد جاری ہوا اور اب تک شدت کے ساتھ باقی ہے لوگ مسئلہ پوچھنے کے ساتھ ہی یہ پوچھتے ہیں جناب اس کی کوئی عقلی ومنطقی دلیل ہے۔ حدیث کے بعد قرآن کی آیت پیش کرنے کے بعد عوام کا عقلی و منطقی دلیل کا مطالبہ کرنا ان کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ مشاہدہ یعنی سوشل سائنس سے پیدا ہونے والے اعتراضات بھی اسی دور میں ہیں۔ پہلے صرف یونانی فلسفہ کو تسلیم کرنے سے یا عقلیت کی وجہ سے اعتراض ہوتا تھا۔ لیکن یہ نوعیت صرف اس دور میں ہے۔

اعتراض کرنے والے کی ذہنیت ایک ہو تو مطمئن کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جب

ذہنیت ایک نہیں ہے کبھی سائل و معترض مغربی اقدار کی حفاظت کرتے ہوئے خطاب کرتا ہے اور کبھی سائنسی اشکالات پیش کرتا ہے اور کبھی عقلی توجیہات سے اسلام کی شکل مسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر میں وجدان اور عدم مطابقت کا سہارا لیتا ہے۔ غرض یہ تمام چیزیں اکیسویں صدی کے اندر جمع ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کسی فتنہ کے تعاقب میں علماء کی ایک جماعت اٹھتی ہے تو اس فتنہ کو دباتے دباتے کئی اور فتنے جنم لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات اپنے افراد لاشعوری طور پر مخلص ہونے کے باوجود دشمن اسلام کے ہاتھوں استعمال ہو جاتے ہیں۔ ایک جانب سے دفاع کرتے ہیں تو باقی تین جانبوں سے اور مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آخری گزارش

ان حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ غلبہ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل تمام قوتوں کو خواہ وہ عسکری، معاشرتی، سماجی یا سیاسی نوعیت کی ہوں یا فکری نوعیت کی ہوں ان سب کو باہم ایک دوسرے سے مربوط کر کے ایک دھارے میں سمو دیا جائے اور کسی ایک کے کام کو کسی دوسرے کے کام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور ہر کام کو غلبہ اسلام کے ہمہ وقتی اور آفاقی کام کا حصہ سمجھا جائے اور اس کو جزو لاینفک سمجھا جائے۔ اللہ تعالیٰ غلبہ اسلام اور افشاء اسلام کے لیے ہمیں قبول فرمائے۔ اور اس سعی کو بھی اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین!

الحمد لله لک الحمد کما انت اهله
وصل علی محمد کما هو اهله
ورحم علی اساتذ تنا بقدر رحمتک
واغفر ذنوبنا بقدر مغفرتک.

(آمین!)

حصّہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

دین اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دین میں پیدا کیے جانے والے شبہات اور اٹھائے جانے والے اعتراضات کا قلع قمع کرنا اہل علم کی ذمہ داری ہے تا کہ عوام الناس دین اسلام کو الحق سمجھ کر قبول کریں۔

الحمدللہ علماء امت نے اس کام کو ہر دور میں احسن طریقے سے سرانجام دیا عقل پرستوں نے جس شکل میں بھی سر اٹھایا، اہل علم نے دلائل کے میدان میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلام کا علم کبھی بھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ اسلام پر جب بھی کسی نے فکری حملہ کیا اور اسلامی نظریات اور عقائد کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی تو علماء امت نے انہیں ان ہی کے ہتھیاروں سے شکست دی اور اسلامی افکار و نظریات کو ہر طرح کی فکری آلائش اور غیر اسلامی نظریات سے محفوظ رکھا۔

جب اسلام جزیرۃ العرب سے پھیلتا ہوا روم و شام تک پہنچا تو اس وقت یونانی فلسفہ و منطق کا عروج تھا، قدیم سائنسی تحقیقات بے حد مقبول تھیں لوگوں کے ذہن یونانی فلسفہ اور قدیم سائنسی نظریات سے متاثر تھے اس لیے ان لوگوں کے اعتراضات اور اسلام پر شبہات اسی بنیاد پر ہوا کرتے تھے۔ مثلاً قدیم سائنس کا نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اس کے گرد کرہ ہوائیہ ہے، کرۃ الماء اور کرۃ النار ہے وغیرہ اس لیے معراج النبی ﷺ پر اعتراض کیا جاتا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کروں سے آپ ﷺ گزرے اور ان کا خرق والتیام کیسے ہوا؟ اسی طرح جزء الذی لایتجزی کی بحث سے قیامت کے اثباب وانکار پر دلائل دیئے جاتے تھے۔

عصر حاضر میں نہ تو یونانی فلسفیانہ افکار کی کوئی حیثیت باقی ہے اور نہ ہی قدیم سائنسی نظریات کو قبول کیا جاتا ہے اسی لیے آج کے دور میں اس طرح کے اعتراضات نہیں اٹھائے جاتے کیونکہ جس ذہنیت و علمیت کی بنیاد پر اعتراض قائم کیے جاتے تھے وہ علمیت رد کی جا چکی ہے۔ ۱۷ صدی عیسوی کے بعد جب یونانی فلسفہ بے بنیاد ہو کر رہ گیا اور قدیم

سائنسی نظریات رد کر دیئے گئے تو یونانی فلسفے کی جگہ جدید فلسفہ/فلسفہ مغرب نے لے لی اور قدیم سائنس کی جگہ سوشل سائنس آ گئی جو بہت سی ایجادات کا محرک بنی۔

دور حاضر میں اہل مغرب کی حیرت انگیز ترقی اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی سائنسی ایجادات سے اقوامِ عالم بے حد متاثر ہیں اس لیے ان کی علمیت کو غالب علمیت تصور کیا جاتا ہے اور انہی کا فلسفہ، تصور حیات دور حاضر میں مقبول ہے اور اسی فلسفہ، اسی تصور حیات، اسی علمیت سے متاثر ہو کر اسلام پر اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں اور دین میں شبہات پیدا کیے جاتے ہیں۔

چونکہ قدیم اعتراضات اور عصر حاضر کے اعتراضات کے محرک الگ الگ ہیں، ایک کا محرک یونانی فلسفہ اور قدیم سائنس ہے دوسرے کا محرک فلسفہ جدید/مغربی فلسفہ ہے اس لیے اعتراضات اور شبہات بھی الگ الگ ہیں۔

<u>عصرِ حاضر کے اعتراضات کچھ اس طرز کے ہیں:</u>

مثلاً:

۱۔ مرد چار شادیاں کر سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں؟

۲۔ اسلام عورتوں کو گھروں میں محبوس کیوں رکھتا ہے؟

۳۔ طلاق کا حق صرف مرد کو کیوں؟

۴۔ اگر اسلام میں حق اظہار رائے ہے تو پھر انبیاء اور معزز ہستیوں کی گستاخی کو برا کیوں منایا جاتا ہے؟

۵۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر کیوں نہیں ہیں؟

۶۔ مرد کی مرد سے شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟

۷۔ اسلام اقلیتوں کے مساوی حقوق تسلیم کیوں نہیں کرتا؟

۸۔ وراثت میں مرد کے مقابلے میں عورت کا حصہ آدھا کیوں؟

۹۔ ہر انسان کو مذہبی آزادی ہے مرتد کو اسلام قتل کا حکم کیوں دیتا ہے؟......وغیرہ ذلک

فلسفہ جدید سے محض یہ اعتراضات ہی نہیں اٹھتے بلکہ عصر حاضر میں رائج الوقت نظام، جمہوریت، سرمایہ دارانہ نظام ، سوشل ازم، ہیومن رائیٹس ،سول سوسائیٹی، ٹیکنو سائنس، لبرل ازم انھی بنیادوں پر کھڑے ہیں اور پارلیمنٹ میں منظور ہونے والے قوانین بھی اسی فکر و فلسفہ کو ملحوظ خاطر رکھ کر بنائے جاتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر تمام عدلیہ پابند ہیں کہ کوئی ایسا حکم صادر نہ فرمائیں جو مغربی فلسفہ/فلسفہ جدید کے متصادم ہوں۔

فلسفہ جدید سمجھے بغیر نہ تو ان اعتراضات کا غبار اسلام سے چھٹ سکتا ہے اور نہ ہی نظامِ کفر کو کمزور کرنے کی کوئی سعی کارآمد ہو گی اور نہ مغربی یلغار سے اسلامی اقدار کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ہمارا مذہبی معاشرہ بڑی تیزی سے لبرل، سیکولر ہو رہا ہے جس میں بنیادی کردار میڈیا ادا کر رہا ہے عوام کو ایک بات نہایت عاقلانہ، عادلانہ اور معقول بات کہہ کر سمجھائی جاتی ہے جو بلواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اسلامی نظریات کو متاثر کرنے والی ہوتی ہے۔ جب منبر و محراب سے ان موضوعات پر مکمل سکوت ہوتا ہے یا اس فکری حملہ کی حقیقت سے ناآشنائی کی وجہ سے اور اپنے ماحول سے متاثر ہو کر بعض اوقات اس کی تائید میں ایک دو جملے ادا کر دیے جاتے ہیں، تو وہ خیال عوام میں راسخ ہو جاتا ہے۔

اِن مباحث میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آج کا کفر ایمان کے کس حصہ پر حملہ آور ہو رہا ہے اور طریقہ کار کیا اختیار کیا جاتا ہے غیر اسلامی نظریات کو کس انداز سے اسلام کا رنگ دے کر پیش کیا جاتا ہے اور کس طرح عصر حاضر میں مغربی افکار اور اسلامی نظریات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

کفر کا یہ حملہ تمام ان حملوں سے زیادہ اشد اور نقصان دہ ہے جو اسلامی تاریخ میں ہمیں ملتے ہیں جب یونانی فکر و فلسفہ کی یلغار اسلامی علمیت پر ہوئی اس وقت اسلام کی حالت یہ تھی کہ یہ تین براعظموں پر حکومت کر رہا تھا۔ اسلامی علمیت محض تصورات کی شکل میں ہی نہ تھی بلکہ اس کا مظہر خلافت کی شکل میں، حدود و قصاص کے نفاذ کی شکل میں اور شریعت کے کامل نفاذ کی شکل میں موجود تھا۔ اسلام کا حسن و قبح واضح تھا۔ اس لیے یونانی فلسفہ اسلامی علمیت کو

متاثر نہ کر سکا جیسا کہ مذہب عیسائیت کو اس نے متاثر کیا۔

دوسرا بڑا حملہ عالم اسلام پر تاتاریوں کی طرف سے تھا انہوں نے کچھ ہی عرصہ میں مسلمان حکومتوں کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا ان کے پاس صرف گھوڑے، تلواریں اور خوں خواری تھی مگر کوئی خاص فکر، نظریہ حیات، علمیت و کتاب نہ تھی جو اسلامی علمیت کے سامنے قرار پکڑتی جس سے عوام کو متاثر کیا جاتا اس لیے ان کا تسلط زیادہ دیر نہ چل سکا۔

اس حیثیت سے مغربی یلغار اسلام پر تیسرا بڑا حملہ ہے۔ یہ نہ تو یونانی فلسفہ کی طرح صرف نظریاتی ہے اور نہ ہی تاتاریوں کی طرح محض سیاسی۔ اہل مغرب سیاسی تسلط کے ساتھ ساتھ فکری میدان میں بھی ایک خاص نظریہ حیات کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

خاص قسم کے عقیدے، علمیت خاص قسم کی طرزِ سیاست، اندازِ معاشرت اور خاص طریقہ معیشت پر یقین رکھتے ہیں اور انہی خاص نظامہائے زندگی کو جس نے مغربی فکر و فلسفہ سے جنم لیا ہے اسی کو انسانیت کی بقاء اور ترقی کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ اقوامِ عالم کو یہی باور کروایا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانیت کی فلاح، ترقی، بقاء اور ارتقاء کا ضامن صرف وہ نظامِ زندگی ہے جس کی طرف اہل مغرب بلا رہے ہیں۔ مثلاً:

- لبرل ازم
- ہیومن ازم
- سیکولر ازم
- سرمایا دارانہ نظام معیشت
- جمہوریت
- سول سوسائیٹی
- انلائیٹمنٹ (روشن خیالی)
- ماڈرن ازم (جدیدیت)

اہلِ مغرب اپنے ان نظریات کے علاوہ تمام عقائد و افکار اور نظامہائے زندگی خواہ وہ الہامی کتب سے ماخوذ ہوں یا غیر الہامی سے ان سب کو گمراہی اور جہالت قرار دیتے ہیں اور عصر حاضر میں ترقی، روشنی اور ہدایت انہی افکار اور نظاموں کو قرار دیا جاتا ہے جو اہل مغرب نے خاص علمیت کے تناظر میں قائم کیے ہیں۔

اِس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اِن نظریات کی وضاحت ہو کہ لبرل ازم، ھیومن ازم،

سیکولرازم، جمہوریت، سرمایادارانہ نظام معیشت، سول سوسائٹی، انلائیٹمنٹ (روشن خیالی) وغیرہ یہ کیا ہیں؟ کس طرح معاشرے ان چیزوں کو الحق سمجھ کر قبول کرتے ہیں؟ اور کفر کی یہ شکلیں دین میں کس طرح شکوک وشبہات پیدا کرتی ہیں؟ مبینہ مغربی افکار اور نظامہائے زندگی میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔

اسلامی افکار اور مغربی افکار میں کس درجہ کا تفاوت ہے اور اس کے دجل کی کیا کیا صورتیں ہیں۔مغربی طرزِ زندگی اور تصورِحیات میں کیا کیا شرور وفتن ہیں جو اسلامی طرزِ زندگی میں نہیں۔اور انسانی فلاح کی شکلیں جو مغرب پیش کررہا ہے سب کی سب ناقص کیوں ہیں؟

طالبِ دعا!
محمد احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

مقدمہ

<u>قال اللہ تعالیٰ:</u>

آلــر کتٰـب انـزلنه الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور......(ابراھیم)

ترجمہ: **الف، ل، ر** یہ ایک کتاب ہے ہم نے اسے آپکی طرف نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالیں۔

ظلمات جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے اور النور واحد کا، یعنی جہالت گمراہی و ذلالت کی کئی شکلیں ہیں اور ہدایت و رہنمائی کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اسی بات کو جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک مثال سے سمجھایا، حضور اقدس ﷺ نے ایک دفعہ ایک سیدھی لائن کھینچی پھر اس کے دائیں جانب اور کچھ بائیں جانب دوسرے خط کھینچے، پھر اپنا ہاتھ سیدھے خط پر رکھا کہ یہ صراط مستقیم ہے، اس کے علاوہ دائیں یا بائیں آگے یا پیچھے جو بھی راستہ، طریقہ یا انداز ہے وہ سب شیطان کے گمراہ کرنے کے طریقے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا:

عـن ابن مسعود رضی الله عنه قال خط رسول الـلـه ﷺ خـطـا بیده ثم قال هذا سبیل الله مستقیما ثم خـط خـطـوطآ عن یمن ذلک الخط و عن شماله ثم قال

:وھذہ سبل لیس منھا سبیل الا و علیه شیطان ید عو الیه " ثم قرأ و ان ھذا صراطِی مستقیماً فاتبعوہ و لا تتبعوا السبل " الآیه(فتح المجید شرح کتاب التوحید)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک خط کھینچا پھر فرمایا؟ یہ اللہ کی طرف جانے والا یعنی ہدایت کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر کچھ اور خط کھینچے اس سیدھے خط کے دائیں جانب اور بائیں جانب پھر فرمایا کہ یہ دائیں اور بائیں جانب والے راستے اس سیدھے راستے سے نہیں ہیں، ان مختلف راستوں پر شیطان بیٹھا ہے جو اس سیدھے راستے سے ہٹا کر دوسرے راستوں پر انسان کو چلانا چاہتا ہے اور شیطان ان غلط راستوں کی طرف بلاتا ہے، دعوت دیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

و ان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ و لا تتبعوا السبل

ترجمہ: اور بے شک یہ سیدھا میرا طریقہ ہے پس اس کی اتباع لازم پکڑ و اور دوسرے طریقوں کے پیچھے مت چلو۔

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا طریقہ ہی راہنمائی اور ہدایت ہے، راہِ سنت کے علاوہ کسی اور فکر و نظریے کا اختیار کرنا جہالت اور گمراہی ہے" آپ ﷺ کی تعلیمات کے علاوہ آپ کے طریقہ زندگی کے علاوہ باقی سب طریقے جہالت کی مختلف شکلیں ہیں۔

جہالت کی ایک شکل وہ ہے جو کفارِ مکہ اپنائے ہوئے تھے، جہالت کی ایک شکل وہ ہے جو کہ عیسائی اپنائے ہوئے تھے، جہالت کی ایک شکل وہ ہے جس پر یہود و ہنود زندگیاں بسر کر رہے تھے اور جہالت کی ایک شکل وہ ہے جس کو مجوسی (آگ کی پوجا کرنے والے) اپنائے ہوئے تھے۔

جہالت وگمراہی کی مختلف شکلوں کولوگ مذہبانہ عقیدت کے ساتھ اپنائے ہوئے تھے، جہالت کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل وہ تھی جس کولوگ مذہب تو نہیں سمجھتے تھے مگر ان نظریات کو صحیح اور حق جانتے تھے۔مثلاً سقراط اور افلاطون کے افکار اسی طرح ارسطو کی تعلیمات،اوران کا بیان کردہ نظامِ زندگی،ان کا بیان کردہ نظام سیاست وغیرہ یہ بھی جہالت اورگمراہی کی ایک شکل ہے۔جس کولوگ اپنائے ہوئے تھے۔

جس وقت آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو زمین کے خطے مختلف جہالتوں میں گھرے ہوئے تھے عرب ہو یا عجم فارس ہو یا روم۔روم کے لوگ اگرچہ عیسائی تھے مگر افلاطون اور ارسطو کے نظریات سے اس قدر متاثر تھے کہ مذہب عیسائیت کے بنیادی عقائد بھی اپنی اصلی حالت پر نہ تھے۔آپ ﷺ نے انسانیت کوان تمام جہالتوں سے نکالا اورایک ایسے طریقہ زندگی کی طرف دعوت دی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قل ان كنتم تحبون الله فتبعونی يحببكم الله

ترجمہ: اگرتم مجھ سے محبت کرتے ہوتو نبی اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پرچلو، مالک کائنات تم سے محبت کرنے لگے گا۔

صحیح کیا ہےاور غلط کیا ہے یہ جاننے کے لیے دنیا نے مختلف معیار بنائے ہوئے ہیں کوئی کہتا ہے میں اس کے بارے میں دیکھوں گا اپنے مذہب ہندومت کی کتاب وید سے یاسکھ کہتا ہے کہ میں دیکھوں گا اپنی کتاب گرنتھ سے یا عیسائی کہتا ہے میں دیکھوں گا بائبل سے تو یہ سب لوگ غلط راستے پر ہیں۔

اِسی طرح وہ شخص بھی گمراہ اور بددین ہے جو یہ کہتا ہے کہ صحیح کیا ہےاور غلط کیا ہے مجھے کیا کرنا چاہئے۔میں نہ بائبل سے دیکھوں گا نہ گرنتھ نہ ہی وید سے نہ قرآن سےاور نہ ہی کسی اور مذہبی لٹریچر سے بلکہ میں محض اپنی عقل سے رہنمائی لوں گا جو مجھے صحیح لگے میں کروں گا جو غلط لگے اسے چھوڑ دوں گا۔یہ کتابیں اگر میرے خیالات کی تائید کریں تو یہ اچھی کتابیں ہیں اوراگر کہیں میرے خیالات سے متصادم ہوں تو مجھے ان کی پرواہ نہیں،میں وہ طریقۂ زندگی اختیار

کروں گا جو مجھے اچھا لگے ، اس قسم کی جہالت و گمراہی کو عصرِ حاضر کی زبان میں کہتے ہیں (Enlightenment روشن خیالی) یعنی صحیح اور غلط کو جاننے کا معیار نفسِ انسانی ہے ، یہ بھی جہالت ہے۔

صراطِ مستقیم تو یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ جس کو غلط بتلائیں اس کو غلط سمجھا جائے اور جس کو صحیح اور حلال بتائیں اس کو صحیح اور حلال سمجھا جائے ، اس کے علاوہ کسی بھی اور چیز کو معیارِ حق و باطل بنانا جہالت و گمراہی ہے خواہ کوئی بائبل کو معیار بنائے یا ارسطو اور افلاطون کے افکار کو یا گرنتھ کو وید کو یا نفسِ انسانی کو یعنی اپنی عقل ، وجدان ، تجربے یا مشاہدے کو۔

عصرِ حاضر میں عام مسلمان عیسائیت سے راہنمائی حاصل کرنے یا ہندوانہ طریقہ زندگی اختیار کرنے کو خلافِ دین و شرع تو سمجھتے ہیں ۔لیکن اگر کوئی راہنمائی کے لیے معیار نفس انسانی کو سمجھتا ہے تو اِسے اس درجے کی گمراہی تصور نہیں کیا جاتا ۔ حالانکہ اس دور میں کسی بھی مذہب کو آئیڈیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ جس تصور کو نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ ہے Humanism (ہیومن ازم)، (انسانیت پرستی) یعنی غلط صحیح جاننے کا معیار نفس انسانی ہے ۔سیکولرازم ، لبرل ازم ، جس کی دو بڑی شاخیں ہیں ۔آج کل لبرل سوسائٹی ، لبرل حکومتی ڈھانچہ ، سیکولر سسٹم کو بہترین سسٹم عمدہ اور مثالی نظام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ،سترہویں صدی عیسوی کے بعد جہالت کی اس شکل کو بہت عروج ملا اور دنیا کی بہت ساری حکومتیں اور کئی معاشرے ان جاہلانہ نظریات سے متاثر ہوئے اپنے آپ کو سیکولرازم اور لبرل ازم اور ماڈرن ازم کے حامی گردانتے ہیں۔

آج اسلام کے مقابلے میں نہ تو عیسائیت ہے نہ یہودیت اور نہ ہی کوئی اور مذہب کیونکہ ان مذاہب کے پیروکار بھی مانتے ہیں کہ ان کے مذہب میں بھی مکمل راہنمائی موجود نہیں ہے ۔اسلام کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب صرف عقائد عبادات اور رسومات یعنی غمی اور خوشی پر چند رسومات کا درس دیتے ہیں ۔مگر نظام معیشت اور نظامِ سیاست اور معاشرتی اصلاح کے احکام سے خالی ہیں یعنی اجتماعی معاملات میں ان کے مذاہب رہنمائی سے خالی ہیں۔

جبکہ اسلام اپنا خاص نظام معیشت اور خاص سیاسی ڈھانچہ اور خاص قسم کے معاشرتی احکام رکھتا ہے، ان مذاہبِ عالم کے علاوہ کچھ اور نظریات وافکار ہیں جن کو سیکولر یا لبرل یا ہیومن ازم کہا جا سکتا ہے۔ وہ حکومت کرنے کا ایک خاص طریقہ بتاتے ہیں خاص طرز کی معیشت پر یقین رکھتے ہیں اور خاص قسم کا معاشرتی ڈھانچہ چاہتے ہیں۔

اسلام کے علاوہ باقی مذاہب کے پاس تو اجتماعی معاملات کے میدان میں کوئی رہنمائی موجود نہ تھی تو انہوں نے دل و جان سے سیکولر اور لبرل سیاست کو ترجیح دی لبرل معیشت اور معاشرے کو ہی ترقی کا ذریعہ سمجھا۔

جبکہ اسلام باقی مذاہب کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل دین ہے جس میں سیاسی احکام معاشرتی اصولوں کی رہنمائی اور معاشی قوانین موجود ہیں جو کہ ایک خاص علمیت قرآن و سنت سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اسلام کبھی بھی سیکولر سیاست لبرل معاشرت اور لبرل ازم کے پیش کردہ معاشی نظام کو قبول کرنے کی گنجائش نہیں دے سکتا، کیونکہ سیکولرازم، لبرل ازم، ہیومن ازم، ماڈرن ازم یا پوسٹ ماڈرن ازم یہ سب ایک دوسری علمیت سے ثابت ہوتے ہیں۔ جس کا ماخذ قرآن وسنت نہیں بلکہ نفس انسانی ہے رہنمائی وحی سے نہیں عقلِ انسانی سے لی جاتی ہے۔ گمراہی اور جہالت کی اس شکل نے اقوام عالم کو اپنی لپیٹ میں ایسا لیا ہوا ہے، کہ اب تو کئی حضرات ان نظامہائے زندگی کو جو سیکولرازم یا لبرل ازم پیش کرتے ہیں ان کو اپنے اپنے مذاہب کا ہی عکس قرار دینے لگے ہیں، حتیٰ کہ بعض مسلمان بھی قرآن وسنت سے ان باطل وگمراہ کن نظاموں کا اثبات پیش کرنے کے درپے ہوئے ہیں۔

میں اس تحریر سے صرف یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ سیکولرازم، لبرل ازم، ماڈرن ازم، ہیومن ازم، وغیرہ کیا ہیں اور یہ کن فکری بنیادوں پر قائم ہیں اسلام اور ان نظریات میں کس درجہ کا تضاد ہے اسی طرح لبرل سیاست یعنی جمہوریت / لبرل معیشت یعنی سرمایہ دارانہ نظام لبرل معاشرت یعنی سول سوسائٹی کیا ہوتی ہے اور کن اصولوں پر اپنے نظام کو چلاتے ہیں۔ سیکولرازم ہو یا لبرل ازم، ہیومن ازم ہو یا ماڈرن ازم ان سب کی بنیاد فلسفہ

جدید پر ہے جسے مغربی فلسفہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسی کی یہ سب شاخیں ہیں ان سب کی بنیاد فلسفہ جدید پر ہے غلط اور صحیح کا پیمانہ کیسے قرار دیا جاتا ہے۔ ان سب باتوں پر بحث کی جائے تا کہ ہم ان تمام نظریات کو اسی شکل میں دیکھ لیں جیسا کہ وہ ہیں اس نظام کفر کا باطل ہونا واضح ہو جائے۔ حقیقت حال تک رسائی کے بعد انشاء اللہ کوئی بھی مخلص مسلمان جو شریعت اسلامی سے واقف ہے وہ سول سوسائٹی کی بجائے اسلامی معاشرے کے قیام پر زور دے گا اور جمہوریت کی بجائے خلافت کی بحالی کی کوشش کرے گا۔ کم از کم اس نظامِ کفر اور اسلامی طرزِ زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے سے باز رہے گا۔ یہ سب اس دورِ جدید میں جہالت کی شکلیں ہیں رہنمائی و ہدایت صرف اور صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے سنتِ نبوی ﷺ

ان الهدی هدی محمد صلی الله علیه وسلم

دوسرا مقصد: عصرِ حاضر میں اسلام پر بہت سے اعتراضات فلسفہ جدید کے کچھ مسلمات کو بنیاد بنا کر کیے جاتے ہیں ہمارے مفکرین ایک سوال کا جواب دیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں دس اور نئے سوال کھڑے ہوتے ہیں۔

بندہ! ان مسلمہ اصولوں پر بات کرے گا جن کی وجہ سے کسی چیز کو اسلام کے لیے اعتراض یا نا مناسب سمجھا جاتا ہے ان مسلمہ اصولوں کی ہمارے ہاں کیا حیثیت ہے جب ہمیں وہ مسلّمات ہی قبول نہیں تو مخاطب کا اعتراض ہی ہمارے لیے بے معنی ہے لہٰذا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس تحریر سے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تمام معاشرے جو عملی طور پر مذاہب سے لاتعلق ہو رہے ہیں وہ مذہب کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں خاص طور پر نوجوان نسل جو ایک خاص نظامِ تعلیم سے متاثر ہے، ان کے نزدیک مذہب کیا ہے؟ آج اسلام اور کفر میں کیا نظریاتی جنگ چل رہی ہے اور مغربی یلغار کس طرح مثبت انداز سے معاشروں پر اثر انداز ہوتی ہے اور کن حسین اور پر وقار نعروں سے مسلم معاشروں

میں فاسد نظریات کی پیوند کاری کی جاتی ہے۔

فلسفہ جدید

کسی موضوع پر باقاعدہ بحث سے قبل موضوعِ بحث عنوان کی تعریف اور اس کا حدود اربعہ معلوم کر لینے سے مقصود تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔

فلسفہ کا مطالعہ مختلف اغراض کے لیے کیا جاتا رہا ہے جس نے بھی کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا اسی کے مطابق تعریف مقرر کرنے کی کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ علماء یونان جو یونانی فلسفہ کے موجدین میں شمار ہوتے ہیں ان کے ہاں بھی فلسفہ کی تعریف میں کئی طرح کے اقوال ملتے ہیں:

فلسفہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ''علم و حکمت اور دانائی سے محبت کرنا''۔

فلسفی اس کو کہا جاتا تھا جو علم و دانائی سے محبت رکھتا ہو۔

فلسفہ جدید کا مطالعہ کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ موجود دور میں رائج نظام کن فکری بنیادوں پر قائم ہیں ان نظاموں کے پیچھے کس طرح کی ذہنیت کارفرما ہے دورِ حاضر کا زاویہ نظر اور اندازِ فکر کیا ہے۔

اگرچہ دورِ حاضر کے فلسفہِ جدید کی بنیادیں اور ماخذ وہی ہیں جو فلسفہ قدیم یعنی یونانی فلسفہ کی تھیں جس طرح اس کی بنیاد اخلاقیات پر تھی فلسفہ جدید میں بھی بنیادی جزو اخلاقیات ہے۔ قدیم فلسفیوں کے نزدیک ماخذ علم و ہدایت انسانی عقل تھی اسی طرح فلسفہ جدید میں بھی ماخذ علم ماخذ ہدایت و رہنمائی انسانی عقل کو قرار دیا گیا ہے۔

فلسفہ جدید اور یونانی فلسفہ میں کتنی مماثلت ہے کون سے طریقہ ہائے زندگی یونانی تہذیب سے مغربی تہذیب نے اخذ کیے ہیں، اس کے بارے میں کتاب کے حصہ اوّل میں بیان کیا جا چکا ہے۔ عہد جدید اور دور حاضر کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک نظر یونانی فلسفہ اور اس

کے عروج وزوال پر ڈالنی ہوگی۔

یونانی فلسفہ پر ایک نظر:

یونانی فلسفہ کی ابتداء تو بہت قدیم ہے اس کے اوّلین بانی یونانی مفکر تھے اس کی اساسی بنیادیں سقراط، افلاطون نے رکھی تھیں اور اسے پایۂ تکمیل تک ارسطو نے پہنچایا۔

ارسطو صرف ایک مفکر و فلسفی ہی نہ تھا بلکہ سکندر اعظم کا اتالیق (وزیر) بھی تھا۔ سکندر نے اپنی بہت ساری رقوم ارسطو کی تحقیقات پر صرف کیں، ہر طرح سے ارسطو کو سکندر اعظم کی تائید حاصل تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جس جس علاقہ کو سکندر اعظم فتح کرتا گیا اور اپنی حکومت کا سکہ بٹھاتا گیا علمی اعتبار سے ارسطو کے نظریات وافکار پھیلتے گئے۔

ایک لمبے عرصے تک یہ نظریات علمی حلقوں میں مسلمات کے طور پر قبول کیے جاتے رہے۔ پھر جب مذہب عیسائیت عام ہوا تو وہ نظریات جو کہ ارسطو وافلاطون وغیرہ نے پیش کئے تھے اور عوام میں ان کو الحق العین سمجھا جاتا تھا انکی مقبولیت کے پیش نظر عیسائی علماء نے ان نظریات کی توثیق کی بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے ان نظریات پر آسمانی کتاب انجیل سے دلائل دینا شروع کر دیئے یونانی فلسفہ پہلے تو صرف افلاطون وارسطو وغیرہ کے عقلی اختراعات تھے لیکن اب ان پر مذہب کا رنگ چڑھایا جانے لگا تھا، کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ نظریات عقلی ڈھکوسلے کل کو بھسم ہو سکتے ہیں۔

مقبولیت عامہ ہونے کی وجہ سے عیسائی علماء مذہب عیسائیت کی ان کے ساتھ ہم آہنگی پیش کرنے لگے، بلکہ بھرپور زور دیا حتی کہ یونانی فلسفہ نے عیسائیت کے بنیادی عقائد تک متاثر کیے۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں عیسائیت کی علمیت اس فلسفہ کے بغیر ادھوری رہ گئی اس طرح سے یونانی فلسفہ کی عمر سالوں کی بجائے صدیوں تک لمبی ہوتی چلی گئی۔ اِس لیے کہ لوگ اب اس کو محض علمی مباحث کے طور پر نہ سیکھتے بلکہ اپنا مقدس مذہب سمجھ کر پڑھا، پڑھایا جاتا۔ اس طرح فلسفۂ یونان کی اہمیت اس سے بھی زیادہ مسلّم ہوگئی جو ارسطو و افلاطون نے چھوڑی تھی۔

الغرض، عوام وخواص میں یہ نظریات و افکار مسلمہ طور پر تسلیم کیے جاتے۔ مثال کے طور پر دورِ حاضر میں یہ نظریہ ہے کہ زمین مریخ و مشتری اور دیگر اجرام فلکی سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ آج کل یہ ایسا نظریہ ہے کہ جو اس کے خلاف بات کرے گا عوام و خواص اس کو اجنبی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اسی طرح دیگر سائنسی نظریات جن کو آج کل قطعی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی حیثیت اس وقت یونانی فلسفہ کے نظریات کو حاصل تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ پختگی کے ساتھ ان نظریات کی توثیق کی جاتی تھی۔ اسی طرح کوئی بھی بنیادی نظریہ سامنے آتا تو اس کو انہی مسلّمات کی کسوٹی میں پرکھا جاتا، اگر ان مسلّمات کے مطابق نہ ہوتا تو اس کی تکذیب کی جاتی یا پھر تاویل کر کے اس کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کرتے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان موجودہ نظریات کو پیش کیے تو ابھی صرف تین سو سال ہوئے ہیں اور ان کو اس قدر مضبوط، صحیح اور الحق الیقین سمجھا جاتا ہے اور قدیم یونانی فلسفہ کے نظریات تو دو ہزار سال سے لوگوں میں مقبولیت کی نگاہ سے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی توثیق تو اور بھی پختہ انداز سے کی جاتی تھی اور اس قدر مسلّم نظریات سمجھے جاتے تھے کہ مذہب عیسائیت ان کو تورات سے ثابت کرنے لگی۔

یونانی نظریات کا بائبل کی تعلیمات سے توثیق:

ان نظریات کی بنیاد محض عقل انسانی ہے، کہ مفکرین نے سوچ کر مشاہدہ کر کے یا اندازہ لگا کر نظریہ قائم کرلیا۔

عقلِ انسانی جس قدر بھی مضبوط تخیل کی مالک ہو جائے فہم وبصیرت میں انتہا درجہ تک چلی جائے لیکن عقل انسانی کبھی بھی زمان ومکان سے ماورا ہو کر نہیں سوچ سکتی وہ ہمیشہ اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک آدمی کے خیالات سوچ وفہم اپنے گردوپیش کو مدِ نظر رکھ کر ہوں گے یہ تو ہوسکتا ایک زمانہ تک ان خیالات و نظریات کا باطل ہونا سمجھ میں نہ آئے لیکن ایک عرصہ گزرنے کے بعد وہ عقلی موشگافیاں خود بخود بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہی حال ہے تمام ان علوم کا جن میں علم کا ماخذ عقل انسانی قرار دی جاتی ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہوتا ہے کہ شاید اس سے بہتر کوئی اور خیال سامنے آجائے مثلاً جو بات سائنس نے ثابت کردی ہے کل کو کوئی اور نیا نظریہ سامنے آجائے۔ کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کو ایک زمانہ تک صحت کے لئے مفید بتایا جاتا تھا پھر مضر بتایا جانے لگا۔ اجرام فلکی کے بارے میں پہلے کچھ نظریات قائم کیے گئے پھر ایک عرصہ بعد ان کو رد کردیا گیا۔ بخلاف ان علوم کے جو وحی سے حاصل ہوں وہ معلومات جو وحی سے حاصل کی جائیں وہ ازلی وابدی ہوتی ہیں۔

اس لیے کہ وحی اس ذات پاک کی طرف سے عطا کیا گیا علم ہوتا ہے جو زمان اور مکان سے پاک ہے زمانہ اور حالات جس کے تابع ہیں اور اس کی مخلوق ہیں اس لیے کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ علوم وحی کا موازنہ دوسرے علوم سے کرے، قرآن وسنت کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے کسی دوسری چیز کو کسوٹی بنائے نہ فلسفہ جدید اور نہ فلسفہ قدیم کو اور نہ ہی سائنس کو اور نہ ہی عوام میں رائج مسلّم نظریات کو، قرآن وسنت خود حق ہے بلکہ الحق العین ہے۔

مروجہ اصطلاحات کی تفہیم

فلسفہ جدید کو سمجھنے میں ایک بڑا مسئلہ جو درپیش ہے وہ ہے اصطلاحات کا مسئلہ Definition اصطلاح کہتے ہیں کسی خاص Phenomena واقعہ یا خاص خیال کے ساتھ کسی لفظ کو ملا دینا (اٹیچ) کردینا۔ کہ جب وہ لفظ بولا جائے تو فوراً اس کی مکمل مراد مخاطب کے ذہن میں آجائے۔

ایک لفظ جب کسی خاص اصطلاح میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے لغوی معنی کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ مثلاً لفظِ کتاب سن کر ایک خاص قسم کی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی شکل ایسی ہوتی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے اس کو استعمال کیسے کرتے ہیں۔

لفظ کمپیوٹر سن کر ایک خاص مشین کی طرف ذہن جاتا ہے لفظ ایک ہے جو کسی خاص مشین کے لیے وضع کیا گیا ہے اس لفظ کو سننے سے اس مشین کی کارکردگی، صلاحیت اور مختلف چیزیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں علم الاسماء، کو بڑی خاصیت

کے ساتھ ذکر کیا اور فرمایا: ''ہم نے آدم کو اسماء کا علم دیا''۔ کہ کون سا لفظ کس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک لفظ کو کسی خاص تصور کے لیے استعمال کرنا اہمیت کی بات ہے۔

ہر معاشرے اور قوم کی کچھ اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں جن کے صحیح مفہوم سے واقفیت انہی کو ہوتی ہے ایک اصطلاح کا محض لغوی ترجمہ کرنے سے اس کے کما حقہ مفہوم تک رسائی ناممکن سی بات ہے۔

مثلاً ایک لفظ ہے عدت جس کا لغوی معنی ہے شمار کرنا مگر مسلم معاشروں میں اس کا ایک خاص پس منظر ہے، ایک خاص حالت میں عورت کے لیے بولا جاتا ہے جبکہ وہ اپنے خاوند کی وفات کے بعد یا طلاق دینے کے بعد اپنے گھر میں ٹھہری رہی ہے، اس کے لیے کچھ خاص احکام ہوتے ہیں۔

اگر کوئی انگریز لغت کی کتاب اٹھائے اور اس کا معنی دیکھے کہ اس کا معنی ہے Counting کرنا اور اس لفظ کو یوں استعمال کرے۔ مثلاً jon کو اس کے گھر پر آپ ملنے جائیں گھنٹی دینے کے باوجود کچھ دیر تک باہر نہ نکلے وہ اندر بیٹھا اپنی تنخواہ کی رقم گن رہا تھا اور آپ گھنٹی پر گھنٹی دے رہے ہوں وہ کچھ دیر بعد باہر نکلا اور کہا کہ تم نے کیا جلدی مچا رکھی ہے میں تو اپنی عدت پوری کر رہا تھا۔

تو سننے والا مسلمان پریشان ہوگا کہ عدت کا لفظ اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا مگر انگریز کو اصرار ہے کہ اس نے لغت سے خود دیکھا ہے عدت کا معنی ہے گننا (Counting)۔

اسی طرح لفظ جہاد کا ایک خاص معنی ہے اس خاص تصور میں لفظ جہاد بولا جاتا ہے، مگر آدمی اس کا لغوی معنی دیکھ لے اور اس کو ہی حقیقت تصور کرے۔ تو ایک آدمی اپنے کسی ڈاکٹر دوست سے ملنے گیا اس کی چھوٹی سی بچی باہر آئی تو اس سے دریافت کیا کہ بیٹا تمہارے ابو کہاں ہیں بچی بولی جہاد پر ہیں۔ تو آپ کا تصور کہاں جائے گا، ابھی آپ اسی خیال میں ہی تھے کہ ڈاکٹر صاحب باہر تشریف لے آئے تو آنے والے صاحب نے کہا کہ بچی تو یوں کہہ رہی تھی، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ہاں جی دراصل میرے کمرے میں صبح ایک چوہا گھس آیا تھا تو میں

اس کو کمرے سے نکالنے کی کوشش کررہا تھا جہاد کے معنی کوشش کرنا ہی تو ہے۔

اِسی طرح نماز، روزہ، حج، زکوۃ، نکاح، مہر، طلاق، قضاء، زناء، سود، مسجد، خانقاہ، ان کا ایک خاص تصور ہے اسلام میں ان سب چیزوں کا ایک خاص پس منظر ہے مابعد الطبعیات ہیں۔

اب اگر کوئی انگریز نماز کی یا نکاح وطلاق کی اپنے گمان کے مطابق تشریح کرے تو آپ کہیں گے کہ یہ تم کو حق نہیں ہے کہ بتاؤ نماز کیا ہے، حج کسے کہتے ہیں، عدت کیا ہوتی ہے، بلکہ ہم تم کو بتاتے ہیں کہ اس کا اسلامی تصور کیا ہے اگر وہ باز نہ آئے تو کہا جائے گا کہ یہ علمی بد دیانتی کررہے ہیں ہم ایسا مفہوم مراد نہیں لیتے۔

اِسی طرح آج بہت سے لوگ مغرب کے ساتھ یہ سب کررہے ہیں۔ ان کی حیرت انگیز ترقی اور سائنسی ایجادات سے اقوام عالم کی عقلوں پر سحر چھایا ہوا ہے مغرب کے ہر الٹے سیدھے نعرے کے عقلی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مذہب کو ان نظریات کے ہم آہنگ کرکے پیش کیا جاتا ہے۔

جس قوم نے بھی اپنے عقائد ونظریات کو فلسفہ جدید / فلسفہ مغرب کے ہم آہنگ کر کے پیش کیا، تاریخ گواہ ہے، ان خطوں میں نہ تو مذہبی عقیدت باقی رہی اور نہ ہی روائتی اور خاندانی اندازِ زندگی باقی رہا۔ حفظِ مراتب اور اخلاقیات وآداب کا جنازہ نکل گیا۔

فلسفہ جدید / فکر جدید یہ نفس پرستی کی ایک تحریک ہے جو کہ لذت اور تن آسانی فراہم کرنے کے بسبب اپنے اندر ایک ذاتی کشش رکھتی ہے فرد یا قوم ان نظریات کو اپنانے کے لیے بہت جلدی تیار ہو سکتے ہیں۔ مگر مذہب اس کے آڑے آجاتا ہے مذہب خواہ وہ کوئی سا بھی ہو اس نفس پرستی کی دل شکنی کرتا ہے اور ان نظریات کو چلنے نہیں دیتا۔

لیکن جب مذہب کو بھی ان نظریات کے ہم آہنگ کرکے دیکھا گیا تو یہ مغربی اقدار، فرنگی معاشرت، جدیدیت کی لہر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دور کیا جائیں اپنے پڑوسی ملک ہندوستان کا حال دیکھ لیں ان تیس سالوں میں اس قدر اقداری اور تہذیبی تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ تیس صدیوں میں بھی اتنی تبدیلی نہ ہوئی ہوگی۔ بڑی تیزی کے ساتھ

وہ معاشرہ سیکولر ہو رہا ہے۔

اِن کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس فلسفہ کا اپنے مذہب کی معاشرت وطرز زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ثابت کر دیا۔ مذہب جو کہ ایک رکاوٹ تھی ختم ہوگئی، اسی طرح بعض لوگ نادانستہ طور پر اسلام سے بھی سول سوسائٹی کا جواز اور مغربی تصور سیاست کی مختلف شکلیں (جمہوریت وآمریت) کا جواز پیش کرتے ہیں۔

الغرض مغرب کے نعروں کو اسلام کے ہم آہنگ کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح کہ دنیا کے باقی معاشروں نے کیا اور اس طرزِ عمل کی وجہ سے وہ سیکولرازم ولبرل ازم میں سمو گئے۔ دین اسلام کا معاملہ باقی مذاہب سے کچھ مختلف ہے یہ سیکولرازم ولبرل ازم کے ہم آہنگ کر کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تفصیلی بحث "سیکولرازم عصرِ حاضر کا دین" میں دیکھیں۔

مختصر یہ عرض کرتا چلوں کہ، اسلام کے علاوہ باقی مذاہب میں صرف عبادات وعقائد اور رسومات کی رہنمائی ہے۔ طریقہ سیاست، انداز معاشرت اور احکام معیشت نہ ہونے کے برابر ہیں کوئی خاص رہنمائی نہیں ہے جب کہ لبرل ازم نے معاشرت ومعیشت وسیاست کا ایک خاص نظام پیش کیا۔ تو دیگر مذاہب نے اپنے خلا کو لبرل ازم کے بیان کردہ نظاموں سے پورا کر لیا۔ جبکہ دین اسلام، اجتماعی معاملات، مثلاً نظامِ سیاست انداز معاشرت اور احکام معیشت مکمل جامعیت کے ساتھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ اجتماعی نظام ایک خاص علمیت قرآن وسنت سے لیے جاتے ہیں۔ جب مغربی نظاموں جو کہ ایک خاص فکر وفلسفہ سے ثابت ہیں ان کو اسلام کے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے گا تو بہت سی چیزیں سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گی اور اعتراضات کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں قسم کے نظام (اسلامی نظام اور مغربی نظام) الگ الگ علمیت سے ثابت ہیں دونوں کی مابعد الطبعیات (ایمانیات) اور پس منظر الگ الگ ہیں اس لیے ہم آہنگی کرنا ناممکن ہے۔

کچھ بنیادی اصطلاحات فلسفہ میں استعمال ہوتی ہیں جن کو سمجھے بغیر کسی بھی نظریہ یا فکر کا

جائزہ لینا ناممکن ہے اور نہ ہی ایک فکر کو دوسری فکر سے ممتاز کیا جا سکتا ہے یہ بنیادی طور پر پانچ چیزیں ہیں جن پر فلسفہ میں بحث کی جاتی ہے اور انہی پانچ عنوانات کی تشریح سے ایک قسم کے افکار دوسری قسم کے افکار سے ممتاز کیے جا سکتے ہیں۔ انہی کو بنیاد بنا کر ہم واضح کریں گے کہ اسلامی افکار اور مغربی افکار میں کس درجہ کا تضاد ہے۔

مبادیاتِ فلسفہ

1)۔ مابعدالطبعیاتی بحث metaphysics (میٹافزکس)

2)۔ علمیاتی — اسٹمولوجی

3)۔ اخلاقیاتی — اتھکس

4)۔ اقداریات — اگریولوجی

5)۔ جمالیاتی — aesthetic

1۔ مابعدالطبعیات (میٹافزکس) metaphysics

ایسی چیزوں سے بحث کرنا جو اپنا وجود حساً نہیں رکھتیں مثلاً روح کیا ہے، انسانی بقاء کیا ہے ،خدا کیا ہے، آخرت کیا ہے، حقیقت اعلیٰ کون ہے، حقیقتوں کی آپس میں ترتیب کیا ہوگی، مقصدِ حقیقت کیا ہے۔ ان چیزوں سے متعلق بات کرنے کو مابعدالطبیعاتی بحث کہا جاتا ہے فلسفہ کی یہ بنیادی (term) اصطلاح ہے۔

2۔ علمیات، Astomolgy (اسٹمولوجی)

اس میں بحث ہوتی ہے علم کیا ہے، علم کے ذرائع کیا ہیں، علم کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟ عقل ہے یا وجدان یا انسانی جبلتیں یا وحی

3۔ اخلاقیات (اتھکس)

اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ ان کے بارے میں بحث کرنے کو اخلاقیات کہا جاتا ہے۔

4۔اقداریات (اگزیولوجی)

قدر کیا ہے اور قدر رہنے کی بنیادیں کیا ہیں اقدار کی ترتیب کیا ہونی چاہیے، قدر کون دیتا ہے اور اقدار کی ترتیب کیسے وضع کی جائے۔

5۔جمالیات

Earlynice اور Beauty سے بحث کرنے کے لیے جمالیات کا لفظ بولا جاتا ہے، غمی اور خوشی کے اظہار کے پہلو سے بحث کو جمالیات کہتے ہیں۔

یہی وہ پانچ چیزیں ہیں جن کو بنیاد بنا کر مختلف نظریات رکھنے والے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کیا جاتا ہے اور ہر ایک کے نظریات کا دوسرے کے نظریات سے فرق سمجھا جاسکتا ہے۔اگر ان بنیادوں میں ہی ایک دوسرے کے حریف نظریات ہوں تو ان نظریات سے پھوٹنے والے اعمال کبھی بھی ایک طرح کے نہیں ہوسکتے اگر کہیں شکلاً کوئی مشابہت ہو بھی جائے تو حقیقتاً ان دونوں کاموں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

مثلاً ایک مسلمان شخص نماز ادا کرتا ہے اس کے مابعد الطبعیات میں تصور خدا ہے تصور آخرت و قیامت ہے اور عنداللہ اجر کا امیدوار بن کر نماز کا عمل ادا کرتا ہے۔اسی طرح کی شکلاً اُٹھک بیٹھک، رکوع و سجود کوئی آدمی کرے اور یہ کہے نماز پڑھنا ٹھیک ہے، یہ ایک اچھی ورزش ہے اگر آپ کی خواہش ہے کہ سجدہ کریں تو اس کو ضرور پورا کرنے کا آپ حق رکھتے ہیں۔

ایک کام کو دونوں حریف صحیح سمجھ رہے ہیں مگر اس عمل میں حقیقت کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔جب تک مابعد الطبعیات میں ہی ایک فکر و فلسفہ دوسرے فکر و فلسفہ کے مقابلے میں ہو تو آئندہ ظاہر ہونے والے اعمال کبھی بھی ایک طرح کے نہیں ہوسکتے، اگرچہ شکلاً ایک جیسے نظر آرہے ہوں۔

مابعد الطبعیات

کی تین شاخین ہیں۔

Cosmology	Ontology	Debiology
ترتیبِ حقیقت	حقیقت فی نفسہ	مقصدِ حقیقت

(Cosmology) کوسمولوجی:

ہر انسان حقیقتوں کی کوئی نہ کوئی ترتیب رکھتا ہے کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ تمام حقیقتوں کو برابر کی سطح پر دیکھے بلکہ اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی ترتیب ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی مسلمان ہے اس کے نزدیک حقیقتوں کی ترتیب کچھ یوں ہوگی وہ اللہ جلّ شانہٗ کی ذات کو سب سے اعلیٰ حقیقت کا درجہ دے گا پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کو پھر ملائکہ پھر کچھ اور الغرض ایک ترتیب ذہن میں ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر ایک آدمی مادہ پرست ہے تو اس کے نزدیک حقیقتوں کی ترتیب کچھ اور طرح ہوگی وہ حقیقت اعلیٰ کسی اور چیز کو تسلیم کرے گا مثلاً کارل مارکس (Karl Marks) ایک فلسفی ہے جو مادہ پرست ہے اس کے نزدیک حقیقت اعلیٰ مادہ ہے اور ادنیٰ حقیقت بھی مادہ ہے فرق یہ ہے جو مادہ (Active matler) میں ہے وہ اعلیٰ ہے۔ جس مادہ سے دوسرا مادہ بن سکتا ہو مثلاً انسان سے دوسرا انسان پیدا ہوتا ہے، جانور سے دوسرے جانور وجود میں آتے ہیں وغیرہ اس کے نظریے کے مطابق حقائق کی ترتیب بالکل کچھ اور ہے اور حقیقت اعلیٰ بھی اس کے نزدیک کوئی اور ہے۔ ترتیب حقیقت کی بحث کو کوسمولوجی کہتے ہیں۔

جب ایک کیمونسٹ، بدھ ازم وغیرہ سے تعلق رکھنے والا ایمان لانے سے انکار کرتا ہے تو در حقیقت وہ آپ کی کوسمولوجی ترتیب حقیقت سے انکار کر رہا ہوتا ہے۔ جب ایک آدمی اپنا ایمان تبدیل کرتا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے کہ وہ کائنات میں جو پہلے سے ایک حقیقتوں کی ترتیب کا قائل تھا وہ اس ترتیب کو بدل لیتا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ، ان الشرک لظلم عظیم

ترجمہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

یعنی حقیقتوں کی ترتیب میں خدا کا جو مقام ہے ایمان نہ لانے والا خدا کو اس مقام پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ ایک خود ساختہ ترتیب کا قائل ہوتا ہے، جس میں حقیقت اعلیٰ خدا کے بجائے کسی اور کو قرار دیتا ہے، اس طرح وہ ظلم کرتا ہے۔ اسی طرح انسان کو اس

کے مقام سے اوپر لے جانا یا اس کے مقررہ مقام سے بھی کم حیثیت دینا دونوں ظلم ہیں۔

اسی طرح مٹی، ہوا، پانی، آگ میں ترتیب کیا ہوگی یا کمرے میں بیٹھا ہوا شخص مختلف چیزیں دیکھتا ہے، لیکن سب کو برابر کی اہمیت نہیں دیتا اس کے نزدیک کچھ چیزیں اہم کچھ اس سے کم اور کچھ غیر اہم ہوں گی مقصدِ کلام یہ ہے کہ ہر فرد کے نزدیک حقیقتوں کی کوئی نہ کوئی ترتیب ضرور ہوتی ہے شعوری یا لاشعوری طور پر ان حقیقتوں میں سے ایک حقیقت کو سب سے اعلیٰ تصور کرتا ہے۔ اِسی ترتیب حقیقت کو کوسمولوجی کہتے ہیں، ترتیب حقیقت میں جب ایک دوسرے سے اختلاف ہوتا ہے تو زندگی میں رونما ہونے والے اعمال اور افکار ایک طرح کے نہیں ہوسکتے۔ اسلامی فکر و فلسفہ میں حقیقت اعلیٰ اللہ جلّ شانہٗ ہے جبکہ انٹولوجی مغربی فکر و فلسفہ میں حقیقت اعلیٰ نفسِ انسانی ہے۔ اسی ترتیب کا اثر ہے کہ اسلامی نظام اور قانون سازی میں حقیقت اعلیٰ یعنی اللہ کی مرضی و خوشنودی دیکھی جاتی ہے۔ جبکہ مغربی قانون سازی میں نفس انسانی یعنی لوگوں کی خوشی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

کسی چیز کو (کوسمولوجی کل آرڈر) cosmological Order یعنی ترتیب حقیقت دینے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو اس حقیقت کے بارے میں آگاہی ہو آپ جانتے ہوں کہ وہ حقیقت فی نفسہ کیا ہے، آگ، پانی، مٹی، اور ہوا میں کوئی ترتیب دینا چاہتے ہیں تو آپ کو پہلے یہ پتہ ہونا ضروری ہے کہ آگ فی نفسہ کیا ہے ہوا فی نفسہ کیا ہے پانی اصل میں کیا ہے تب آپ ان میں کسی ترتیب کے قائل ہوسکتے ہیں۔ لہذا اس بات کو جاننے کی کوشش کہ حقیقت فی نفسہ کیا ہے۔ اس سے انٹولوجی بحث کرتی ہے۔ حقیقت فی نفسہ کیا ہے یہ قطعی طور پر انسان نہیں بتا سکتا لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک آڈر دوسرے آڈر سے سپیریئر اعلیٰ ہو مثلاً ارسطو، ہوا، پانی، مٹی اور آگ میں اس طرح کی ترتیب کا قائل تھا۔

(1)۔آگ (2)۔ہوا (3)۔پانی (4)۔مٹی

اس نے ان چاروں چیزوں کا تجزیہ۔(Analysis) یوں کیا تھا کہ آگ آسمان سے آئی ہے تمام اجرام فلکی آگ کے بنے ہوئے ہیں اس کے پیچھے ایک مکمل (theory) تھیوری تھی جو اس وقت

کے مذاہب کے ہم آہنگ تھی وہ آگ کو علم سمجھتے تھے اس لیے اس تینوں سے اوپر رکھا۔

ہوا کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ ہوا ہمیشہ پانی سے اوپر رہے گی اس کو جتنا بھی نیچے دباؤ یہ باہر آ کر ہی دم لے گی اور پانی کے نیچے ہمیشہ پتھر ہوں گے خواہ وہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو۔

ارسطو نے ہوا، پانی، مٹی، اور آگ کے analysis یوں کیے یعنی حقیقت محضہ کا اندازہ یوں لگایا پھر ان میں ترتیب کا قائل ہوا۔ چونکہ وہ بہت بڑا دماغ رکھتا تھا اس کی یہ قائم کی ہوئی ترتیب 15 سو سال تک چلتی رہی لوگ اسی ترتیب کو صحیح سمجھتے تھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ترتیب تب ہی قائم ہوگی جب اس چیز کی آگاہی ہو کہ وہ شے اصل میں کیا ہے، خدا کیا ہے، انبیاء کون ہیں، مادہ کیا ہے، علم کیا ہے، دین کیا ہے، بشر کی حقیقت کیا ہے وغیرہ۔

جب ایک ماخذ سے حقیقت کا علم حاصل کریں اور کسی دوسرے ماخذ کے مطابق ترتیب حقیقت لگانا چاہیں تو آپ الجھنوں کا شکار ہو جائیں گے۔ جس علمیت سے حقیقت فی نفسہٖ کا علم ہوگا ترتیب بھی اسی کے مطابق لگے گی، اگر ترتیب قرآن کے مطابق لگائی ہے تو حقیقت فی نفسہٖ کا علم بھی قران سے لینا ہوگا۔

اگر آپ نے حقیقت فی نفسہ کا علم سائنس سے لیا تو ترتیب بھی اسی کے مطابق بنانا ہوگی، اسی طرح حقیقت فی نفسہ کا علم آپ نے افلاطون وارسطو کے نظریات سے اخذ کیا تو ترتیب اسی قسم کی لگے گی، وگرنہ نہ ختم ہونے والی الجھنیں اور اعتراضات کا انبار لگ جائے گا، ایسا ممکن بھی نہیں ہے کہ آپ چیزوں کی ترتیب قرآن سے لگانے کے قائل ہوں اور ان کے بارے میں حقیقت نفسہ کسی اور ماخذ (سائنس) سے تلاش کرلیں یا اس کے برعکس کہ حقیقت فی نفسہ کا علم قرآن سے لیں اور ترتیب ارسطو یا کسی اور فلسفی یا مغربی نظریات کے مطابق لگائیں اور مطمئن ہو جائیں کہ کسی قسم کی ذہنی الجھن باقی نہ رہے۔

حقیقت فی نفسہ (انٹولوجی)

حقیقتوں کے تجزیے کے بعد حقیقت محضہ کا ادراک انٹولوجی کہلاتا ہے۔ جس میں بحث ہوگی انسان فی نفسہ کیا ہے، روح فی نفسہ کیا ہے، بقاء کیا ہے خدا کیا ہے وغیرہ۔

جو آدمی حقیقت فی نفسہ (انٹولوجی) کا علم آپ سے بہتر رکھتا ہے تو وہ اٹیک کر کے دو منٹ میں آپ کی (کوسمولوجی) حقیقتوں کی ترتیب بدل دے گا۔ یہ دونوں آپس میں جڑی ہوئی ہیں جس طرح کا حقیقت فی نفسہ کا علم ہوگا اسی سے آگے ترتیب بن جائے گی اس لیے ضروری ہے کہ جس ماخذ سے آپ ترتیب لگا رہے ہیں۔ اسی ماخذ سے حقیقت فی نفسہ کا بھی علم حاصل کریں مثلاً مسلمان قرآن سے ترتیب حقیقت قائم کرتا ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے پھر معزز ہستیاں انبیاء کی ہیں۔ الغرض ایک خاص ترتیب ہے جس میں خدا، انبیاء، نفس انسانی، روح، علم، جن، ملائکہ، مادہ و دین ان کی ایک ترتیب ہے۔ بہر حال سمجھنے کی بات صرف یہ ہے کہ حقیقتوں کی ترتیب حقیقت فی نفسہ کو جانے بغیر نہیں لگ سکتی، جس طرح کا حقیقت فی نفسہ کا علم ہوگا، اسی طرح کی ذہن میں ایک ترتیب قائم ہو جائے گی۔ جو آدمی فی نفسہ حقیقت کا علم آپ سے زیادہ اچھا رکھتا ہے وہ اٹیک کر کے آپ کی ترتیب حقیقت دو منٹ میں بدل سکتا ہے، حقیقت فی نفسہ کے بارے میں جاننے کو انٹولوجی کہتے ہیں۔

مقصدِ حقیقت (ڈیبولوجی)

ڈیبولوجی بحث کرتی ہے مقصدِ حقیقت سے اور وہ مقصد معونیت پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں ارسطو کہتا تھا چار علتیں ہوں تو پھر ایک حقیقت وجود میں آتی ہے۔

Afesharitcause	Matrecause	FirmIcause	Finalcause
علت غائیہ	علت فاعلیہ	علت مادیہ	علت صوریہ

1۔علت فاعلیہ: اس چیز کو کوئی بنانے والا ہونا چاہیے۔

2۔علت مادیہ: جس مٹیریل سے آپ کوئی چیز بنانا چاہتے ہیں۔ تو اس مٹیریل کا ہونا بھی ضروری ہے مثلاً کمرہ بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے اینٹیں وغیرہ ہونا ضروری ہیں۔

3۔علت صوریہ: جو بھی چیز بنانا چاہتے ہیں تو اس کا نقشہ ذہن میں ہوگا تو وہ تصورِ حقیقت کی شکل دھارے گا۔

4۔علت غائیہ:۔ جس چیز کو آپ بنانا چاہتے ہیں اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا۔ اس کو کہتے ہیں

.Final cause جب یہ چار علتیں پائی جائیں گی تو حقیقت وجود میں آئے گی وگرنہ نہیں اگران میں سے ایک بھی نہ پائی گئی تو اس حقیقت کا وجود ناممکن ہے۔ چوتھی قسم کی علت یعنی(final cause) مقصدِ حقیقت پر بحث کرنے کو کہتے ہیں ڈیبولوجی۔

مابعد الطبعیات (میٹا فزکس) میں انہی تین چیزوں سے بنیادی بحث ہوتی ہے حقیقت کیا ہے، ترتیب حقیقت کیا ہوگی، اس حقیقت کا مقصد کیا ہے۔

جب آدمی اپنی مابعد الطبعیات کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کی باطل کے خلاف لمبی لمبی مباحث، مکالمے، علمی دلائل، منطقی براہانات نتیجتاً بے فائدہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ مثلاً دورِ حاضر میں کوئی بھی کام اسلام کے حوالہ سے کیا جاتا ہے مثلاً اسلامی سزاؤں کے نفاذ کی بات کریں تو عالمی برادری کی طرف سے شور مچادیا جاتا ہے کہ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ ہمارے مسلمانوں کو یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کیسے ہوگی۔ اسی طرح عورتوں کے حجاب پر پابندی لگائی جاتی ہے یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

انسان کے حقوق کیا ہیں۔ یہ بات اس وقت حل ہوگی جب یہ معلوم ہو کہ انسان حقیقتاً کیا ہے کس طرح کے حقوق اس کو مطلوب ہیں یہ بات تب واضح ہوگی جب بتادیا جائے کہ ''انسان کی حقیقت عبد ہے یا(Human being) ہیومن بین'' مسلمان انسان کو عبد تصور کرتے ہیں اس لیے حقوق وفرائض بھی ایک خاص نوعیت کے ہیں جبکہ فلسفہ جدید اور مغربی کلچر میں انسان کی حقیقت "Human being" ہے لہٰذا اس کے حقوق وفرائض اور نوعیت کے ہیں۔ مسلمان انسان کو عبد سمجھ کر حقوق وفرائض بیان کرتے ہیں تو عالمی برادری چلاتی ہے کہ یہ انسانیت پر ظلم ہے کیونکہ وہ اس کو "Human being" تصور کرتے ہیں اور ایک خاص قسم کے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں جو کہ اسلام ایک عبد کو دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے جب بھی کوئی اسلام کا دفاع کرنے والا انسان کی مابعد الطبعیات جو اسلام نے دی ہیں اس کو چھوڑ کر انسان کو اسی انداز سے دیکھے گا جو مابعد الطبعیات فکر جدید/ مغربی فلسفہ نے دی ہے اور اس کی مابعد الطبعیات کو تسلیم کر

کے اسلام کے دفاع کی کوشش کرے گا، تو یہ فضول عمل ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ دفاع کس چیز کا کر رہا ہے، ہر چیز کو تو وہ پہلے سے تسلیم کر چکا ہے، ان کی ترتیبِ حقیقت پر پہلے سے یقین لے آیا ہے۔

لہٰذا فلسفہ جدید کو کماحقہ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جبکہ اس کی اصطلاحات کو ان کے مابعد الطبعیاتی تناظر میں جاننے کی کوشش کریں گے ان کی کوسمولوجی اور انٹولوجی سے آگاہی کے بغیر اس یلغار کا دفاع ناممکن ہے۔ جو لوگ مغربی فلسفہ کی اصطلاحات مثلاً سول سوسائٹی ہیومن رائٹس وغیرہ کو ان کے مابعد الطبعیات کو دیکھے بغیر اسلام سے ان کا کوئی جواز فراہم کرتے ہیں وہ دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر اسلام کی کشتی کو اس منجدھار میں دھکیل رہے ہیں جہاں پر جا کر عیسائیت بے دست و پا ہوگئی، بلکہ اقوام عالم کے تمام مذاہب بے معنی ہو کر رہ گئے۔

طلاق کا حق مرد کو ہے تو عورت کو کیوں نہیں، عورتوں کے اور مردوں کے حقوق برابر ہونے چاہئیں، وراثت میں عورت کو بھی مرد کے مساوی حق کیوں نہیں دیا جاتا، ہر انسان کو مذہبی آزادی ہے تو اسلام مرتد کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیتا ہے۔

☆۔ اسلام مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے تو عورت کو کیوں روکا جاتا ہے۔

☆۔ اسلام میں اقلیتوں کے مساوی حقوق تسلیم کیوں نہیں کیے جاتے صرف یہی نہیں بلکہ ان جیسے سینکڑوں سوالات اسلام پر اٹھائے جاتے ہیں مگر ان تمام سوالات کے پیچھے صرف دو بنیادی نظریے کار فرما ہیں۔

(1)۔ آزادی (2)۔ مساوات

یہ اعتراضات اس لیے پیدا ہوئے کہ آزادی اور مساوات کو صحیح اور غلط جاننے کا آلہ مقرر کیا گیا۔ پھر اس آلہ سے اسلام کی چند جزئیات کو ناپنے کی کوشش کی گئی تو وہ اس معیار کے مطابق نہ نکلیں۔ مثلاً وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے کے مقابلے میں آدھا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بات مساوات کے خلاف ہے اس لیے اس کو اعتراض کے طور پر اٹھایا جاتا ہے۔ اسی طرح آزادی کو انسان کا حق تسلیم کیا گیا پھر اسلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو اسلام کئی مقام پر آزادی سلب کر لیتا ہے مثلاً

مذہب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔تو اسی بات کو اعتراض کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

حل طلب مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان اعتراضات کے جواب دیئے جائیں بلکہ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ جس چیز کو قدر (خیر وشر جاننے کا آلہ) قرار دیا جا رہا ہے کیا وہ ٹھیک ہے؟ کیا آزادی اور مساوات کو بنیاد بنا کر اہلِ مغرب کا اعتراض کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے بعد یک لخت تمام اعتراضات ختم ہو جائیں گے بہت سے مسلمان بھائی ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

مثلاً، لڑکی کو وراثت میں آدھا حصہ ملنے پر کہا جاتا ہے کہ مرد پر کچھ ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں مرد کما کر لاتا ہے عورت پر کمائی واجب نہیں ہے بلکہ اس کا نان نفقہ مرد اٹھائے گا وغیرہ ۔یعنی مساوات کو بحیثیت قدر وہ بھی تسلیم کرتا ہے اب ادھر ادھر کے دلائل سے مساوات ثابت کر کے جان چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مصلحتیں ہیں مصلحتیں ہر دور اور علاقے میں مختلف ہوسکتی ہیں اور حکم بھی مصلحت کی بنیاد پر ثابت نہیں ہوتا بلکہ حکم کا مدار علت پر ہے اگر کسی بہن کا بھائی معذور ہے اپاہج ہے۔بہن ہی اس کی خوراک کا انتظام کرتی ہے تو کیا اب شریعت کا حکم بدل جائے گا؟ ہرگز نہیں بدلے گا۔

میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس اعتراض کو اعتراض اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ یہ مساوات کے خلاف ہے، کسی مسئلہ کے صحیح یا غلط ہونے کو جاننے کے لیے قرآن یا حدیث تو آلہ ہے قدر ہے مگر مساوات کو قدر (حق جاننے کا آلہ) کس نے قرار دیا ہے؟ اسی طرح یہ اعتراض کہ مرد کو طلاق حق ہے تو عورت کے لیے اس حق کو تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا۔ یہ اعتراض اس لیے ہے کہ مساوات کو تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا۔اس طرح کے اعتراضات 17 صدی سے قبل نہ اٹھائے جاتے تھے 17 صدی کے بعد فلسفہ کے نظریات کو عروج ملنا شروع ہوا، اس فکر و فلسفہ میں انسان کسی خارجی طاقت کا پابند نہیں ہے بلکہ بالکل آزاد ہے اور اپنی اس آزادی میں تمام انسان برابر ہیں اس لیے سب میں مساوات ہوگی۔

الغرض آزادی اور مساوات انسان کے بنیادی حقوق طے پائے، کسی امر کو صحیح اور

غلط قرار دینے کا آلہ یہی دو اصول ہیں کسی چیز سے انسانی آزادی متاثر نہ ہو اور سب کے سب انسان مرد و عورت مسلمان و کافر کو برابر سمجھے جائیں حقوق و فرائض میں۔ ہر چیز کو ان دو اصولوں سے ناپا جائے گا، اگر آزادی اور مساوات ہے تو صحیح اور اگر آزادی اور مساوات نہیں تو غلط ہے، تقدسِ انسانی کے خلاف ہے۔

حقوق کی بحث

عصر حاضر میں انسان کے کیا حقوق و ذمہ داریاں ہیں اس کا طرز زندگی کیسا ہونا چاہئے یہ جاننے سے قبل اس بات کی وضاحت بے حد ضروری ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ انسان اصل میں کیا ہے تب ہی اس کے حقوق و فرائض متعین ہو سکتے ہیں۔

جب تک اس بات کی وضاحت نہیں ہوگی کہ انسان فی نفسہ کیا ہے تب تک مشرقی مفکرین، مسلم مفکرین اور مغربی مفکرین قانون دانوں میں یہ الجھنیں چلتی رہیں گی مسلم معاشرے ایک انسان کے حقوق اور فرائض ایک خاص علمیت سے ثابت کرتے ہیں اور اپنے ما بعد الطبعیات رکھتے ہیں انہی ایمانیات کی بنیاد پر انسان کے حقوق طے کیے جاتے ہیں۔

جبکہ اہل مغرب بھی دعویدار ہیں کہ ہم انسان کو اس کے حقوق دلانا چاہتے ہیں جب وہ حقوق و فرائض بیان کرتے ہیں تو ان کے حقوق یکسر مختلف ہوتے ہیں جن کو مسلم معاشروں میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں حریفوں کا دعویٰ ایک ہے کہ ہم انسان کے حقوق ادا کرنا چاہتے ہیں اور ایسا قانون زندگی رکھتے ہیں جس سے تمام کے حقوق ادا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مسلمان جب ایک انسان کے حقوق بیان کرے گا تو ایک خاص علمیت کے تناظر میں انسان کی حیثیت کا تعین کرے گا مثلاً یہ انسان زمین میں اللہ جلّ شانہٗ کا عبد ہے۔ اسی تناظر میں ایک عورت کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟ تو وہ عورت کے لیے ایک ایسا طرز زندگی آئیڈیل کے طور پر پیش کرے گا جیسا کہ سیدۂ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا تھا حضرت خدیجہ و سیدۂ عائشہ رضی اللہ عنہما کا تھا۔ جس طرح کی ان کی ذمہ داریاں تھیں، حقوق تھے وہی ایک عام عورت کے لیے ثابت کیے جائیں گے۔

1)۔ مثلاً عورتیں گھروں کی نگہداشت کریں گی۔

2)۔ اولاد کی پرورش کا فریضہ سرانجام دیں گی۔

3)۔ تربیت اولاد کی ذمہ داری ادا کریں گی۔

4)۔ گھر کے چراغ کو اسلام شمع محفل بننے کی کبھی اجازت نہیں دیتا، اس کے رب نے اسے حجاب کا پابند کیا ہے۔

5)۔ تمام تر مالی ذمہ داریوں سے عورت کو بے نیاز کر دیا۔ اس کا نان نفقہ، رہائش کے اخراجات مرد کے ذمہ ہوں گے۔ لیکن اہلِ مغرب جب ایک انسان کے حقوق متعین کریں گے تو وہ ایک خاص علمیت کے تناظر میں انسان کو دیکھیں گے پھر اسی تناظر میں ایک انسان کے حقوق متعین کیئے جاتے ہیں۔

1)۔ انسان کو مثلاً مذہب تبدیل کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے دن کو مسلمان تو رات کو عیسائی اس سے اگلے دن یہودی یا ہندومت ہو جائے یہ اس کا حق ہے۔

2)۔ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی انفرادی زندگی میں آزاد ہے کوئی اس کی آزادی میں خلل نہ ڈالے۔ زنا بالرضاء سے اسے روکا نہیں جا سکتا شادی سے پہلے پیدا ہونے والے بچے کو وہ مکمل تحفّظات دیئے جانے چاہییے جو تحفظات شادی کے بعد ہونے والے بچے کو ملتے ہیں۔

ہیومن رائیٹس چارٹر میں جو حقوق درج ہیں ان سب کا مطالعہ کر لیجیے۔ یہ تمام حقوق اس انسان کے بیان کیے گئے ہیں جس کو اہل مغرب انسان قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے حقوق کو مسلمان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جو حقوق ایک مسلمان انسان کے لیے بیان کرتے ہیں اہل مغرب ان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کے بیان کردہ حقوق کو وہ ظلم اور جبر کہتے ہیں کہ تم انسانیت پر ظلم کرتے ہو تم ظالم لوگ ہو۔ انسانی اقدار کو پامال کرتے ہو۔

اسی لیے وہ تعزیری سزاؤں کو ظالمانہ انسانیت سوز سزائیں شمار کرتے ہیں۔

مسلمان پردہ وحجاب میں رہنے کو عورت کا حق سمجھتے ہیں اور وہ اس کو عورت پر ظلم سمجھتے ہیں۔

یہ عقدہ اس وقت تک حل نہیں ہوگا جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ جس انسان

کے حقوق بیان کیے جارہے ہیں وہ کیا ہے؟اس کی انٹولوجیکل پوزیشن کیا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایک انسان کی انٹولوجیکل پوزیشن (حقیقت محض/ حقیقت فی نفسہ) ہے عبد۔

ایک عبد ہونے کے ناطے اس کے حقوق کیا ہیں، ذمہ داریاں کیا ہیں اسی عبدیت کے تناظر میں انسان کے حقوق و فرائض بیان کیے جاتے ہیں ۔جبکہ اہلِ مغرب/ مغربی مفکرین یا فلسفہ جدید میں انسان کی حقیقت عبد نہیں ہے بلکہ اس کی انٹولوجیکل پوزیشن (حقیقت فی نفسہ / حقیقت محضہ)Human being، ہیومن بین ہے۔ایک گروہ 6فٹ کے انسان کو عبد مان کر حقوق بیان کرتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اس 6فٹ کے انسان کو ہیومن بین مان کر اسکے حقوق بیان کرتا ہے۔حقیقت محضہ میں فرق آنے کی وجہ سے دونوں گروہوں کے حقوق و فرائض جدا جدا ہیں ۔اگر کسی جگہ بظاہر حقوق ایک طرح کے نظر آئیں بھی تو اپنے مابعد الطبیعاتی اختلاف کی وجہ سے ان کا آپس میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا۔

عبد کون ہے؟

جو اپنے سے اعلیٰ کسی بالائی طاقت پر یقین رکھتا ہو اور جس کو اپنے عمل پر سرزنش کا خوف ہو کہ کوئی مجھ سے اس کام کے کرنے یا نہ کرنے پر پوچھ سکتا ہے۔

یعنی تصور عبد میں دو چیزیں بنیادی ہیں

1)۔ اپنے سے اعلیٰ کسی خارجی طاقت اللہ، بھگوان، کرشن، دیوتا، یا کسی اور پر یقین رکھتا ہو۔

2)۔ تصور آخرت۔کہ ہر عمل کا مجھ سے مواخذہ ہوسکتا ہے، میں یہ فلاں کام کررہا ہوں تو اس کے کرنے کا مقصد بھگوان کو راضی کرنا، خدا کو راضی کرنا یا دیوتاؤں کی رضا مقصود ہے مختصر یہ کہ کسی کے سامنے جھکنا اپنے کو اس کے تابع سمجھنا آزاد خیال نہ کرنا اور اس کے عمل کا پٹرول تصور آخرت ہو۔

عبدیت کا تصور تمام تہذیبوں میں رہا ہے، اگرچہ بے حد کمزور ترین ہی کیوں نہ ہو 17 صدی سے قبل کوئی ایک دو فرد تو ہو سکتے ہیں جو مطلق العنان آزادی کا دعویٰ کرتے ہوں اپنے آپ کو ہی سب سے برتر خیال کرتے ہوں اور مادے کا حصول ہی ان کا مقصد

زندگی ہو۔ لیکن کسی ایک جماعت نے ایسا نعرہ نہیں لگایا یا کوئی تہذیب اس بنیاد پر کھڑی ہو اور پورا معاشرہ اسی فکر پر قائم ہو انسانی تاریخ اس سے خالی ہے۔ ہر تہذیب میں عبدیت کا تصور ضرور تھا اگرچہ کمزور درجہ میں ہی کیوں نہ ہو۔

ہیومن کون ہے؟

جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہو اور جسکا خیال ہو کہ اس آزادی میں تمام انسان برابر ہونے کی وجہ سے آپس میں بھی برابر اور مساوی ہیں اور دنیا کی لذت طلبی جسکا مقصد حیات ہو۔

مختصر یہ کہ ہیومن وہ ہے جس کا نعرہ آزادی ہو قانون مساوات کلی کی بنیاد پر اور عمل کا پٹرول مادی دنیا کا حصول ہو، تو پتہ یہ چلا کہ شکلاً ایک جیسے نظر آنے والے انسانوں میں حقیقت کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ ایک فرد خود کو آزاد مطلق العنان (خدا) سمجھتا ہے دوسرا اپنے آپ کو کسی آزاد مطلق العنان قوت (خدا) کا پابند سمجھتا ہے۔ ایک کے عمل کا پٹرول مادے کا حصول ہے ۔ دوسرے کے عمل کا پٹرول آخرت کا حصول یا اعلیٰ قوت کی رضا ہے ۔ ایک شخص خود قانون سازی کرنے کا دعویدار ہے صحیح و غلط، حرام و حلال، خیر و شر خود انسان بتائے گا۔ محض عقل انسانی سے انسانی امور کو طے کرنے کا دعویٰ کرتا ہے کسی ایسے خارجی ذریعہ علم پر یقین نہیں رکھتا جو انسان کے باہر سے ہو مثلاً وحی وغیرہ۔

دوسرا شخص طریقہ زندگی/ صحیح اور غلط کی تعیین خود نہیں کرتا بلکہ جس قوت اعلیٰ کو اپنے سے بڑھ کر سمجھتا ہے اس سے علم حاصل کرنے کا قائل ہے، صحیح اور غلط کی تعیین، خیر و شر کی دریافت اسی اعلیٰ طاقت سے کرتا ہے ۔ ایک کو ہیومن کہتے ہیں دوسرے کو عبد کہتے ہیں۔ ہیومن کا وجود سترہویں صدی کے بعد کا ہے جو کہ ایک خاص علمیت یعنی فلسفہ جدید کے افکار و نظریات سے پیدا ہوا ہے ہیومن بین کا لفظ بھی سترہویں صدی سے قبل انگلش لٹریچر میں نہیں ملتا بلکہ انسان کے لیے لفظ (man kind) کا بولا اور لکھا جاتا تھا ہیومن بین وہ ہے جو اس خاص علمیت پر اعتماد رکھتا ہو آزادی جس کا نعرہ ہو مساواتِ کلی جس کا قانون ہو اور اس کے ہر عمل کا مقصد مادی دنیا کا حصول ہو اور جو آزادی، مساوات اور ترقی کو قدر تسلیم نہیں

کرتے وہ انسان کہلانے کے حق دار نہیں ہیں۔

(Humanrights charter) انسانی حقوق کے عالمی منشور میں جو حق بیان کیے گئے ہیں وہ حقوق ایک ہیومن کے ہیں کسی عبد کے نہیں ہیں، عبدیت کے نظریے کا حامل انسان انسانیت پر بوجھ ہے وہ ایک اچھا، معزز اور قابل قدر انسان نہیں بن سکتا۔ قابل قدر معزز انسان وہی ہے جو آزادانہ اقدار کو قبول کرے اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحفّظ میں رکاوٹ نہ بنے ایسے انسان کے لیے تمام حقوق ہیں۔ جب آپ اپنی علمیت اور ایمانیات سے انسان کی حیثیت طے کرنے کے بعد انسانی حقوق کے منشور پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کو کئی چیزیں عجیب نظر آتی ہیں جن کو تسلیم کرنا آپ کے ایمانیات کے خلاف ہوتا ہے۔ بہت سی دفعات میں یوں محسوس ہوگا کہ یہ کیسے ایک انسان کا حق ہوسکتا ہے لیکن جب اُس خاص علمیت کے تناظر میں دیکھیں جو فلسفہ جدید سے پیدا ہوئی تو اس عینک سے آپ کو بھی انسان ہیومن بین Human being نظر آئے گا ۔لہٰذا اس کے حقوق و ذمہ داریاں آپ کو بھی بالکل وہی نظر آئیں گی جو کہ اہلِ مغرب بیان کرتے ہیں۔ اس خاص علمیت و نظریات کی عینک لگا کر آپ تھوڑی دیر انسان کو دیکھیں تو آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ زنا بالرضاء، انسان کا حق ہے، شادی سے پہلے جنے ہوئے بچے کو مکمل معاشری تحفظ اس کا حق ہے، مذہب کو تبدیل کرنے کی مکمل آزادی اس کا حق ہے، طلاق دینا صرف مرد کا حق نہیں بلکہ عورت بھی اس کی مکمل حق دار ہے، پردہ سے باہر نکلنا عورت کا حق ہے، اسلام کی متعین کردہ سزاؤں کو انسانیت سوز سزائیں قرار دیا جائے گا۔

حقوق انسانی کی بحث

اہلِ مغرب نے حقوق کا ایک جائزہ بنا رکھا ہے جسے ہیومن رائیٹس چارٹر کہتے ہیں ۔کہ لوگوں کو فلاں فلاں حق ملنے چاہئیں۔ انہوں نے نظمِ انسانی چلانے کے لیے حقوق کے ڈھانچے کو بنیاد بنا کر قانون سازی کا عمل کیا ہے۔ ماقبل ابواب میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ وہ فرض اور حکم کو بنیاد بنا کر قانون کا ڈھانچہ کھڑا نہیں کرسکتے اس لیے کہ کسی چیز کو فرض تو اس وقت ہی تصور کیا جاسکتا ہے جب اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ انسان سے بھی اعلیٰ کسی خارجی

قوت کا وجود ہے۔جس کا یہ پابند ہے اس کے لئے اس قوت کی بات ماننا ضروری ہے۔

جب فلسفہ وفکر اس بنیاد پر ہے کہ انسان کی حقیقت ہی حقیقت اعلیٰ ہے اور یہ بالکل آزاد ہے کسی کا پابند نہیں،اپنے ہر فکر وعمل میں آزاد پیدا ہوا ہے۔

کوئی چیز خیر (فرض) کہہ کے اس پر نافذ نہیں کی جاسکتی بلکہ نظم زندگی چلانے کے لیے ایک دوسرا طریقہ کار سامنے آیا ہے کہ فرد بالکل آزاد ہے،اس کی آزادی کی ہر طرح حفاظت کی جائے گی ،اس کی ہر آزادی تسلیم کی جائے گی جب تک کہ کسی دوسرے کے حق آزادی میں یا دیگر حقوق جو اس بنیاد پر ملتے ہیں ان میں خلل انداز نہ ہو۔لہٰذا اہلِ مغرب نے قانون کا سانچہ اس طرح کھڑا کیا کہ فلاں کا کیا حق ہے،فلاں کا کیا حق ہے،حقوق کی ایک فہرست بنا کر نافذ کر دی۔کسی ایسے تصورِ خیر کو وہ نافذ نہیں کر سکتے ، نہ ہی لوگوں کو کسی ایسی خیر پر عمل کرنے کے لیے پابند کر سکتے ہیں جس سے تمام لوگوں کے حقوق خود بخود ملتے چلے جائیں۔

جبکہ مسلمان ایک خاص تصور خیر رکھتے ہیں قرآن وسنت کے سامنے اپنے آپ کو جھکاتے ہیں ان کا قانون اللہ کی طرف سے طے ہے۔کچھ فرائض ہیں کچھ محرمات ہیں کچھ مکروہات ہیں جو آدمی ان پر عمل کرتا رہے گا اس کے متعلقین کے حقوق خود بخود ادا ہوتے چلے جائیں گے اور معاشرے میں ایک محبت کی فضا قائم ہوگی۔حق دینے والا تو اس لئے خوش کہ مالک حقیقی کا حکم پورا کیا ہے اور حق لینے والا اس لئے خوش کہ اس کو اسکا حق مل گیا ہے۔

لہٰذا اسلامی قانون حقوق کو دیکھ کر نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اللہ کی طرف سے فرض کیا ہے واجب کیا ہے حرام کیا ہے (جیسے کہ ہماری تمام کتب فقہ میں ہے۔اسلامی کتب فقہ ہی اسلامی قانون کی کتابیں ہیں)۔اللہ کے حلال کردہ کو حلال مانا جائے اس کے حرام کردہ کو حرام جانا جائے فرائض پر عمل کیا جائے تو ہر ایک کا متعین شدہ حق بھی مل جائے گا۔

مثال:

عورت کے کچھ حقوق مرد کے اوپر ہوتے ہیں تو اسلام عورت کے حقوق یوں لیکر دیتا ہے کہ مرد پر کچھ چیزیں خالق حقیقی کی طرف سے فرض کر دی جاتی ہیں کہ اگر نان نفقہ نہ دے گا

تو عندالشرع مجرم قرار پائے گا۔ نتیجتاً مرد اپنے مالک کی بندگی کرتا ہوا اس فرض کو ادا کرتا ہے دوسری جانب عورت کو اس کا حق مل جاتا ہے۔ جبکہ اہلِ مغرب کسی چیز کو فرض کہہ کر لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتے کہ جناب یہ حقیقت اعلیٰ (خدا) کی طرف سے نافذ کردہ ہے، لہٰذا اس پر عمل کرو۔

آج کا روشن خیال انسان کہے گا میں آزاد پیدا ہوا ہوں فرض کیا ہے، حرام کیا ہے یہ میں اپنی عقل سے طے کروں گا خود بتاؤں گا۔ اپنے علاوہ کسی دوسرے سے اپنی زندگی کے بارے میں پوچھنے کا روادار نہیں ہوں کسی کو یہ حق نہیں کہ مجھ پر کوئی چیز فرض قرار دے، حرام قرار دے، میں آزاد ہوں۔ لہٰذا ایسے آزاد انسانوں میں جو کسی کے پابند نہیں ہیں ان میں قانون حقوق سے بنائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے حقوق طے کر دیئے جائیں صرف وہ ان حقوق کا لحاظ رکھیں اس کے علاوہ جو چاہے کرتے پھریں۔

چونکہ اہلِ مغرب نے قانونی ڈھانچہ حقوق کی بنیاد پر قائم کیا ہے اس غلط طرزِ عمل کی وجہ سے کئی طرح کے نقصانات اٹھانے پڑے، مثلاً حفظِ مراتب کا جنازہ نکل گیا بوڑھوں کو اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کرنے کے لئے اولڈ ہاؤس جانا پڑا، قانون پیچیدہ سے پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی خرابیاں ہیں جن کو تفصیل سے ہیومن رائیٹس چارٹر کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ اسلام ان تمام خرابیوں اور قانونی پیچیدگیوں سے پاک ہے کیونکہ اسلام میں قانون سازی فرائض کی بنیاد پر ہے نہ کہ حقوق کی بنیاد پر۔ لیکن مغربی قانون کی ان خرابیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور مغربی قانونی ڈھانچے کو آئیڈیل تسلیم کر کے اسلامی قانون کو بھی اسی طرز پر بنانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

ہیومن رائیٹس کی حقیقت اور قرآن وسنت سے اثبات کی جسارت

مسلمانوں کی تاریخ میں سینکڑوں فقہاء ومحدثین اور مفسرین آئے جو اپنے فن کے امام تھے قرآن وسنت کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا، فقہاء کرام نے استنجاء تک کی بحث کو مجمل نہیں چھوڑا لیکن اس بات کو کبھی کسی نے عنوان کا جامہ نہیں پہنایا۔

☆۔ آزادی اظہار رائے انسان کا حق ہے

☆۔ مساوات انسانی

☆۔ آزادیٔ مذہب کا حق

☆۔ ہر انسان کا حق آزادی

☆۔ آزادیِ اجتماع کا حق

☆۔ ضمیر اور اعتقاد کی آزادی کا حق

یہ تمام نعرے اور اس طرح کے اور کئی عنوانات جن کو مغرب نے موضوع بحث بنایا ہے اس کے پیچھے ایک خاص پس منظر ہے۔ یہ ساری اصطلاحات ایک خاص ما بعد الطبعیات (ایمانیات) رکھتی ہیں جن کا اسلام میں درجہ کفر اور الحاد کے سوا کچھ نہیں لیکن ہمارے مسلمان بھائی اپنی سادگی سے آزادی مساوات، ترقی، مذہبی آزادی وغیرہ کی تشریح اپنے زعم کے مطابق کر کے اس کا اسلامی جواز فراہم کرتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔

المومن غرُّ کریم و الفا جر خبُّ لئیم

مومن بھولا بھالا ہوتا ہے۔

سادہ لوح مسلمان ان نعروں کو اسلامی جواز فراہم کرنے کے درپے ہیں جبکہ اس نعرے کے خاص پس منظر اور جو معنیٰ اہل مغرب مراد لیتے ہیں اس سے ناواقف ہیں۔اب ایک نظر ان آیات و احادیث پر ڈالتے ہیں جن سے مساوات آزادی اظہار رائے آزادی مذہب کو ثابت کیا جاتا ہے۔اور حقیقتاً مغربی فکر میں اس نعرے کا کیا مطلب ہے۔

1۔زندہ رہنے کا حق

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکا نما قتل الناس جمیعا و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا .

جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ کسی جان کا بدلہ لینا ہو یا وہ زمین میں فساد برپا کرنے کا مجرم ہو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔(المائدۃ 32-5)

لیکن اہل مغرب کے نزدیک (زندہ رہنے کے حق) کا مطلب ہے اس کی زندگی اس کی ملکیت ہے۔ مرتد ہونے کے بعد اس کو قتل نہیں کر سکتے، وہ خودکشی کرے تو صحیح ہے کیونکہ زندگی اس کی اپنی ملکیت ہے۔ اس کو زندگی کا حق ہے جس طرح چاہے زندہ رہے یا مر جائے جبکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

2۔ انسانی مساوات:

یا یها الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند الله اتقاکم

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا اور ہم نے تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (الحجرت 13--49)

اہل مغرب مساوات سے مراد لیتے ہیں کہ مرد و عورت کے حقوق برابر ہیں حق طلاق مرد کو ہے تو عورت کو بھی اسی طرح ہے۔ میراث میں جائیداد برابر تقسیم ہونی چاہیے لڑکے کو لڑکی سے دگنا دینا انصاف کے خلاف ہے۔ ایک فقیہ کی بات اور ایک عام آدمی کی بات کو برابر درجہ حاصل ہے حتیٰ کہ کسی نبی کی بات اور عام بندے کی بات کو برابر حیثیت سے دیکھا جائے ہر ایک بات میں مساوات کلی ہونی چاہیے۔ ایسا کوئی تصور مساوات اسلام میں قبول نہیں ہے۔

3۔ آزادی اظہار رائے کا حق:

یوں بھی کہا جاتا ہے کہ مملکت اسلامیہ کے تمام شہریوں کو اسلام آزادی اظہار رائے کا حق دیتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ بھلائی پھیلانے کے لیے ہو برائی کے افشاع کے لیے نہ ہو۔

الذین ان مکنا هم فی الارض اقاموا الصلاۃ و اٰتوا الزکوۃ و امرو بالمعروف و نهوا عن المنکر (الحج 41--22)

ان کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے۔۔

بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

آزادی اظہار رائے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ جن لوگوں نے یہ نعرہ ایجاد کیا ہے۔ وہ اس سے مراد یہ نہیں لیتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی جو چاہت دل میں ہے جو خیال بھی نفس میں اٹھے اس کو ظاہر کرنے کا آپ حق رکھتے ہو اگر کسی کے دل میں انبیاء کا بغض ہے تو وہ حق رکھتا ہے کہ اس کا اظہار کر سکے۔ کسی بھی معزز ہستی کے بارے میں آپ کی کوئی تنقیدی رائے ہے تو آپ حق رکھتے ہو کہ اس کی اشاعت کرسکو۔ نبی اکرم ﷺ کے خاکے بنا کر شائع کرنا اسی قبیل سے ہے۔ آسان لفظوں میں یوں کہیں کہ آزادی کے ساتھ جو چاہو جس کے بارے میں چاہو اپنے خاص تصور کا اظہار کرسکو۔ آپ کا یہ حق نہ تو حکومت چھین سکتی ہے اور نہ ہی معاشرے کو چاہیے کہ آپ کو اس حق سے محروم کرے۔

مذہبی آزادی:

لا اکراہ فی الدین

دین میں کوئی جبر نہیں ہے

اسلام کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ تم اسلام ضرور بالضرور اختیار کرو، دین میں کوئی زبردستی یا جبر نہیں ہے اپنی خوش دلی سے چاہو تو اسلام کے دائرہ میں آجاؤ۔ مذہبی آزادی کا لفظ جن لوگوں نے اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے وہ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں لیتے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہر فرد جو مذہب چاہے اختیار کرے جب چاہے بدل دے۔ صبح کو اس کو مذہب اسلام اچھا لگتا ہے تو وہ مسلمان ہو جائے اگر دوپہر کو اس کو عیسائی مذہب سے لگاؤ ہو جاتا ہے تو کوئی حرج نہیں، وہ عیسائی ہو جائے۔ شام کو اگر بدھ مت مذہب بھلا معلوم ہوتا ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں وہ بدھ مت اختیار کرے۔ جو چاہے مذہب اختیار کرلے اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے یہ بالکل آزاد ہے۔ اس کو مذہبی آزادی حاصل ہے بلکہ مذہبی آزادی اس کا حق ہے اور اس حق کا تحفظ کیا جائے اور اس کو تسلیم کیا جائے۔

اس کو مکمل اختیار ہے کہ چاہے عیسائی ہو یا مسلمان ہندو ہو یا سکھ رہے جسے چاہے

اختیار کرے جب چاہے بدل لے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی فرد صبح چائے پسند کرتا ہے شام کو کافی اور رات کو قہوہ پینا پسند کرتا ہے اسی طرح مذہب بھی اس کو جو اچھا لگے اختیار کرے۔

جس طرح صبح کو چائے شام کو کافی اور رات کو قہوہ پینے سے اس کی معاشرتی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اس کو مکمل آزادی ہے جسے چاہے جس وقت اختیار کرے اسی طرح مذاہب کا معاملہ ہے جسے چاہے اختیار کرے جب چاہے بدل لے اس کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔اہلِ مغرب کے ہاں یہ ہے مذہبی آزادی، جس کی اسلام میں تو کیا دنیا کے کسی مذہب میں بھی اجازت نہ ہوگی۔اسی طرح کے کئی اور نعرے ہیں جن کی آواز مغرب سے اٹھی ان اصطلاحات کے پس منظر میں وہ مابعدالطبعیات ہیں جو فلسفہ مغرب اور فکر جدید سے پیدا ہوئی ہیں۔ان نعروں کی وہ تشریحات جو ہمارے لوگ کرتے ہیں سراسر غلط ہیں کہ آزادی مذہب کا مطلب یہ ہے مساوات سے یہ مراد حق اظہار رائے سے یہ مراد ہے۔

دراصل کسی اصطلاح کی تشریح اور توضیح کا حق اسی فرد یا معاشرہ کو ہوتا ہے جس نے وہ اصطلاح ایجاد کی ہو اصطلاح غیروں کی بول کر مطلب اپنا مراد لینا یا اپنے زعم وگماں کے مطابق تشریح کرنا علمی بددیانتی ہے۔اس لبرل آزادی اور مساوات کی مابعد الطبعیات بالکل جدا ہے اس تصور آزادی اور مساوات سے جسے مسلمان خیال کرتے ہیں۔اس کی تفصیلی بحث آزادی Freedom کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

آزادی Freedom

تمام مسلم دنیا ایک عرصہ تک انگریزی استعمار کے شکنجے میں رہ چکی ہے جو علاقے ماتحتی میں رہے ان کو Post colin society کہا جاتا ہے۔تمام مسلم دنیا سوائے ترکی کے ایک چھوٹے سے خطے اور ایران کے ایک مختصر سے علاقے کے علاوہ ایک سو پچاس سال تک Post colin رہ چکے ہیں۔اس غلامی کے نتیجے میں جو تحریکیں اٹھیں اور ہر علاقے کا لٹریچر جو اس کی مادری زبان میں لکھا گیا وہ لٹریچر جس لفظ سے بھرا پڑا ہے وہ ہے لفظ آزادی۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر تک 98 فیصد مسلم دنیا P.C.S بن چکی تھی اور 1945ء

تک دوبارہ 96 ریاستیں آزاد ہو چکی تھیں۔ اس آزادی کی وجہ یہ تحریکیں بنیں یا استعماری قوت کا کمزور ہو جانا سبب بنا یا جنگ عظیم اوّل اور دوم کے نتیجے میں یہ آزاد ہوئیں، جس وجہ سے بھی آزاد ہوئیں مگر یہ بات واضح ہے۔ کہ آزادی کے نام پر مسلمانوں کو دعوت دی جائے گی تو یہ اس کو قبول کریں گے کیونکہ P.C.S ہونے کی وجہ سے آزادی کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ غلامی سے اور مغلوب ہونے سے خوف کھاتے ہیں۔

جب مسلم دنیا کو آزادی ملی تو یہ ریاستیں ویسی ریاستیں نہ تھیں جو کہ آزادی سے پہلے تھیں بلکہ پوسٹ کولونائز ہونے کے بعد آزادی ان کو نیشنل/قوم کی بنیاد پر ملی، انگریزی استعمار سے آزاد ہونے کے بعد نیشنل سٹیٹ وجود میں آئیں یعنی قومیت کی بنیاد پر آزاد ہونے والے ملک۔ جب کسی خطہ میں سرحدیں قومیت کی وجہ سے بنیں اور امتیازات قوم کی بنیاد پر ہو تو فطری سی بات ہے پھر آزاد ہونے والی قومیں اپنی تاریخ کو Re define کرتی ہیں یعنی اپنی تاریخ کو مرتب کرتی ہیں کہ وہ کیا تھے کون تھے دنیا میں ان کا کیا کردار رہا ہے۔ اس Re define کے نتیجے میں کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کو بیان کرنا میرا موضوع نہیں۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ ان آزاد ریاستوں میں ایسی سیاست جس میں آزادی کو قدر کے طور پر قبول کیا جاتا ہو زیادہ مقبول ہو گی، کیونکہ اس کی Fanda mental بنیادیں موجود ہیں تاکہ ہم دوبارہ کسی قوم کے غلام نہ بنیں لیکن دورِ حاضر میں جس آزادی کی طرف دعوت دی جاتی ہے یہ وہ تصور آزادی نہیں جس کا ذکر ہمارے لٹریچر میں ہے جس کے لئے تحریکیں اٹھی تھیں بلکہ یہ ایک لبرل تصور آزادی ہے اور جس آزادی کے لئے تحریکیں اٹھیں تھیں اس کو حریت کے ہم معنی استعمال کیا جاتا تھا۔

لبرل تصور آزادی

مغربی فلسفہ/فلسفہ جدید کے تین بنیادی عنصر ہیں:

o۔ آزادی　　o۔ مساوات　　o۔ ترقی

ان میں سب سے اہم عنصر آزادی ہے ہم آزادی کی وہی تشریح و توضیح عرض کریں

گے جواہلِ مغرب کے نزدیک مراد ہے۔Freedom is the absence limitation.میں ہر طرح کی رکاوٹ سے آزاد ہو جاؤں جو چاہوں چاہ سکوں اور اسے عمل میں لا سکوں۔ظاہر ہے ایک انسان جب اپنے اوپر نظر ڈالتا ہے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تو ممکن نہیں ہے خاص طور پر تین رکاوٹیں انسان کی آزادی سے مانع ہیں۔

1)۔مادی رکاوٹیں (فزیکل لیمیٹیشن) Physical Limitation

2)۔تہذیبی رکاوٹیں (کلچر) Cultural Limitation

3)۔قانونی رکاوٹیں (قانون لاء) Legal Limitation

مادی رکاوٹیں

کئی دفعہ انسان کے ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ صرف ان تین سو سالوں میں ایجادات کا سیلاب آ گیا۔اس سے پہلے بھی تو ذہین انسان دنیا میں زندگی گزارا کرتے تھے مگر پوری انسانی تاریخ میں اس قدر ایجادات تو کیا ان ایجادات کا تصور بھی نہیں ملتا۔حالانکہ سائنس دان موجود تھے تحقیق کے ادارے قائم تھے اور بہت ذہین اور فن میں امامت کا درجہ رکھنے والے لوگ موجود تھے مگر ایجادات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

جواب یہ ہے کہ سائنس اور سائنسدان تو تھے مگر ایک نظریاتی تبدیلی جو سترہویں صدی میں پیدا ہوئی وہ نظریۂ تحقیق اس سے قبل نہ تھا پہلے سائنس دان تحقیق کیا کرتے تھے حقیقت کو تلاش کرنے کے لئے ،مظاہر قدرت کے مشاہدے میں سرگرداں رہتے تھے،حقیقت کا علم ان کا مقصود ہوتا،تا کہ ان حقائق کے مطالعہ سے سب سے بڑی حقیقت (وجود باری تعالیٰ) کا علم حاصل ہو۔

سترہویں صدی عیسوی سے قبل سائنس کی تحقیق کا مقصد تحقیق کائنات تھا لیکن سترہویں صدی عیسوی کے بعد سائنس کا مقصد تسخیرِ کائنات ہے حقیقتِ اعلیٰ کی تلاش ختم ہو گئی کیونکہ حقیقت اعلیٰ سپر اتھارٹی نفس انسانی کو قرار دیا ہے۔17 صدی کے بعد فلسفہ جدید میں سب سے بڑی حقیقت یعنی سپر اتھارٹی (بھگوان،خدا،کرشن،دیوتا) کوئی نہیں بلکہ سب سے بڑی حقیقت،سپر اتھارٹی انسان خود ہے کانٹ کی دلیل یہ تھی۔

I think therefore I am.

میں سوچ سکتا ہوں اس لئے میں ہوں۔

اس نے کہا کہ کائنات میں صرف میرا وجود یقینی ہے اس کے علاوہ جو میں دیکھ رہا ہوں، ہوسکتا ہے وہ خواب ہو مگر یہ طے ہے کہ میں خود تو موجود ہوں جو یہ خواب دیکھ رہا ہے۔

اسی طرح ہر انسان کا معاملہ ہے کہ وہ ہی اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔اس انسان سے زیادہ مقدس کائنات میں اور کوئی نہیں ہے اور انسان کے لئے یہ روا نہیں کہ اپنے علاوہ کسی ایسی ہستی کا تصور رکھے جس کا نہ تو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اس پر تجربہ کیا جاسکتا ہو، یہ اپنے کسی قول وفعل، عمل فکر میں نہ کسی کا پابند ہے نہ جوابدہ اور نہ ہی رہنمائی لینے کا محتاج ہے۔ یہ بالکل آزاد ہے جو چاہے چاہ سکتا ہے اور عمل میں لا سکتا ہے اس اعلیٰ حقیقت (نفسِ انسانی) کی خواہشات عملی طور پر ممکن بنانے کا کام سائنس کرتی ہے انسان کے لیے کائنات کو مسخر کرسکتی ہے۔

انسان کی آزادی میں کئی طرح کی رکاوٹیں ہیں ان میں ایک مادی رکاوٹ ہے مثلاً انسان بہت دور تک نہیں دیکھ سکتا، انسان کی مخصوص جنس ہوتی ہے۔مرد یا عورت جو اس کی مرضی سے نہیں ہوتی، یہ دیوار کے اندر سے نہیں گزر سکتا دوسرے ملک سے اسے کوئی پکارے تو یہ سن نہیں سکتا لا آف فزکس سے آوٹ نہیں ہوسکتا مثلاً اس کے اور اس کے والدین کے جینز ایک طرح کے ہوں گے۔لہٰذا مغرب نے اس کا حل یہ نکالا کہ سائنس کمپلیکس بنائے کہ ہم انسان کو آزاد کریں گے تمام مادی رکاوٹوں سے یہ دیوار کے پار تو کیا دوسرے براعظم میں بھی دیکھ سکتا ہے بہت دور سے آواز سننے کو ممکن بنایا، انسان کو ہوا میں اُڑایا، ٹیکنو سائنس کے ذریعے مادی رکاوٹوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ انسان ان مادی رکاوٹوں سے آزاد ہو۔

جینٹک انجینئرنگ پر کئی بلین ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں کہ آپ کو کس قسم کا بچہ چاہیئے اس کی آنکھیں آپ کسی طرح کی رکھوانا چاہتے ہیں اس کے بال کیسے ہونے چاہئیں۔مادی رکاوٹوں کو کم سے کم کیا جاتا ہے نئی نئی ایجادات کے ذریعے تاکہ انسان اپنی آزادی کو محسوس کرسکے

اور ایک کامل انسان بنے۔اور کامل انسان وہی ہے جو کہ مکمل طور پر آزاد ہے انسان کی ترقی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد کرے، ظاہر ہے مادی رکاوٹوں کو سائنس کے ذریعے ہی کم کیا جا سکتا ہے اس لئے جو انسان ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے سائنس میں ترقی کرنا ہوگی تب وہ مادی رکاوٹوں سے آزاد ہوگا اور کامل انسان بنے گا۔لہٰذا سائنس کی ترقی اصل انسان کی ترقی ہے۔(معاذ اللہ)

تہذیبی وثقافتی رکاوٹیں

انسان کی آزادی میں دوسری بڑی رکاوٹ اس علاقے کی تہذیب وثقافت ہے انسان کے دل میں بہت سی امنگیں خواہشات ایسی ہوتی ہیں جن کو بروئے کار صرف اس لیے نہیں لاسکتا کہ معاشرے میں دوسرے بسنے والے لوگ اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے، مثلاً اسلامی معاشروں میں عورت کا یوں بازار میں نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے اسی طرح بعض دوسری تہذیبوں میں بھی عورت کا غیر محرم سے بات چیت کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا، ہندو معاشروں میں خاوند کی وفات کے بعد عورت دوسری شادی نہیں کرسکتی تو یہ عورت کے لئے تہذیبی وثقافتی رکاوٹیں ہیں، وہ اپنی بہت سی خواہشات کو قدرت کے باوجود پورا نہیں کرسکتی کہ اس کا معاشرہ، تہذیب، ثقافت، کلچر اس کو روکتا ہے وہ ایک آزاد عورت بن کر زندگی نہیں گزار سکتی۔

مذہبی معاشروں میں مذہب کی حد بندیاں رکاوٹ بنیں گی اور روائتی معاشروں میں اس علاقے کی ثقافت، رواج، انسان کی آزادی میں رکاوٹ بنے گا۔مغربی فکر وفلسفہ میں کامل انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو مکمل طور پر آزاد سمجھے ہر طرح کی تہذیبی، ثقافتی، ومذہبی رکاوٹ سے بھی اور جوان کا قائل ہو وہ فرسودہ، old minded بنیاد پرست، Fundamental روشن خیالی سے نا آشنا افراد ہیں کامل انسان وہ ہے جو Free of all absence limitation یعنی جو ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہو۔لہٰذا مغرب نے اس معاشرتی وتہذیبی رکاوٹوں سے بچانے کے لئے سول سوسائٹی کے قیام پر زور دیا سول سوسائٹی کو انسانی فلاح کی ترقی کا ضامن قرار دیا، انسانیت کا آئیڈیل کلچر سول سوسائٹی ہی ہوسکتی ہے۔

کلچر کا لفظ عام طور پر تہذیب وثقافت پر بولا جاتا ہے مگر اس لفظ کا پس منظر کچھ اس

طرح ہے، کلچر لفظ ایگریکلچر سے لیا گیا ہے۔ ایگریکلچر کا معنی ہے کاشت کاری کرنا، زمین پر کھیتی باڑی کرنا، جب مغرب نے علاقے فتح کیےتو ان زمینوں پر قبضہ حاصل کرلیا جولوگ تو اچھی طرح کاشت کاری نہ کر سکتے تھے ان سے تو زمین کو صاف کر دیا اور جو لوگ زمین سے غلہ وافر اگاتے تھے ان کی جان بخشی اس لئے ہوگئی تا کہ زراعتی اور معدنی پیداوار مانچسٹر کی طرف بہتی رہے۔

برصغیر کے لوگوں کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ یہ لوگ زمین کی پیداوار اچھے طریقے سے اگا سکتے ہیں بیج بونا اور کاشت کاری کرنا تو اچھی طرح جانتے ہیں مگر ان کے ذہن کی سطح مغرب سے بہت نیچے ہے۔ ان کی ذہن سازی کی ضرورت ہے تا کہ یہ معاشرتی تہذیبی و مذہبی رکاوٹوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد کر سکیں۔ کلچر کا لفظ ایگریکلچر سے نکلا ہے کہ جس طرح زمین میں بیج بویا جاتا ہے اور کاشت کاری کا عمل ہوتا ہے اور علاقے ترقی کرتے ہیں اسی طرح ذہن میں بھی افکار، خیالات ونظریات کا بیج بویا جاتا ہے جس سے عملِ انسانی پیدا ہوتے ہیں۔ برصغیر کے لوگ ذہنی سطح پر اس طرح نہیں سوچتے جس طرح ایک آزاد آدمی سوچتا ہے ان کے خیالات ونظریات قدیم وفرسودہ ہیں، یہ لوگ جدت پسند نہیں ہیں لہذا ان کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کے لیے اور ان کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے انگریز نے جو یونیورسٹیاں قائم کیں ان میں نہ تو انجینئر بنائے جاتے تھے اور نہ ہی سائنسدان پیدا کیے جاتے تھے۔ بلکہ انگریزی آرٹ اور لٹریچر پڑھایا جاتا تھا۔ انگریز ادباء اور شعراء کا کلام تعلیم دیا جاتا تھا ان کے لکھے ہوئے ناول پڑھائے جاتے تھے۔ شیکسپئر (shakespeare) یہ پڑھائے جاتے تھے یا پھر (Law) لاء قانون پڑھایا جاتا تھا۔

حالانکہ برصغیر کے اپنے شعراء اور ادباء جو ادب اور شعر کے میدان میں کسی سے کم نہ تھے۔ اکبر، غالب اور اقبال جیسے قوتی تخیل رکھنے والے شعراء ان میں موجود تھے۔ برصغیر کی اپنی ایک ثقافت اور بودو باش تھی ان کو سائنس پڑھاتے، انجینئر بناتے، یا کچھ دوسرے فنون سکھاتے جن کے سکھانے پر اس وقت کے علماء بھی راضی تھے کہ تم ان مسلمانوں کو سائنس پڑھاؤ۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان لوگوں کی ذہنی سطح پسماندہ ہے آزادانہ اقدار کو قبول

کرنے کی ان میں ابھی صلاحیت موجود نہیں ہے، پہلے ان کو ایسی تعلیم دو کہ یہ آزادی کو قدر یعنی بطور پیمانہ کے تسلیم کریں اور آزادانہ ماحول کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، ان کا ذہن ثقافتی ،روائتی اور مذہبی حد بندیوں سے آزاد ہو جائے۔

جب آزادانہ اقدار کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہو جائے گی تو پھر سائنس اور ٹیکنالوجی سکھائیں گے۔ اس لیے ابتداء میں برصغیر کے اندر جو ادارے قائم کیے گئے وہ صرف انگریزی ادب پڑھاتے تھے یا پھر برطانوی قانون کی تعلیم دی جاتی تھی کہ ہمارا نوجوان پڑھ لکھ کر بھی اپنے دین سے ناآشنا اور معاشرتی اور روائتی طرز زندگی پر آزادانہ اقدار کو ترجیح دے، مسلم معاشروں میں عورت کو مغرب نے نشانہ بنایا کہ تم آزادی کے لئے جدو جہد کرو۔ معاشرہ ثقافتی اور روائتی رکاوٹوں سے آزاد اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان کا کلچر نہ تو روائتی ہو نہ ثقافتی نہ مذہبی بلکہ سول ہو۔سول سوسائٹی کیسی ہوتی ہے اس کی تفصیلی بحث تو اگلے صفحات میں درج کی جائے گی، مختصر یہ کہ ایسے معاشرتی ماحول کا قیام جس میں فرد جو بھی طرز زندگی اختیار کرے اس کی وجہ سے اس کی اقداری حیثیت پر کوئی فرق نہ پڑے اسی طرح ایک طرز زندگی کو چھوڑ کر دوسرا طرز زندگی اختیار کرنے پر معاشرتی طور پر اس کا کوئی اثر اس کی ذات پر نہ ہو۔ مثلاً ایک آدمی شراب پیتا ہے ایک نماز پڑھتا ہے ،ایک پارک میں بیٹھ کر گھاس کے پتے گنتا ہے، یہ سب برابر ہیں۔ معاشرہ ان میں سے کسی ایک کو اچھا اور دوسرے کو اس کے عمل کی وجہ سے برا نہ سمجھے، ایک آدمی صبح کو مسلمان ہے یا اپنے گھر پر مسلمان ہے دوکان پر جا کر عیسائی بن جاتا ہے، یا شام کو یہودی بن جاتا ہے، پھر اگلی صبح اسلام کو حق سمجھتا ہے۔ اس کے تصور خیر بدلنے کو برا نہ سمجھا جائے معاشرتی طور پر اس کو وہی حیثیت حاصل ہو جو ایک عام عیسائی کو حاصل ہے یا جو ایک عام مسلمان کو یا یہودی کو حاصل ہے۔ اس کے تصور خیر بدلنے پر اس کو معاشرہ معیوب نہ سمجھے ایسے معاشرے کو سول معاشرہ کہتے ہیں۔ سول معاشروں میں دین بدلنے یا (تصور خیر) کو بدلنا ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی صبح کے وقت چائے پینا پسند کرتا ہے، دفتر یا دوکان میں جا کر کافی پینا پسند کرتا ہے اور گھر

آ کر شام کو قہوہ اسے اچھا لگتا ہے۔

کوئی انسان زیادہ معزز اور محترم اس لیے نہیں ہے کہ وہ کیا اختیار کر رہا ہے اور کس کو اختیار کر رہا ہے وہ محترم اس لیے ہے کہ کس طرح اختیار کر رہا ہے؟؟ یعنی وہ کسی ایک کام کو اختیار کرنے میں اتنا ہی آزاد ہے جتنا کہ دوسرے کام کو اختیار کرنے میں آزاد ہے، ایسے معاشرے کا قیام سول سوسائٹی کا قیام کہلاتا ہے۔ ایسے معاشرے کے قیام سے ہی تمام معاشرتی، روائتی رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا جو آدمی آزاد ہونا چاہتا ہے وہ سول معاشرہ اختیار کرے اور اپنے معاشرے کو سول بنانے کی کوشش کرے تب وہ آزاد ہو سکتا ہے اور انسانیت کی معراج تک پہنچ سکتا ہے۔

قانونی رکاوٹیں:

تیسری رکاوٹ جو انسانی آزادی میں مانع ہے وہ قانون ہے۔ ریاست میں بہت سے قانون ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان ایسا آزاد نہیں ہوتا کہ جو چاہے چاہ سکے اور پھر اپنی اس چاہت کو عمل میں لا سکے۔ لبرل ریاست کے علاوہ جو بھی قانون بنایا جاتا ہے وہ انسان کی آزادی کو محدود کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے صرف لبرل ریاست ایسی ریاست ہوتی ہے جس میں قانون بنتا ہی اس لیے ہے کہ فرد کی آزادی کے دائرے میں لامتناہی اضافہ ہو سکے اور قانون کی جکڑ ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو لوگوں کی آزادیاں چھینتے ہیں۔ لوگوں کو پابند کرتے ہیں یہ کرو یہ نہ کرو یہ حلال ہے یہ حرام ہے یہ ہمارے معاشرتی رواج کیخلاف ہے، لبرل ریاست میں فرد کی آزادی کو محدود کرنے والے افراد کی گرفت کے لئے قانون تشکیل دیا جاتا ہے چاہے وہ مذہبی گروپ ہو یا وہ قبائلی لوگ ہوں، لہٰذا جو آدمی قانونی رکاوٹ سے آزاد ہونا چاہتا ہے اور اپنی آزادی کا تحفظ چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ لبرل ریاست کے قیام کی کوشش کرے، لبرل ریاست ہی اس کو ایسا قانون دے گی جو اس کی آزادی میں لامتناہی اضافہ کرے گی۔

سائنس: مادی رکاوٹوں کو دور کر کے انسان کو آزاد بناتی ہے۔

سول سوسائٹی: فرد کی معاشرتی و روائتی رکاوٹیں دور کر کے فرد کو آزاد بناتی ہے۔

لبرل سٹیٹ: قانونی تحفظات کے ذریعے فرد کی آزادی کو لامتناہی بناتی ہے۔

انسان کی ترقی یہی ہے کہ اپنے آزادی کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرے، جو جس قدر زیادہ آزاد ہے اسی قدر ترقی یافتہ ہے۔ انسان کو آزادی مادی رکاوٹوں سے سائنس دلائے گی معاشرتی رکاوٹوں سے سول سوسائٹی اور قانونی رکاوٹوں سے لبرل سٹیٹ یہ تین چیزیں انسان کی آزادی کو لامتناہی حد تک وسیع دائرہ فراہم کرتی ہیں۔ ان میں ترقی ہی حقیقت میں انسان کی ترقی ہے، جو معاشرہ سائنس میں ترقی کرے گا وہ ترقی یافتہ ہوگا، جو سول سوسائٹی کا قیام کرے گا وہ بھی ترقی یافتہ ہوگا جو لبرل سٹیٹ کے لیے کوشش کرے گا وہ بھی ترقی پسند معاشرہ سمجھا جائے گا۔

ہم اپنے گرد و پیش میں نظر ڈالیں تو تمام وہ ممالک جو کبھی پوسٹ کولونیل سوسائٹی یعنی انگریزی استعمار کے زیر اثر رہ چکے ہیں ان ممالک کی موجودہ نسل کا آئیڈیل یہی تین چیزیں ہیں۔

1۔ سائنس　　2۔ سول سوسائٹی　　3۔ لبرل سٹیٹ

آزادی کی اقسام

آئزک برلن مشہور آدمی ہے جو کہ (western thought) مغربی ذہنیت کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مغرب میں یہی دو تصورات آزادی رہے ہیں۔

o۔ منفی آزادی　　o۔ مثبت آزادی

اولاً یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ منفی کا مطلب ''برا ہونا'' یا مثبت کا مطلب ''اچھا'' ہونا نہیں ہے۔

<u>منفی آزادی کیا ہے؟</u>

He able to do what one want to do.

یہ ایک انفرادی تصور آزادی ہے فرد اپنی انفرادی زندگی میں آزادی کا اظہار کرتا ہے۔ فرد جو چاہے چاہ لے اور اپنی چاہت پر عمل پیرا ہو۔

He able to do what one want to do.

عام طور پر اس لبرل آزادی کے تصور کو بعض حضرات مذہب سے ثابت کرنے کی

کوشش کرتے ہیں کہ جناب مذہب بھی فرد کو دو راستے دکھاتا ہے اس کو اختیار کرو یا اس کو۔ ان میں سے کسی ایک راستے کو فرد اپنی مرضی سے اختیار کرتا ہے مثلاً فرد کی زبان آزاد ہے، سچ بولے یا جھوٹ، اذان کی آواز سنائی دیتی ہے مسجد کی طرف جانا اور نہ جانا اس کے اختیار میں ہے۔ ایسی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب بھی فرد کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے، فرد کی آزادی سے یہ مراد نہیں ہے کہ خیر اور شر میں سے ایک کو اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

بلکہ خیر کیا ہے، شر کیا ہے، اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، اس کے تعین کی آزادی، یہ ہے آزادی۔ مذہبی یا روائتی معاشروں میں خیر کو اختیار کرنے کا حق تو انسان کے پاس ہوتا ہے مگر خیر کی تعین اور شر کی تعین کا حق یہ کسی انسان کے پاس نہیں ہوتا بلکہ خیر و شر کی تخلیق و تعین کا حق صرف سپرا تھارٹی (خدا، بھگوان، کرشن) کے پاس ہوتا ہے۔

وہی طاقت اعلیٰ (اللہ) ہی بتائے گا خیر کیا ہے، شر کیا ہے، مغربی فکر و فلسفہ میں یہ کوئی آزادی نہیں ہے بلکہ انسان خود معزز ہستی ہے اپنے سے بالا کسی قوت پر یقین نہ کرے، انسان کسی دوسرے سے رہنمائی لینے کا محتاج نہیں ہے عقلِ انسانی خود طے کرے گی کہ خیر کیا ہے، شر کیا ہے۔ اس کو خیر اور شر کو متعین کرنے کی آزادی دینا یہ ہے آزادی (freedom) کا مطلب، فرد عقل سے خود طے کرے گا کہ شراب پینا صحیح ہے یا غلط، سود لینا صحیح ہے یا غلط، فرد خود بتائے گا کہ سودی کام صحیح یا کہ نہیں، یہ خود ہی بتائے گا نماز روزہ اچھے کام ہیں یا نہیں۔ لہٰذا تمام معاشروں، مذاہب اور افراد کو چاہیے کہ فرد کے اس حق کو تسلیم کرے اور وہ خیر کی جو تفسیر کرنا چاہے کرے اور اس تفسیر اور تعین کا معتبر ہونا نہ تو منحصر ہو کسی مذہب پر نہ کسی معاشرے پر اور نہ ہی کسی ریاست پر، اسی کو آزادی کو کہتے ہیں۔

حقِ خود ارادیت (انسانی آزادی) Right of self determination

یعنی خیر کو خلق کرنے کا حق تسلیم کیا جائے اس حق کو معاشرہ، مذہب، خدا اور ریاست سبھی تسلیم کریں۔

خلاصہ کلام یہ کہ: ایک ایسے مقدس دائرے کا تحفظ جس میں نہ تو مذہب دخل اندازی کر سکے نہ ریاست نہ روائتی اقداراور نہ ہی کوئی دوسرا فرد۔اس دائرے میں فرد کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور وہ اپنے عمل پر کسی کا جوابدہ نہ ہو، جسے چاہے خیراور حق قرار دے جس چیز کو خیر تصور کر کے اختیار کرے اور اس اختیار کی وجہ سے اس کی معاشرتی حیثیت بھی متاثر نہ ہو۔

اس مطلق العنان فرد کی آزادی کا دعوے دار ہے مغرب جو کہ روائتی آزادی سے بالکل مختلف ہے کسی بھی مذہب میں اس آزادی کی کوئی گنجائش نہیں مغربی فکر و فلسفہ میں اس مطلق العنان آزادی کو ہر فرد کا بنیادی حق قرار دیا جاتا ہے۔

اگر کوئی معاشرہ یا مذہب یا افراد انسان کی اس آزادی کو تسلیم نہ کریں اور انسان کی آزادی کو محدود کرنے کی کوشش کریں تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان افراد کو کچل دے اس مذہب کا خاتمہ کر دے، ان معاشرتی اقدار کو بدلنے کی کوشش کرے جن میں انسان کو یہ حق آزادی حاصل نہیں ہے۔ ہر فرد کو اس آزادی کا مکمل تحفظ دیا جائے گا جب تک کہ اس کا تصور خیر کسی دوسرے کی آزادی کو محدود نہ کرے یہ ہے۔

Right of self determenation.

منفی آزادی میں تین بنیادی باتیں یادرکھنے کی ہیں۔

1)۔ خیر کو خلق کرنے کا حق

2)۔ اپنے تصورِ خیر کو بدلنے کا حق

3)۔ ہر تصور اپنانے کی مکمل آزادی ہے جب تک کہ کسی دوسرے کی آزادی مجروح نہ ہو، (یعنی اپنے تصور خیر کو کسی دوسرے پر مسلط نہیں کر سکتے) پبلک آرڈر میں نہیں لا سکتے۔

روشن خیالی

مغرب نے جب یہ طے کرلیا کہ انسان کی عظمت یہی ہے کہ وہ آزاد ہو انفرادی سطح پر بھی اجتماعی وسیاسی اور معاشرتی سطح پر بھی تو آزادی کو فروغ دینے کے لیے مختلف قسم کی تحریکوں نے جنم لیا کئی فریم ورک (Fram work) بنائے گئے۔

انہی میں سے ایک ہے تحریک تنویر (Inlight ment) یعنی **روشن خیالی**

انیسویں صدی میں ایک بہت بڑی اقداری تبدیلی رونما ہوئی قدر کے معیار بدل گئے، عزت وذلت کے پیمانے تبدیل ہوگئے، قدیم زمانے کے عظیم انسان (انیسویں صدی سے پہلے کے عظیم انسان) کو آج کی دنیا عظیم ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اس کی عظمت کو قابل دید خیال نہیں کیا جاتا بلکہ آج کا عظیم انسان وہ ہے جو روشن خیال ہے۔

روشن خیال انسان کن کن بنیادوں پر ایک روائتی مذہبی قدیم انسان سے مختلف ہے۔

آدم سمتھ (Ad Smith) جو ماڈرن اکنامکس کا بابا آدم سمجھا جاتا ہے وہ کہتا ہے روشن خیال عظیم انسان کا روائتی قدیم انسان سے تین طرح کا فرق ہے۔

1)۔ روائتی عظیم انسان فقیرانہ زندگی گزارتا تھا یعنی سادگی کو اچھا سمجھتا تھا اور خود بھی سادگی سے زندگی گزارتا تھا جیسے سقراط، عیسیٰ علیہ السلام، مریم علیہا السلام، موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہے کہ یہ روائتی عظیم انسان ہیں جو فقیرانہ سادہ زندگی گزارنے کو اچھا سمجھتے تھے، دولت کو قدر نہ جانتے تھے۔ روائتی انسان کسی کو عظیم اور کمتر سمجھنے کے لئے دولت کو معیار نہ بناتے تھے۔

2)۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کوئی تضاد نہ ہوتا تھا۔

3)۔ اپنی شہریت وہ جنگ وجدل سے حاصل کرتا تھا کسی ملک کی شہریت اس کا پیدائشی حق نہ ہوتا تھا بلکہ وہ جنگ میں حصہ لیتا تھا جس سے اپنا شہری ہونے کا استحقاق حاصل کرتا۔

ایڈ کہتا ہے کہ ہم ایسے انسان کو عظیم انسان نہیں سمجھتے جو آزادی اور دولت کو قدر نہ مانتا ہو اور فقیرانہ زندگی پر راضی ہو ہم اس کو عظیم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ آج کا عظیم انسان وہ ہے جو آزادی اور سرمائے کو قدر مانتا ہو اور دنیا میں لطف اندوز ہوتا ہو۔ بہترین فرد کون ہے، جو زیادہ سے زیادہ دولت مند ہو آزاد ہو، لذت اٹھا سکتا ہو۔ وہ معاشرہ بہترین ہے جو زیادہ دولت مند ہو آزاد ہو اور انسان کو لطف فراہم کرتا ہو۔ آج جب کسی فرد، قوم، معاشرے یا ریاست میں سے ایک کو دوسرے سے بہتر قرار دیا جاتا ہے تو یہی تین چیزیں بنیاد ہوتی ہیں۔ آزادی، دولت، لذت ۔ آج قابلِ قدر، آئیڈیل انسان وہ ہے جو یہ تین چیزیں رکھتا ہو۔

یہ بہت بڑی اقداری تبدیلی چیزوں کو پرکھنے یعنی خیر اور شر جاننے کا آلہ 19 صدی میں پیدا ہوئی۔ قدیم انسان اور روشن خیال انسان میں یہی فرق ہے وہ ان کو قدر تسلیم کرتا ہے کسی کی عظمت کی دلیل ان چیزوں کو گردانتا ہے۔ اگر آپ کسی یونیورسٹی میں جا کر طالب علموں سے کہیں کہ اپنے اپنے ہیرو آئیڈیل (پسندیدہ) لوگوں کے نام لکھ کر دیں تو ان میں سے زیادہ تر طالب علموں کے آئیڈیل فنکار یا کھلاڑی ہونگے اور یہ آئیڈیل اس لیے ہیں کیونکہ یہ آپ کو مزہ دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کو ہیرو سمجھا جاتا ہے جبکہ روائتی قدیم انسان کے ہیرو اور آئیڈیل کو آئیڈیل بنانے کے لئے اس لیے تیار نہیں کیونکہ اس کے پیچھے چلنے سے قربانی دینی پڑے گی وہ مزے نہیں دے گا بلکہ قربانی مانگے گا۔ الغرض اس وقت ہمارے زیر بحث عنوان ہے روشن خیالی، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ روشن خیال انسان وہ ہے جو کسی کے معزز یا کم تر ہونے کا معیار دو چیزیں رکھے آزادی اور دولت ۔ جس کے پاس دولت ہے اور آزادانہ اقدار رکھتا ہے وہ مہذب انسان ہے اس کو آئیڈیل سمجھا جاتا ہے اور اس جیسا بننے کی ترغیب دی جاتی ہے اور جو آزادی و سرمائے کی قدر نہیں جانتا وہ روشن خیال نہیں ہے۔

عصرِ حاضر کا دین سیکولرازم

سیکولرازم جن معاشروں میں ابتداً پروان چڑھا وہ معاشرے مذہباً عیسائی تھے ما قبل یہ بات گزر چکی ہے کہ اس وقت کے معروضی حالات کے تناظر میں عیسائیت لوگوں کی کامل رہنمائی سے قاصر تھی۔ بنیادی طور پر عیسائیت ایک مذہب تو ہے مگر دین نہیں ہے۔ مذہب کا انگلش میں ترجمہ کیا جاتا ہے Religion، چونکہ ان خطوں میں عیسائیت ہی رائج تھی اس لیے مذہبی لوگوں کو Religion People کہہ دیا جاتا تھا۔ دین کے لئے اس کے مکمل مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے ۔The complete cord of life.یعنی مکمل ضابطہ حیات۔ یہ ہے دین کا مطلب اور دنیا میں اسلام کے علاوہ باقی تمام مذاھب تو ہیں عیسائیت، یہودیت، ہندومت اس کے علاوہ غیر سماوی مذاہب، ہندمت، بدھ مت، وغیرہ یہ چند اخلاقیات، عبادات اور تصورِ عبودیت تو رکھتے ہیں مگر مکمل ضابطہ حیات نہیں دے سکتے۔ دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہے اور وہ ہے دین اسلام جو مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جب لفظ (Life) حیات بولا جاتا ہے تو دو طرح کے وسیع تصور ذہن میں آتے ہیں۔

Social Life	Collective Life
اجتماعی زندگی	انفرادی زندگی

انفرادی زندگی میں تین بنیادی چیزیں ہیں۔

عقائد　　　عبادات　　　رسومات

اجتماعی زندگی میں تین بنیادی چیزیں ہیں۔

معاشرت　　　سیاست　　　معیشت

ایک فرد اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی پر نظر ڈالے تو اس کے تمام افعال ان چھ میں سے کسی نہ کسی خانے میں کھڑے ہوں گے۔ دنیا کے مذاہب نے انسان کے انفرادی معاملات کو تو وضاحت سے بیان کیا ہے، عقائد کا تصور دیا عبادات کا انداز بتایا کچھ رسومات

(خوشی اور غمی کے موقعوں پر کرنے کے کچھ کام) کے لیے تعلیمات دی ہیں۔

چونکہ اسلام کے علاوہ باقی تمام مذاہب خاص وقت اور خاص علاقے اور خاص لوگوں کے لیے تھے اس لیے نظام سیاست کی رہنمائی سے خالی ہیں۔ معاشرتی احکام و معاشی نظام کی تعلیمات ان میں موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ باقی رہنے والا اور تمام کائنات کے لیے ایک دین نازل کیا ہے جسے محمد ﷺ لے کر آئے، جو عقائد، عبادات، رسومات کے ساتھ ساتھ معاشرت، سیاست اور معیشت کے احکام بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

شاید یہ ایک بہت بڑی وجہ بنی کہ سیکولرازم کے سامنے تمام مذاہب نے گھٹنے بہت جلدی ٹیک دیئے اور وہ سیکولرازم کے اندر ضم ہوتے چلے گئے اور ان قوموں نے سیکولرازم کو ہی اپنی فلاح و ترقی کا ضامن تصور کیا کیونکہ سیکولرازم ایک خاص معاشرت کا دعویدار ہے۔

وہ ایک خاص قسم کا نظام سیاست پیش کرتا ہے اور ایک خاص طریقہ معیشت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ سیکولرازم نے مذاہب کے درمیان جو خلا تھا اس کو پُر کر دیا، سیکولرازم چونکہ انفرادی معاملات میں مطلق العنان آزادی کا قائل ہے ایک فرد کو مکمل آزادی ہے کہ جو چاہے چاہ لے اور اپنی چاہت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔ ایک فرد جو بھی عقیدہ رکھے آزاد ہے۔

فرد انفرادی زندگی میں جتنی بھی عبادت کرنا چاہے جیسے بھی کرنا چاہے آزاد ہے، آزادی مساوات اور ترقی کا خوشنما نعرہ لگایا اور ایک خاص نظام زندگی پیش کیا جس کو عیسائیوں نے بے دریغ اختیار کیا۔ اگر عیسائیت کو سیکولرازم کے کسی نظریے سے اختلاف تھا بھی تو اصلاح دین کے نام پر اٹھنے والی تحریک سے سیکولرازم کی مکمل پشت پناہی ہوتی رہی اور عیسائیت کو سیکولرازم کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کامیاب ہوئی، اسی طرح ہر مذہب کے لوگ جب اپنے مذہب میں معاشرتی، سیاسی اور معاشی احکام کا خلا دیکھتے تو سیکولرازم کے پیش کردہ نظام کو لاحرج (No problem) کہہ کر قبول کر لیتے، تو اس طرح سیکولر نظام حیات قوموں میں اتنی تیزی سے پھیلا جیسے جنگل کی آگ اور ان خطوں کے مذہب کی حیثیت محض ایک شخص کی انفرادی choices (اختیار) بن کر رہ گیا جسے وہ کبھی بھی مکمل آزادی سے تبدیل کرنے کا حق رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ سیکولر سسٹم میں

عقائد عبادات رسومات

کی حد تک جو کچھ بھی کیا جائے سیکولر سسٹم اس میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔آپ اللہ کو اپنا رب مانیں یا دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیکیں اس سے ان کو کوئی غرض نہیں،شب و روز عبادات میں گزاریں پابندِ صوم وصلاۃ ہوں یا مے خانہ آباد کریں اس سے ان کو کوئی غرض نہیں اپنے نکاح و مرگ کی رسومات جس طریقے سے بھی ادا کریں مکمل آزادی دی جائے گی۔ بلکہ سیکولر سٹیٹ میں سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی کہ آپ اپنی چاہت کے مطابق ان کاموں کی تکمیل کریں۔

زندگی کے اجتماعی پہلو درج ذیل ہیں:

معاشرت سیاست معیشت

مغربی تہذیب کے مطابق معاشرے میں آزادانہ اقدار کو رواج دیا جائے گا اور آپ کی کوئی ایسی حرکت جو آزادانہ اقدار کے خلاف ہو قبول نہیں کی جائے گی اس پر پابندی لگائیں گے جیسا کہ بعض ممالک میں عورت کو برقعہ نہیں پہننے دیا جاتا، کیونکہ برقعہ پہننے کے عمل سے موجودہ معاشرتی نظام جو سیکولرازم چاہتا ہے اس میں لائن لگنے کا خطرہ ہے کہ آپ اس نظام کے بدلے ایک اور طرح کا اندازِ زندگی پیش کر رہے ہیں لہٰذا اس معاشرتی نظام کے خلاف کھڑے ہونے والے کو کچل دیا جائے گا اور پابندی لگا دی جائے گی۔

<u>سیکولرازم میں تصورِ سیاست:</u>

قانون لوگ بنائیں گے لوگوں کے لیے بنائیں گے،اور لوگ ہی اس کو چلانے کے حق دار ہیں یعنی دین الجمہور۔مطلب اس کا یہ ہے کہ اکثریت جس کو حرام کہے وہ حرام ہوگا اور جس کو حلال قرار دے وہ حلال ہوگا۔عوام جسے چاہے خیر قرار دے اور جسے چاہے شر قرار دے مثلاً اگر لوگ سود کو اچھا سمجھتے ہیں تو اس نظام کے نافذ ہونے میں کوئی حرج نہیں۔اگر شراب پینا پسند کرتے ہیں تو شراب خانے قائم کروانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔اگر لوگ مسجد جانا پسند کرتے ہیں تو مسجد بنانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔کسی خاص تصور خیر (قرآن وسنت) کو نافذ کر

کے لوگوں کی آزادی کو مجروح نہ کریں گے بلکہ لوگ خود یہ طے کریں گے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے، کسے خیر سمجھنا چاہیے اور کسے شر قرار دینا چاہیے۔ جو بھی ان کا تصورِ خیر و شر ہوگا سیکولر حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کو نافذ کرے۔

عوام کی چاہت کے مطابق قانون بنانے کے لیے جمہوریت کا نظام پیش کیا گیا، انقلاب فرانس کے بعد اس نظام کو عروج ملا۔

سیکولرازم کا نظام سیاست۔ جمہوریت۔ ڈکٹیٹر شپ۔ (آمریت)

سیکولرازم نے معیشت کا نظام دو شکوں میں پیش کیا۔

1)۔ کیمونزم Communism اشتراکیت

2)۔ کیپیٹلزم Capitalism سرمایہ دارانہ نظام

سرمادارانہ نظام کو زیادہ مقبولیت ملی۔ سود اور جوا جس کی بنیادی جڑیں ہیں، یہ بات واضح رہے کہ ان تمام نظاموں کی بنیاد آزادی، مساوات و ترقی پر ہے۔

معاشرت	سیاست	معیشت
آزادانہ اقدار پر	جمہوریت	اشتراکیت
معاشرہ قائم ہوگا	آمریت	سرمایہ دارانہ

سیکولرازم نے ان اجتماعی مسائل کا حل یوں پیش کیا ہے جبکہ دوسری جانب دین اسلام بھی دعویدار ہے کہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اللہ کے نزدیک صرف یہی قابل قبول ہے۔

عصرِ حاضر میں ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر لوگ عملی طور پر سیکولرازم کو قبول کیے ہوئے ہیں۔ انفرادی سطح پر مذہب اس میں سموسکتا ہے اجتماعی معاملات میں یہ ایک خاص طرز زندگی فراہم کرتا ہے۔ عصرِ حاضر میں نمو پانے والا باطل عیسائیت، یہودیت، ہندومت نہیں بلکہ سیکولرازم ہے اور اسلام کا صفِ اوّل کا حریف ہے، باقی مذاہب تو اس کے اندر ضم ہو گئے ہیں۔ مگر اسلام اس کے اندر ضم نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اسلام ایک مستقل معاشرت کا تصور رکھتا ہے، باقاعدہ معاشرتی احکام رکھتا ہے کہ معاشرہ مخلوط نہ ہونا چاہئے۔ اس میں فلاں فلاں برائی کو قریب نہ آنے دیا جائے وغیرہ۔

سیاست:

اسی طرح اسلام ایک مستقل تصورِ سیاست رکھتا ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد یا تو خلافت پر ہوگی یا شورائی نظام پر حکومت چلے گی۔ اسلامی تاریخ میں ان دو نظاموں کے علاوہ کوئی تیسرا نظام جمہوریت وغیرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر جمہوریت کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ یہ نظام تو ٹھیک ہے صرف اوپر لوگ غلط آجاتے ہیں جس سے نفاذ اسلام نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظام میں ہی ایسی خرابیاں موجود ہیں جس سے کبھی بھی نفاذ اسلام ممکن نہیں اور یہ بات بارہا تجربات سے ثابت ہو چکی ہے، جمہوریت کے بارے میں مزید تفصیل جمہوریت کے باب میں گزر چکی ہے۔

معیشت:

آج ہم مکمل طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں زندگی گزار رہے ہیں اسلام اپنا ایک نظام معیشت بتاتا ہے۔ جس میں ملکیت تو فرد کی مانی جاتی ہے مگر اس پر عنوان یہ نہیں ہوتا کہ تم اس روپے پیسے کے مکمل مالک اور خود مختار ہو جیسے چاہو کماؤ اور خرچ کرو۔ بلکہ یوں عنوان ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے امانت ہے کتب فقہ میں ابواب البیوع جو کہ اسلامی فقہ کا تقریباً چوتھا حصہ ہے سارا معاشی احکام کے متعلق ہے کہ مسلمان معیشت اس کے مطابق کریں گے۔ سیکولرازم اپنے آپ کو جامعیت کے انداز میں پیش کرتا ہے کہ ہر مسئلے کا حل میرے پاس ہے ایسا اندازِ زندگی میں رکھتا ہوں جس میں معاشرت، معیشت اور سیاست کی بھی مکمل رہنمائی موجود ہے۔

جبکہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم حق کے داعی ہونے کے باوجود اور دین حنیف کے وارث ہونے کے باوجود جس کی تکمیل کا اعلان رب العالمین کر چکے ہیں، دین کو محض ایک مذہب کر کے دکھاتے ہیں کہ اس میں فلاں فلاں چند عقائد ہیں یہ عبادات ہیں اور ان رسوم کی تعلیمات ہیں اور کام ختم یا پھر سیکولرازم کے پیش کردہ نظاموں کو اسلامی نظام زندگی کے ہم آہنگ قرار دینے کے لئے تگ و دو ہوتی ہے۔ مثلاً جمہوریت اسلام سے ثابت ہے سول سوسائٹی کا قیام اسلام کے عین مطابق ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان پر قرآن وسنت سے دلائل تلاش کیے جاتے ہیں جو کہ انتہائی غلط اور

غیر اسلامی طرز عمل ہے۔ دین حنیف اپنا خاص نظام زندگی رکھتا ہے اس کے اپنے معاشی احکام ہیں۔ معاشرتی اقدار اور قوانین ہیں جن کا مأخذ قرآن وسنت ہیں نہ کہ نفس انسانی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ان الدین عنداللہ الاسلام۔ ضابطہ حیات اسلام کے علاوہ سب مردود ہیں قبول نہیں کیے جائیں گے۔ جس طرح ہم عقائد اور عبادات میں کسی دوسرے مذہب کی بات تسلیم نہیں کرتے، اسی طرح نظامِ سیاست اور نظامِ معیشت میں بھی پابند ہیں کہ اسلام کے دیئے ہوئے سسٹم کے علاوہ کسی اور کے سسٹم کو قبول نہ کریں۔ جس طرح انفرادی زندگی میں کمی کرنے کی وجہ سے عنداللہ مجرم قرار پائیں گے، اسی طرح اگر اجتماعی معاملات میں نظام معیشت میں کسی اور نظام کا جو اسلام کے علاوہ ہے اس کا سہارا لیتے ہیں تو عنداللہ مجرم قرار پائیں گے۔

جس طرح انفرادی صورت میں دین پر چلنے کے پابند ہیں، اِسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی دین پر چلنے کے ہی پابند ہیں۔ دورِ حاضر میں اسلام کے مخالف قوت عیسائیت، یہودیت اور بدھ مت وغیرہ نہیں ہے بلکہ سیکولرازم ہے یہ ایک مؤثر مخالف قوت ہے جس نے اپنے پنجے گاڑھ لیے ہیں اور مکمل رہنمائی کا قائل ہے یہ ایسا عفریت بن کر قوموں پر مسلط ہوا جس نے وہاں کے مذاہب ہضم کر لیے اقداری اور روائتی ڈھانچے تبدیل کرا دیئے ہیں۔

اگر ہم نے دین اسلام کی مشعل کو خاص حصار (صوم وصلاۃ) سے باہر نہ نکالا تو کچھ بعید نہیں کہ ہمارے دیار میں بھی سیکولرازم کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور گہرے ہوتے چلے جائیں۔

اس وقت عالمی طور پر جس کلچر کو قبول کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور جو باطل عروج پا رہا ہے وہ سیکولرازم، لبرل ازم ہے اور صرف اسلام ہی واحد دین ہے جو سیکولرازم کے مقابلے میں کوئی نظام پیش کر سکتا ہے اور باطل کو شکست دے سکتا ہے اس کے علاوہ دنیا میں اور کوئی بھی تحریک، فکر، مذہب یا خیال اپنے اندر اتنی جامعیت نہیں رکھتا کہ سیکولرازم کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ باطل جس قدر بھی مضبوط ہو حق کے مقابلے میں ماند پڑھ جاتا ہے اللہ جلّ شانہٗ نے اِسی چیز کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

وقل جآء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقاo

لبرل ازم کی حقیقت

لبرل ازم اسے سیکولرازم کی ہی ایک شاخ سمجھ لیں، سیکولرازم کا ترجمہ عام طور پر لا دینیت، دہریت اور مادہ پرستی سے کر دیا جاتا ہے ان تراجم سے سیکولرازم کا تصور پیش کرنے والے تین بڑے فلسفی ہیں۔

ڈارون　　　　مارکس　　　　فرائڈ

یہ تینوں دہریے اور مادہ پرست تھے لہٰذا ان کے فلسفیانہ افکار بھی ان کے ایمانیات کے اہم آہنگ ہیں۔ جن میں دہریت ولا دینیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ جو بھی نظام زندگی پیش کرتے ہیں اس میں مذہب بالکل بے حیثیت ہوتا ہے۔ اس لیے مسلم معاشرے کے علاوہ باقی مذاہب رکھنے والے معاشروں نے بھی ان افکار کے اپنانے میں کچھ تامل کیا۔ وہ اس کو بے دینی، لا مذہبیت سمجھنے لگے۔ سیکولرازم کے زہریلے تیر نے اثر تو کیا مگر کچھ افراد ان کو براہی سمجھتے رہے کیونکہ مذہب کے ساتھ ان فلاسفر کو بغض تھا۔

لبرل ازم کے تصور کو پیش کرنے والے فلسفی خود عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ظاہراً لبرل تصور عدل ایسا تصور عدل نظر آتا ہے جو مذہب کا بھی جواز فراہم کرتا ہے اگر کوئی مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کو مکمل آزادی ہے کہ انفرادی زندگی میں اس کو نافذ کرے۔ اس پر عمل کرے لیکن اجتماعی، معاشرتی، سیاسی معاملات میں محض انسان بن کر سوچنا چاہیے مسلمان یا عیسائی یا یہودی بن کر نہیں بلکہ فقط ایک انسان بن کر سوچنا چاہیے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ صرف لبرل تصور عدل ہی ایک ایسا عادلانہ نظام فراہم کرتا ہے جو سب کے لیے عادلانہ ہوسکتا ہے لبرل ازم کے علاوہ جتنے بھی تصوراتِ عدل لوگوں نے بنا رکھے ہیں وہ تمام انسانوں کو عدل فراہم نہیں کر سکتے۔ اپنے دعوے کی دلیل یوں بیان کرتے ہیں اگر کوئی مسلمان ہے اس کا ایک تصور عدل ہے، اس کا جو بھی تصور عدل ہے وہ مسلمانوں کے حق میں تو عادلانہ ہوگا مگر عیسائیت کے لئے، بدھ مت اور ہندوؤں کے لئے ہرگز عادلانہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ مسلمان اپنے عادلانہ تصور کو ہی فوقیت دیں گے اور معاشرتی سطح پر بھی اپنے

تصورعدل کوہی باقیوں سے بہتر گردانیں گے۔

حقیقتاً ان کا تصور عدل تمام انسانیت کے لئے عادلانہ نہیں ہوسکتا بلکہ صرف مسلمانوں کے لیے عادلانہ ہوگا۔بالکل اِسی طرح اگرکوئی آدمی بائبل پرایمان رکھتا ہےتواس کا تصورِعدل صرف عیسائیوں کے لئے تو عادلانہ ہوگا مسلمانوں اورسکھوں اور دیگر قوموں کے لیے عادلانہ نہیں ہوگا۔عیسائی اپنے ہی تصورعدل کو باقیوں سے بڑھ کر سمجھیں گے،اور معاشرتی سطح پرعیسائی اپنے تصورعدل ہی کوقابل قدر سمجھیں گے۔یہی حال ہے تمام قوموں کا اور مذاہب کا ان کے تصورعدل صرف ان کے مفاد کی بات کرتے ہیں باقی لوگوں کے لئے عادلانہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کو ہم مکمل عادلانہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔جبکہ لبرل ازم وہ تصورعدل پیش کرتا ہے جوسب کوعدل فراہم کرے گا۔

آپ عدل کا کوئی بھی اصول اور پیمانہ نہیں بناسکتے جب تک کہ آپ جہالت کے پردے کے پیچھے نہ چلے جائیں ایسی جہالت کا پردہ جس میں صرف آپ سے دو چیزیں اوجھل ہوں گی ۔نمبرایک آپ کون ہو،نمبر دو،آپ کس چیز کواچھا یا برا سمجھتے تھے۔اس کے علاوہ آپ کو دنیا جہان کی تمام معلومات فراہم ہوسکتی ہیں کہ اس دنیا میں مسلمان کتنے ہیں، عیسائی کتنے ہیں، ہندوعورتیں کتنی ہیں غرض ہرطرح کی معلومات فراہم ہوسکتی ہیں مگر جہالت کےاس پردے کے پارآپ کوصرف دوچیزوں کاعلم نہیں۔

1)۔ آپ کون ہیں معاشرتی حیثیت آپ کی کیاتھی ،مسلمان تھے،کافر تھے،غریب تھے یاامیر تھے،مرد تھے یاعورت۔

2)۔ کس چیزکوآپ خیر سمجھتے تھےکس چیزکوشر گردانتے تھے،حلال کیا تھا حرام کیا تھا،صحیح کیا تھاغلط کیا تھا۔

ان دو چیزوں کو بھلا کر ایک کمرے میں داخل ہوں پھراس کمرے میں بیٹھ کر آپ عدل کا قانون وضع کر سکتے ہیں،اس کمرے میں بیٹھ کرآپ جوتصورعدل وضع کریں گے وہ عادلانہ ہوگا۔ایسی کوئی جگہ دنیا میں نہیں ہے جس میں داخل ہونے سے آدمی ان دو

چیزوں کو بھول جائے اور باقی سب کی اس کو خبر ہو بلکہ یہ ذہن کا ہی ایک خانہ ہے۔یعنی آپ کچھ دیر کے لیے ایسا سمجھ لیں کہ مجھے ان دو چیزوں کا علم نہیں ہے۔نمبر ایک، آپ کون ہو، نمبر دو، صحیح اور غلط کیا ہے پھر محض انسانی مفاد کو مدِ نظر رکھ کر صحیح اور غلط کے اصول وضع کریں تو یہ تصور عدل حقیقی عدل فراہم کر سکتا ہے۔تمام انسانوں کو لبرل ازم اسی تصور عدل کی طرف دعوت دیتا ہے کہ نہ مسلمان بن کر سوچو نہ عیسائی بن کر نہ مرد بن کر نہ عورت بن کر بلکہ محض ایک انسان بن کر سوچو۔

یہ ہے لبرل ازم کا تصور عدل، جس کے سامنے بہت ساروں نے گھٹنے ٹیک دیئے بلکہ اسی کو حق اور سچ سمجھ کر اپنے مذہبی نکتہ نظر سے اس کی توثیق پیش کرنا شروع کردی۔لبرل ازم سیکولر ازم سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا جو کہ بظاہر مذہب کو اپنے اندر ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔انفرادی معاملات میں فرد مذہب پر عمل کر کے مطمئن رہتا ہے جبکہ سیاسی اور معاشرتی طور پر لبرل ازم اپنا مکمل کام دکھاتا ہے۔ایک خاموش طوفان کی طرح یہ کام کرتا ہے لوگ مذہب سے دور ہو جاتے ہیں اگر کوئی مانتا بھی ہے تو مذہب چند عبادات و رسومات کا نام بن کر رہ جاتا ہے۔

دلیل کا رد:

اوّل نظر میں دیکھنے سے یہ دلیل نہایت مضبوط نظر آتی ہے کہ تصورِ عدل اور حقیقی انصاف صرف لبرل ازم ہی مہیا کر سکتا ہے۔لیکن اگر تھوڑا غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ جو الزام عدل کے حوالے سے مذہب پر لگایا جاتا ہے وہ وجہ تو خود لبرل تصورِ عدل میں بھی ہے وہ اس طرح کہ انسان کبھی بھی اپنے زمان و مکان سے اوپر اٹھ کر نہیں سوچ سکتا یعنی اپنے تاریخی تناظر میں ہی رہ کر سوچ سکتا ہے لہٰذا لبرل تصورِ عدل اس خاص تناظر والوں کیلئے تو عادلانہ ہوگا باقی لوگوں کے لئے غیر عادلانہ ہوگا بالفاظ دیگر خاص اس جہالت کے کمرے میں بیٹھنے والوں کے لئے ہی عادلانہ ہوگا باقی ساری دنیا والوں کیلئے غیر عادلانہ۔جیسا کہ عملی طور پر بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ لبرل تصورِ عدل سول سوسائٹی کے علاوہ سب کے لئے غیر عادلانہ ہے خواہ کوئی بھی مذہب ہو کوئی بھی روائتی کلچر ہو۔

<u>لبرل تصور عدل کا نتیجہ:</u>

لبرل تصور کو اپنانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز نہ صحیح ہے اور نہ غلط۔ شراب پینا، نماز پڑھنا، زنا کرنا، والدین کی خدمت کرنا، قرآن پڑھنا، پارک میں بیٹھ کر گھاس کے پتے گننا، سب کام برابر ہیں ان میں نہ کوئی خیر ہے اور نہ کوئی شر ہے۔ کیونکہ جب ہر فرد الگ الگ متعین کرے گا کہ صحیح کیا ہے غلط کیا ہے تو ہر ایک کے لئے صحیح وہ سمجھا جائے گا جسے وہ صحیح کہے اور اس کے لئے غلط اس کو سمجھا جائے جسے وہ غلط کہے۔ حقیقت کے اعتبار سے خیر و شر کا تصور ہی باطل ہو گا بلکہ یہ معاملہ ایک فرد پر منحصر ہو کر رہ جائے گا۔ جو چاہے، کرے جیسے چاہے ، جو مرضی سمجھ لے، مسجد جانے کو اچھا سمجھے یا گرجا گھر جانے کو یا پھر شراب خانے کو اچھا سمجھے۔

سول سوسائٹی

سول سوسائٹی کے بارے میں جاننے کے لیے ہم اس مضمون کو چند عنوانات پر تقسیم کرتے ہیں۔

1)۔ سول سوسائٹی کے قیام کا مقصد اور ابتداء۔
2)۔ سول سوسائٹی میں عظیم آدمی اور مذہبی معاشروں کا عظیم آدمی؟
3)۔ مذہب اور خاندان کے بغیر اس معاشرے کو کیسے چلایا جاتا ہے۔
4)۔ مختلف اداروں کے قیام کے ذریعے اس معاشرے کو تحفظ دیا جانا۔
5)۔ معاشرتی زندگی پر ایک نظر ۱۸ اصدی سے قبل اور ۱۸ اصدی کے بعد (سول سوسائٹی)۔
6)۔ سول معاشرت کی مشکلات پر ایک نظر۔
7)۔ سول معاشرت سے مذاہب کا انہدام۔

سول سوسائٹی کے قیام کا مقصد

عرصہ قدیم سے انسان اجتماعیت کی شکل میں زندگی گزارتا آیا ہے۔ ایک فرد مختلف اجتماعیّتوں میں سے کسی نہ کسی اجتماعیت کا حصہ ہوتا تھا وہ اس خطے کی اجتماعیتیں مذہبی نوعیت کی ہوں یا روایتی اور خاندانی نوعیت کی، ایک فرد عیسائی، یہودی، ہندومت، اسلام یا کسی اور مذہب کے ساتھ جڑ کر زندگی گزارتا تھا۔ ایک فرد پر کوئی مصیبت یا مشکل آتی تو اس کی اجتماعیت اس کا ساتھ دیتی، اسی طرح کی صورت حال تھی ان معاشروں کی جو مذہبی تو نہ تھے مگر پھر بھی کسی نہ کسی اجتماعیت کے ساتھ جڑے ہوتے خاندانی، برادری، قومیت یا حسب نسب کی بنیاد پر، ایک فرد جب کسی پریشانی ومصیبت کا شکار ہوتا تو خاندان، برادری، قوم کے لوگ اس کی مدد کرتے ۱۸ اصدی عیسوی تک معاشرے اسی قسم کے تھے۔

ایک انسان جب اپنے معاشرے میں رہتا ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا روایتی اس میں

کئی طرح کی پابندیاں ہوتی ہیں جو آدمی کی خواہشات کو پورا کرنے میں رکاوٹ کھڑی کرتی ہیں۔ مذہبی معاشرت میں کئی طرح کے مذہبی احکام و اخلاقیات ہوتے ہیں جب ان کے خلاف کہا جائے تو اہلِ مذہب اخلاقی طور پر فرد کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ خاص قسم کی معاشرت جو ان کے مذہب کے ہم آہنگ ہے اس کے دائرے سے باہر نہ نکلے۔

اسی طرح روایتی و خاندانی معاشرہ چند قسم کی حدود و قیود کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اس طرح کے معاشرے میں رہ کر بھی ایک فرد اپنے دل میں اٹھنے والی ہر امنگ و امید کو پورا نہیں کر سکتا۔ خاندان یا قوم، اپنی روایات کے خلاف کام کو برداشت نہیں کرتے، مثلاً ہندو معاشروں میں عورت کا خاوند فوت ہونے کے بعد دوسری شادی نہیں کر سکتی، اسی طرح کئی شریف خاندان عورت کے بے حجاب نکلنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔

اسی طرح لڑکے اور لڑکیوں کا اختلاط کرنا برا سمجھا جاتا ہے۔ والدین کے ادب کو لازم قرار دیا جاتا ہے، بے ادبی و نافرمانی کو برا سمجھا جاتا ہے۔ ان ساری باتوں سے معاشرہ روکتا ہے اگر کوئی کرے تو اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے بلکہ اس معاشرے کے افراد اس کو مجبور کرتے ہیں کہ اس حرکت سے باز رہو۔ الغرض کئی طرح کی پابندیاں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے آدمی کی مطلق العنان آزادی مجروح ہوتی ہے۔

آدمی کی آزادی کو فروغ دینے کے لیے مذہبی یا روایتی جکڑ بندیوں سے جان چھڑانے کے لیے سول معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ کہ اس معاشرت کا خاتمہ کر دیا جائے جو فرد کی آزادی میں حائل ہو اور ایک ایسی معاشرت قائم کی جائے جس میں فرد مطلق العنان آزاد ہو اور فرد اپنے کسی عمل کا جوابدہ معاشرے کے سامنے نہ ہو۔ ایک ایسی معاشرت وجود میں لائی جائے کہ فرد جو بھی کام کرے، کسی بھی عمل کو اختیار کرے، عمل کی وجہ سے اس کی معاشرتی حیثیت پر کوئی فرق نہ پڑے، سول سوسائٹی معاشرت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرد کی آزادی میں لامتناہی اضافہ دیا جا سکے معاشرتی رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔

سول سوسائٹی کی ابتداء

سول سوسائٹی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے ۱۸ اصدی عیسوی تک انسان اپنے آپ کو عبد تصور کرتا تھا کہ اس سے بڑی بھی کوئی ذات موجود ہے جس کے سامنے اس کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ہر مذہب میں اس کے اپنے اپنے تصورات تھے جن پر لوگ قائم تھے کوئی اعلیٰ ہستی اپنے دیوتاؤں کو قرار دیتا، کوئی خدا کو تو کوئی کرشن کو ہر حال میں انسان اپنے سے اعلیٰ کسی ہستی پر یقین رکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر انسان اپنے آپ کو عبد تصور کرتا تھا کہ کسی مالک کا غلام ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں فلسفہ یونان اور قدیم سائنسی نظریات کے رد ہونے کی بدولت عیسائیت بھی اپنا استحکام کھوگئی کیونکہ اس نے اپنے کئی نظریات وافکار فلسفہ یونان کے ہم آہنگ کیے ہوئے تھے اس نازک شاخ کے ٹوٹنے سے مذہب عیسائیت بھی لوگوں کی نظر میں بے اعتماد چیز بن گیا۔ عیسائی معاشرے صدیوں سے علم و دانش یونانی فلسفہ اور مذہب عیسائیت سے حاصل کررہے تھے لیکن ۱۷ اصدی میں یہ دونوں بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔

یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ فلسفہ جدید کو عیسائی معاشروں میں قدم جمانے کا موقع ملا یہ بات واضح رہے کہ فلسفہ جدید میں انسان کی حیثیت عبد نہیں ہے بلکہ انسان خود اس کائنات کا مرکز ہے یہ خود ایک اعلیٰ حقیقت ہے جس کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا اسی طرح علم و ہدایت بھی یہ اپنی ذات سے حاصل کرے گا، کسی غیر سے یعنی وحی سے علم اخذ نہیں کرے گا۔

فلسفہ جدید میں جس قسم کے انسان کا تصور پیش کیا گیا ہے یعنی جو آزادی کو اپنا اولین حق سمجھتا ہے وہ مذہبی معاشرے اور روایتی معاشرے میں نہیں رہ سکتا اس کی آزادی میں ایسی معاشرت رکاوٹ قائم کرتی ہے، لہٰذا فلسفہ جدید سے پیدا ہونے والا انسان آزادی کا خواہاں ہے۔ فرد روایتی و مذہبی معاشرت سے جان چھڑاتا ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد رہے ہیں جو خاندانی و مذہبی جکڑ بندیوں سے جان

چھڑانا چاہتے تھے لیکن ایک تو ان افراد کی تعداد بہت ہی کم تھی کہ وہ سب الگ ہوکر اپنی الگ اجتماعیت بنا لیں دوسرے مذہب اور روایت کا دائرہ بہت مضبوط تھا جب ایک فرد اپنی اجتماعیت کو چھوڑ کر چلا بھی جاتا تو کوئی دوسری اجتماعیت (خاندان، قوم) اس کو قبول نہ کرتی تھی۔اس لیے چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ایک فرد اپنی اجتماعیت کے ساتھ خواہ وہ مذہب کی شکل میں ہو یا روایت کی شکل میں ہو جڑا رہتا تھا کیونکہ اپنی قوم و مذہب یا خاندان کو ترک کرنے کے بعد کوئی دوسرا اس کو قبول نہ کرتا تھا۔

سول معاشرت جن علاقوں میں قائم ہوئی ان کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا، جب مذہب اور روایت کا دائرہ کمزور ہوا تو فلسفہ جدید کی وجہ سے فکری تبدیلی نے افراد کی اجتماعیت کو ایک نیا پلیٹ فارم مہیا کیا۔جس پلیٹ فارم پر آ کر ہر انسان مکمل آزادی کیساتھ کسی معاشرتی رکاوٹ کے بغیر من چاہی زندگی گزار سکتا تھا۔اس پلیٹ فارم کا وجود میں آنا تھا کہ مذہب اور روایت کی جکڑ بندیوں سے تنگ افراد کو یہ معاشرت آئیڈیل نظر آئی جس میں فرد مکمل آزاد ہے۔

اٹھارہویں صدی سے قبل لوگ اپنے دائرے سے باہر اس لیے نہیں جاتے تھے کہ دوسرا کوئی ان کو برداشت نہ کرے گا اس لیے اس کی پابندیوں کو قبول کیا جاتا۔

اٹھارہویں صدی کے بعد اپنے دائرے سے نکل بھی جائیں تو ایک ایسی جگہ موجود ہے سول سوسائٹی کی شکل میں جس جگہ آزادی کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

سول معاشرت:

اس معاشرت کی ابتداء تو اسی وقت ہوگئی تھی جب فلسفہ جدید کو قدم جمانے کا موقع ملا۔یہ اسی فکر کا عملی وجود ہے جس نے تین سو سال میں رفتہ رفتہ اپنے قدم مکمل طور پر مغربی ممالک میں جمائے ہیں اور اب ہمارے معاشرے بھی بڑی تیزی کے ساتھ وہی شکل اپنا رہے ہیں۔

فرد اجتماعیت کو اختیار کیوں کرتا ہے؟

انسان اجتماعیت ہی میں زندگی گزارتا ہے جب اٹھارہویں صدی سے قبل روایتی اور مذہبی اجتماعیت سے ماورئی کوئی تیسری اجتماعیت کا تصور ہی نہ تھا تو لوگوں کو لامحالہ

انہی اجتماعیّتوں میں ہی رہنا پڑتا۔اجتماعیت کو چھوڑ کر بالکل تنہا ہو جانا اور کسی اجتماعیت میں شرکت نہ کرنا فرد کو مزید کمزور کر دیتا ہے۔کیونکہ تنہا آدمی پر جب کبھی کوئی مشکل یا مشقت آتی تو اس کی اجتماعیت ہی اس کی مدد کے لیے اکٹھی ہوتی ہے۔

اس لیے اجتماعیت کا قیام فرد کی حفاظت وتحفظ کے لیے ضروری ہے جو مصیبت کے وقت مدد کے لیے آئے گی۔سول معاشرہ مذہب وخاندان سے تو خالی ہوتا ہے کہ قبیلہ مدد کے لیے کھڑا ہو جائے بلکہ اس قسم کی معاشرت میں تحفظ کے لیے انجمنیں قائم کی جاتی ہیں جو ایک فرد کے مادی مفاد کا ساتھ دیتی ہیں۔مثلاً اساتذہ کی انجمن، وکلاء کی انجمن، جج حضرات کی انجمن،طلباء کی انجمن،مزدوروں کی انجمن ڈاکٹروں کی انجمن وغیرہ۔

سول سوسائٹی میں مختلف قسم کی انجمنوں کو قائم کیا جاتا ہے تاکہ فرد کے مالی مفاد کو اگر نقصان پہنچے تو انجمن کے باقی افراد مل کر اس کا ساتھ دیں۔مثال کے طور پر کسی وکیل کے ساتھ کوئی زیادتی ہو تو تمام وکلاء برادری احتجاج کرے گی کہ وکلاء کے تحفظ کا اقدام کیا جائے۔اسی طرح اساتذہ کی انجمن اور ڈاکٹروں کی انجمن وغیرہ۔سول سوسائٹی میں اجتماعیت کی یہ شکلیں ہیں جو فرد کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔

انجمن نوعیت کی اجتماعیت اور مذہبی وروایتی اجتماعیت میں فرق؟

انجمن میں شامل افراد کا آپس میں تعلق مخاصمت کا ہوتا ہے آپس میں ایک دوسرے کے شدید مخالف ہوتے ہیں،غیر مہذب زبان میں یوں کہیں گے کہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے ہیں ہر ایک کو فکر ہوتی ہے کہ میں دوسرے سے آگے نکل جاؤں اس کو مات دے دوں،لیکن اگر اس انجمن کے کسی فرد کو کوئی معاشی مسئلہ پیش آجائے تو تمام اراکین انجمن بینرز اٹھا کر سڑکوں پر آجائیں گے اور احتجاج کریں گے کہ اس کے معاشی مسئلہ کو حل کیا جائے۔قصور جس کا بھی ہو انجمن والے اپنے فرد کو ہی سپورٹ کریں گے اس میں اخوت کا عنصر نہیں ہوتا بلکہ مفاد پیش نظر ہوتا ہے ہر فرد سوچتا ہے کہ کل کو میرے لیے بھی اس قسم کا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔کل کو مجھے اس طرح کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ہر آدمی اپنے اس مفاد کی خاطر اس کی مدد کو آجاتا ہے اور یہ بات

یاد رہے کہ اس طرح کی اجتماعیت محض معاشی اور پیشہ ورانہ رکاوٹوں کو حل کرنے میں ساتھ دیتی ہے، فرد اپنی انفرادی زندگی میں کیا ہے کیسے رہتا ہے، اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی، انفرادی زندگی میں شراب پیتا ہے یا شربت، ظلم کرتا ہے یا امانت و دیانت کا پیکر ہے، لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہے یا حق دبا لیتا ہے، اپنے گھر والوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے، والدین کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے، ان چیزوں کی طرف اس قسم کی اجتماعیت (انجمن) التفات نہیں کرتی بلکہ اس کو فرد کا ذاتی معاملہ کہا جاتا ہے فرد کو اخلاق کی درستگی پر یہ اجتماعیت مجبور نہیں کرتی۔

روایتی یا مذہبی اجتماعیت:

یہ اجتماعیت بھی تنہا فرد کو بوقت مصیبت و ضرورت امداد کرتی ہے جب ایک فرد پر کوئی مشکل وقت آ جاتا ہے تو خاندان والے یا اہل مذہب مل کر اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس طرح کی اجتماعیت فرد کی مدد غرض کی بنیاد پر نہیں بلکہ اخوت کی بنیاد پر کیا کرتی ہے الغرض وجہ جو بھی ہو ان دونوں اجتماعیّتوں یعنی سول و روایتی میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ سول اجتماعیت محض مالی مفاد کے تحفظ کی بات کرتی ہے، حقوق کی فراہمی کی بات کرتی ہے فرد کی انفرادی اصلاح اور فرد کی انفرادی طرزِ زندگی کی کوئی پراوہ نہیں کی جاتی۔

جبکہ مذہبی اور روایتی اجتماعیت محض مالی مفاد کے لیے ہی بندے کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اس کے علاوہ نجی امور میں بھی بندے کے اخلاقیات پر نظر ہوتی ہے جب اس میں کوتاہی دیکھی جاتی ہے تو پورا مذہبی یا روایتی معاشرہ اس اخلاقی کمی کو پورا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس قسم کی اجتماعیت صرف مالی مفاد کا ہی تحفظ نہیں کرتی بلکہ فرد کو اخلاقیات کے دائرے میں بھی رہنے پر مجبور کرتی ہے جس کی بدولت فرد ایک اچھا شہری بن کر زندگی گزارتا ہے۔

سول معاشرے کو چلانے والے کلیدی افراد:

سول سوسائٹی ڈیزائن ہی تنہا فرد کے لیے کی گئی ہے کہ وہ من چاہی زندگی گزار سکے کوئی بھی اس کی آزادی میں معاشرتی رکاوٹ نہ پیدا کر سکے۔ ایک ایسا انسان جس کا نہ مذہب سے لگاؤ ہے نہ خاندان کا نام روشن کرنے سے کوئی غرض ہے نہ وہ ان چیزوں کو اہم

تصور کرتا ہے تو ایسے انسان کی زندگی تو بے معنی سی ہو کر رہ جائے گی، اب ایسا فرد محنت کرے تو کیوں کرے؟، کس کے لیے کرے؟

تین طرح کے افراد ان سول لائیز لوگوں کی زندگی میں معنویت پیدا کرتے ہیں۔

سول معاشرے میں تین قسم کے افراد کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

1)۔آرٹسٹ 2)۔مینیجر 3)۔تھراپسٹ

آرٹسٹ:

خواب دکھاتا ہے یہ عام ہے کہ آرٹسٹ شاعری یا ناول نگاری کی شکل میں فلم یا ڈرامہ بنا کر یا پینٹنگ کر کے لوگوں کو خواب دکھاتا ہے، خواب کو تسلسل سے دکھایا جانا دل میں ایک خواہش کو جنم دیتا ہے۔ آرٹسٹ حضرات کے اپنے فن کے اظہار کے لیے مستقل ادارے قائم کیے جاتے ہیں تا کہ وہ روزانہ نت نئے خواب عوام کو دکھائیں، پر لطف اور لذت سے ہم کنار ہونے کے انداز بتلائیں، ان خوابوں کی منظر کشی کریں جن کی وجہ سے نت نئی خواہشات جنم لیتی ہیں، جب آدمی اپنی خواہش کو پورا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے وہ قربانی دینے کو بھی تیار ہو جاتا ہے یہ دکھائے جانے والے خواب اس کی زندگی میں معنویت پیدا کرتے ہیں اور اس کو ایک مقصد پر کھڑا کرتے ہیں اس کے بعد مینیجر رول ادا کرتا ہے۔

مینیجر:

ان نہ ختم ہونے والی خواہشات کو کس طرح پورا کیا جائے ان کے حصول میں کامیابی کیسے ممکن ہے یہ بات بتائے گا مینیجر کہ تم اپنی خواہش کو سرمائے کے حصول کے بغیر پورا نہیں کر سکتے، اس لیے اگر تم خواہش پورا کرنا چاہو تو اول سرمایہ حاصل کرو۔ سرمائے کے حصول کا طریقہ کیا ہے منیجر بتاتا ہے۔ منیجر زیادہ سے زیادہ کام لیتا ہے اور فرد بھی اس مشقت کو فراخ دلی سے قبول کر لیتا ہے کیونکہ آرٹسٹ مستقل اور مسلسل خوابوں اور خواہشات کا جال اس کے ذہن میں بُنتے رہتے ہیں اس کی خواہشات بڑھائی جاتی ہیں اور فرد محنت پر راضی ہو جاتا ہے تا کہ میرے خواب پورے ہو جائیں اور اپنی ہمت و طاقت سے بڑھ کر کام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے فرد

ایک خواہش کو پورا کرتا ہے تو کئی اور خواہشات دل میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے،

زیادہ خواہشات	زیادہ ناکامیاں	زیادہ پریشانیاں
کم خواہشات	کم ناکامیاں	اور کم پریشانیاں

سول سوسائٹی میں آرٹسٹ کے بغیر زندگی میں معنویت ختم ہو جائے اور جب آرٹسٹ اپنے فن کا اظہار کرتے ہیں اور اداروں کی مدد سے خواب دکھاتے ہیں جو خواہشات کی شکل اپنا لیتے ہیں یہ کام مسلسل ہوتا رہتا ہے اس کے نتیجے میں یہ خواہشات کا بندہ جو شب و روز ان کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتا ہے جب کئی ساری خواہشات اس کی نہ پوری ہوتی دکھائی دیں تو اپنی ناکامیوں کا صدمہ اس سے برداشت نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں ذہنی خلل کا شکار ہو جاتا ہے بسا اوقات نوبت خودکشی تک آن پہنچتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں ذہنی امراض بہت زیادہ ہیں، سائیکی پرابلم (psychy problemes) بہت زیادہ ہے۔

تھراپسٹ:

سول سوسائٹی میں تیسرا اہم رول تھراپسٹ ادا کرتے ہیں جب ایک فرد اپنی خواہشات کی تکمیل میں ناکامیوں کا سامنا کرتا ہے اور کئی ناکامیوں کا احساس فرد کو بسا اوقات نفسیاتی مریض بنا دیتا ہے، تھراپسٹ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کو ان ناکامیوں کو برداشت کرنے کا متحمل بنائے اور اس کو ایسی تکنیک بتائے جس سے اس کا ذہنی دباؤ کم ہو اور پھر سے بھرپور انداز سے کام میں لگ جائے نئی امنگوں کے ساتھ خاندانی وروایتی معاشروں میں بھی ناکامیاں ہوتی ہیں، مگر ان ناکامیوں کی بدولت ذہنی دباؤ اس قدر نہیں بڑھتا کہ آدمی نفسیاتی مریض بن جائے اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ روایتی اور خاندانی معاشروں میں اس کو دلاسہ دینے والی ماں ہے، رشتے دار سارے اس کی خبر لینے والے ہیں دلاسہ دینے والے ہیں۔

جبکہ سول سوسائٹی میں ان عزیز و اقارب کی قدر اسطرح نہیں ہوتی اور نہ ہی آپس کے روابط ایسے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ زندگی کی مشکلات شیئر کرنے کو ضروری خیال

کیا جاتا ہے۔ بہر حال ترقی یافتہ ممالک میں ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لیے تھراپسٹ سے ہی رجوع کیا جاتا ہے وہ بندے کو دوبارہ کام کرنے کے قابل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرہ انھی تین افراد سے چلتا ہے، آرٹسٹ خواب دکھاتا ہے، مینیجر پورا کرنے کا طریقہ بتاتا ہے، تھراپسٹ ناکامیوں کے صدمے کو کم کر کے دوبارہ کام پر کھڑا کرتا ہے جس سے مستقل اور مسلسل سرمایہ داری (آزادی) کے عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔

معاشرتی زندگی پر ایک نظر ۱۸ صدی سے قبل اور ۱۸ صدی کے بعد (سول سوسائٹی):

قدیم انسان اٹھارہویں صدی سے پہلے	جدید انسان اٹھارہویں صدی کے بعد
ہر تہذیب کا انسان کسی نہ کسی بالاتر و برتر اعلیٰ ہستی کی پرستش کرتا تھا۔	اب انسان خود اپنی پرستش کرنے لگا۔
علم خارجی ذریعے، روایت، وحی سے یا آسمان سے آتا تھا	علم خود انسان کی عقل سے میسر آنے لگا۔
انسان علم کے لیے خارج کا محتاج تھا یعنی وحی وغیرہ۔	انسان علم کے لیے کسی خارج کا نہیں صرف داخل کا یعنی عقلیت کا محتاج ہے۔
کائنات کا مرکز خدا۔	کائنات کا مرکز نفس انسان ٹھہرا۔
اصل علم حقیقۃ الحقائق کا علم تھا۔	اصل علم سرمائے میں اضافے کا علم قرار پایا۔

مابعد الطبعیات پہلے تھی علمیت مابعدالطبعیات سے نکلتی تھی۔	علمیت پہلے آ گئی کہ ہمارے ذرائع علم کیا ہیں اور ہم ان سے کیا جان سکتے ہیں کیا نہیں جان سکتے اس علمیت سے مابعد الطبعیات نکالی گئیں لہٰذا مابعدالطبعیات کا علم علمیت کے دائرے سے باہر ہو گیا اور جہالت شمار کیا گیا۔
انسان روشنی و رہنمائی کے لیے خارج، آسمان، وحی، نبی اور بڑے آدمی کی طرف دیکھتا تھا کیونکہ ہر آدمی علم میں خودکفیل نہ تھا۔	انسان اپنی رہنمائی کے لیے صرف اپنی طرف دیکھنے کا پابند ہوا۔ تمام خارجی ذرائع علم لایعنی ٹھہرے انسان اپنے باطن کے ذریعے ذاتی علم میں خودکفیل ہو گیا۔ ریاست کا علم فلاسفہ سے لینے لگا۔
مابعد الطبعیات کا علم اہم ترین تھا۔	اب طبعیات کا علم اہم ترین ہو گیا۔ لہٰذا Metqpysics of presence وجود میں آئی۔
دنیا غیراہم آخرت سب سے اہم تھی۔ دنیا کو انسان آخرت کی کھڑکی سے دیکھتا تھا۔	صرف دنیا اہم تر ہو گئی آخرت خارج ہو گئی خدا ختم کر دیا گیا مذاہب کو بے عقلی کی باتیں قرار دیا گیا۔
علم اور زندگی کا مقصد آخرت میں کامیابی تھا۔	علم اور زندگی کا مقصد صرف دنیا میں کامیابی رہ گیا۔

انسان علوم نقلیہ کو اہم علوم عقلیہ کو غیر اہم سمجھتا تھا یعنی مال کمانے کے علم کو علوم کی تلچھٹ سمجھتا تھا۔ مال جمع کرنا زیادہ تمتع فی الارض کرنا غیر اخلاقی کام تھے۔ ہر تہذیب کے بڑے لوگ انبیاء فلاسفہ، علماء سادہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔فقر پر فخر کرتے تھے۔	صرف علوم عقلیہ اہم قرار پائے۔سب سے اہم علم وہ ہے جس سے سب سے زیادہ مال کمایا جا سکے۔مذہب علوم نقلیہ علوم کی تلچھٹ شمار کیے گئے۔ اعلیٰ معیاری عالی شان زندگی گزارنا اصل مقصد ہو گیا۔
علم کی بنیاد یقین تھی۔	علم کی بنیاد ڈیکارٹ کے بعد شک پر رکھی گئی۔ایسا طریقۂ علم جو شک سے یقین تک پہنچائے۔ لہٰذا ڈیکارٹ کے بعد تمام فلسفی ریب و شک میں ہی گرفتار رہے۔
مابعد الطبعیات پانچ بنیادی سوالات سے بحث کرتی تھی۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جاؤں گا، مجھے کس نے پیدا کیا، میرا انجام کیا ہے؟	مابعد الطبعیاتی سوالات کی جگہ حاضر و موجود دنیا کی مابعد الطبعیات Metaphysic of Presence آ گئی۔

حفظ مراتب کی تہذیب تھی۔ مراتب موجود و متعین تھے۔ مغربی مساوات نہ تھی۔	فرد آزاد ہو گیا۔ سب افراد مساوی ہو گئے۔ کسی کے لیے تکریم باقی نہ رہی۔
معیار زندگی میں اضافہ قابلِ قدر نہیں تھا۔	معیار زندگی میں اضافہ ہی اصل قابل قدر کام قرار پایا۔
نفس انسانی روحانی soul تھا۔	نفس انسان میں soul کی جگہ اسپرٹ، مائنڈ، شعور، ذہن، سائیکی نے لے لی۔
علمی تناظر بتاتا تھا کہ حقیقت کا ڈھانچہ موجود ہے۔ ہمارا ذہن اگر اسے اسی طرح پہچان لے جیسا کہ حقیقت ہے تو ہم حقیقت کو پہچان لیں گے۔ حقیقت موجود ہے۔ انسان خالق حقیقت نہیں نہ ہی حقیقت خلق ہو سکتی ہے۔	کانٹ نے بتایا کہ حقیقت کا کوئی ڈھانچہ کائنات میں موجود نہیں اصل حقیقت تو میرا ذہن ہے جو حقیقت کو ڈھانچے مہیا کرتا ہے۔ انسان حقیقت کا حامل ہی نہیں بلکہ حقیقت کا خالق بھی ہے۔ میں جو خلق کرتا ہوں وہی حقیقت ہے۔ میں دنیا کو ویسا بنا دوں گا جیسا بنانا چاہوں گا۔
لوگ خدا کی پرستش اور آخرت کی جستجو کرتے تھے۔	لوگ اپنی پرستش اور سرمایہ اور دنیا کی جستجو کرنے لگے۔
انسان تسخیر قلوب کرتا تھا۔	انسان تسخیرِ کائنات میں مصروف ہو گیا۔

خیر و شر کے پیمانے متعین تھے۔ آزاد نہیں تھا وہ پیمانے اپنے اپنے مذہب یا روایت سے اخذ کیے ہوئے ہوتے تھے۔	خیر و شر ذہن انسانی عقلیت سے دریافت کر سکتا ہے۔ ہر زمانے کے خیر و شر مختلف ہو سکتے ہیں۔ خیر اور شر ناپنے کا کوئی خاص پیمانہ متعین نہیں ہے۔ نفس انسانی جسے چاہے پیمانہ قرار دے، انسان آزاد قرار پایا۔
گناہگار لوگ نیک لوگوں سے رجوع کرتے تھے اور اعترافِ گناہ کرتے تھے۔ عبادت گاہ مثلاً کلیسا وغیرہ جاتے تھے وہاں عالم موجود ہوتا تھا۔	خلش میں مبتلا لوگ کلیسا کے بجائے نفسیاتی ماہرین اور ان کے کلینک سے رجوع کرنے لگے۔ دین کے عالم کی جگہ یہاں سائیکوتھراپسٹ آ گیا۔
آزادی معیار و منہاج اور قدر و اصول نہیں صرف صلاحیت تھی۔	آزادی معیار منہاج، قدر، اصول، عقیدہ و ایمان بن گیا۔
انسان اقدار، روایات ،اساطیر، الہامِ اور مذہبی اتھارٹی کا پابند تھا۔	انسان پبلک لائف میں صرف رائے عامہ General will کا تابع ہو گیا اور ذاتی زندگی کے دائرے میں مطلق آزاد وخود مختار ہو گیا۔

بندگی قدر تھی لوگ عبد تھے کسی کے سامنے جواب دہ تھے۔ خدا ،بھگوان یا دیوتا وغیرہ۔	آزادی قدر ہوگئی اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں رہے۔
علوم نقلیہ کو عروج ملا عالم وہ کہلاتا تھا جو حقیقۃ الحقائق اور مابعد الطبعیات کا عالم ہو۔ اس لیے بادشاہ اس وقت اپنے اپنے مذاہب کے عالموں کو اپنے قریب رکھتے تھے۔	علوم عقلیہ کا رواج ہوگیا پڑھا لکھا آدمی وہ کہلایا جو زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکے۔ سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز، بینکر اور فلم کی صنعت کے لوگ کماتے ہیں۔
لوگ خدا کی معرفت، قربت، خوشنودی کو سب سے اہم کام سمجھتے تھے۔	لوگ دولت سرمایہ کے حصول اور خواہش نفس کی تکمیل کو سب سے اہم کام سمجھنے لگے۔
لوگ کسی خاص خیر کسی خاص حق اور نجات کے لیے جیتے تھے۔	لوگ اب صرف خود کے لیے جیتے ہیں۔
لوگ ایثار قربانی، خدمت، محبت میں لذت محسوس کرتے تھے۔	لوگ ان اقدار کو احمقانہ سمجھنے لگے۔

فرد خاندان، قبیلے، گروہ میں رہ کر اجتماعیت کے ذریعے اپنا اظہار کرتا تھا۔ اس کی شناخت وہ خود نہیں تھا بلکہ خاندان یا مذہب ہوتا۔	ہر فرد آزاد ہوگیا ہے انفرادیت پرستی نے سب کو جدا جدا کر دیا اب لوگوں کی شناخت پیشے سے ہوتی ہے۔ انجینئر، ڈاکٹر، سائنسدان پروفیسر، ٹیچر وغیرہ اسی لیے لوگ وزیٹنگ کارڈ مانگتے ہیں۔
عالم اسے کہا جاتا تھا جس کی صحبت میں بیٹھ کر خدا یاد آئے۔ دنیا، دنیا کی لذتیں، نعمتیں حقیر نظر آنے لگیں اور خدا کی محبت تمام محبتوں پر غالب آ جائے۔	عالم اسے کہا جاتا ہے جو دنیا کا علم سکھا سکے۔ جس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمایا جا سکے۔ اس کے سوا تمام علوم جن سے پیسہ نہ ملے وہ جہالت قرار پائے۔

سول سوسائٹی کی مشکلات اور اداروں کا قیام:

مذہبی اور خاندانی معاشروں میں بہت سے اجتماعی کام باہمی ہمدردی کی بنا پر ادا کیے جاتے تھے، آدمی بہت سارے امور کو مذہب کی بنیاد پر سرانجام دینے کے لیے راضی ہو جاتا تھا کہ خدا راضی ہوگا یا پھر خاندان والے اس کو اچھا سمجھیں گے، اس بنا پر اجتماعی کام ان معاشروں میں انجام پاتے، مگر سول سوسائٹی میں تعلقات صرف اغراض کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں کوئی مذہبی یا خاندانی بندش نہیں ہوتی۔ مذہب اور خاندان کے غیر اہم ہونے کی وجہ سے معاشرے کے اجتماعی امور متاثر ہوتے ہیں جو ذمہ داریاں اجتماعی طور پر ایک خاندان پر لازم ہوتی ہیں سول سوسائٹی کے لوگ ادا نہیں کرتے اور وہ طبقہ جو خاندان کے رحم وکرم پر ہوتا ہے ان کے حقوق پامال ہوتے ہیں، پہلے جو ذمہ داریاں روایتی معاشروں میں خاندان ادا کرتا تھا اب وہ ذمہ داریاں ادا کرنے والا کوئی نہیں تو بہت سے خلاء پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان خلاؤں کو پر کرنے کے لیے اور مذہب و خاندان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کئی

ادارے قائم کیے جاتے ہیں۔

سول سوسائٹی کے قیام کے لیے دو طرح کے ادارے قائم ہوتے ہیں۔

1)۔ جو سول معاشرت کے فروغ میں مدد دیتے ہیں۔

2)۔ سول معاشرت میں اخلاقیات کے فقدان کی وجہ سے جو خلاء پیدا ہوتا ہے اس کو پُر کرنے والے ادارے

سول سوسائٹی میں مجموعی طور پر مندرجہ ذیل ادارے کام کرتے ہیں۔

☆۔فروغ کے لیے ادارے	☆۔سول سوسائٹی کے استحکام اور اخلاقیات کے خلاء کو پُر کرنے کے لیے ادارے
میڈیا	اولڈ ہاؤس
خاص طرز کا نصاب تعلیم	دارالامان
پارلیمنٹ	یتیم خانے
	خودکشی سینٹر
	جمہوریت / پارلیمنٹ
	ہوٹل / گیسٹ ہاؤس
	شادی ہال
	دفنانے اور کفانے کے سینٹر

میڈیا کے ذریعے ہی آج کل عام طور پر نئے نئے خواب دکھائے جاتے ہیں خواہشات جنم لیتی ہیں، تسلسل کے ساتھ جب ایک ہی طرح کے خواب دکھائے جاتے ہیں تو یہ خواب خواہش کا روپ دھار لیتے ہیں، خواہشات کی تکمیل کو انسان اپنا مقصد زندگی بنا لیتا ہے۔ میری اس خواہش کی تکمیل میں کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ اپنے نفس کی خواہش کی تکمیل کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں انسان اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا حریص ہو نفس کی خواہشات کو پورا کرنا اس کا ولین مقصد زندگی ہو ایسے

معاشرے میں یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ کون رکھے گا، دوسرا سوال یہ کہ کیوں رکھے گا؟ لہٰذا یتیم خانہ تعمیر کروایا جائے جس میں یتیموں کی پرورش ہوگی۔

اسی سے ایک دوسری مشکل بھی حل ہوجائے گی کہ معاشرے میں عریانی کی وجہ سے زنا کی شرح فیصد میں بھی اضافہ دراضافہ ہوتا ہے۔لڑکیاں عموماً اس خوف سے کہ بچے کا کیا کیا جائے گا زنا سے گھبراتی تھیں کیونکہ معاشرہ اس بچے کو قبول نہ کرے گا اور اس کی پرورش کیسے ہو گی، بہت ساری وجوہ کی بدولت زنا بالرضاء میں بھی کئی طرح کی رکاوٹیں تھیں۔اس خواہش کی تکمیل میں یہ سب رکاوٹیں تھیں۔یتیم خانے کے ادارے نے ان تمام مشکلات کو آسان کر دیا اور ہر بچے کو مکمل حقوق ادا کیے جاتے ہیں چاہے وہ شادی سے پہلے ہو یا شادی کے بعد اور حقوق انسانی کے عالمی منشور میں یہ بات واضح لکھی گئی ہے کہ تمام زچہ بچہ کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا اگرچہ شادی پہلے ہو یا بعد میں تمام اقوامِ متحدہ کے ممالک اس کی پاس داری کریں گے۔

دارالامان:

جو بچیاں اپنے گھروں میں محفوظ نہیں ہیں ان کے باپ یا بھائی ان سے بدسلوکی کرتے ہیں وہ عزت کا تحفظ کیسے کریں۔سول سوسائٹی اس کا حل یہ پیش کرتی ہے کہ دارالامان کے نام سے ادارے قائم کیے جائیں ایسے کچھ ادارے بنائے جائیں جہاں پر لڑکیاں پناہ لے سکیں۔

یہ بات واضح رہے کہ ہماری گفتگو کا عنوان یہ نہیں ہے کہ ایسے ادارے ہونے چاہییں یا نہیں بلکہ یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کس قسم کی معاشرت ہے جس میں ان اداروں کی ضرورت پیش آئی۔اگر ایک لڑکی کا بھائی ایسا تھا تو اس کے ماں باپ، نانا، دادا، چچے، ماموں، لوگ کیا کررہے تھے وہ اس کو روک نہ سکے اس کی ایسی تربیت کی گئی، اگر باپ ایسا تھا تو خاندان کے باقی لوگوں نے اس بارے میں کیوں نہ کردار ادا کیا۔

یاد رکھیں! جس معاشرے میں باپ یا بھائی کی طبیعت ایسی ہو تو اس طرح کے معاشرے کے عام فرد سے جو دارالامان کا نگران ہے اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے، اخلاقی پستی

اور اقدار کی پامالی کا حل قانون یا ادارے نہیں ہو سکتے بلکہ اخلاقیات کی بلندی سے ہی کام بنے گا۔

اولڈ ہاؤس:

خاندانی و مذہبی معاشروں میں بزرگوں کو اپنے گھر کی رونق سمجھا جاتا تھا مگر سول سوسائٹی میں ان کی قدر ٹوٹے ہوئے میز یا ٹوٹی ہوئی کرسی سے بڑھ کر کچھ نہیں، کیونکہ جب میز یا کرسی نفع دے رہے ہوتے ہیں تو ان کیلئے گھر میں جگہ ہوتی ہے جب وہ نفع دینا چھوڑ دیں تو ان کو گھر کے صحن میں نہیں رکھا جاتا بلکہ سٹور کی نظر کر دیا جاتا ہے وہاں پڑے رہیں، ایک مفاد پرست اور خاندان و مذہب کی ملامت سے آزاد فرد باپ کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ یہ ہمارے گھر میں برکتوں کا باعث ہے وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے کوئی فائدہ تو پہنچتا نہیں اوپر سے سارا دن ان کی روک ٹوک۔ کوئی آئے تو پوچھتے ہیں کہاں سے آئے کوئی جائے تو پوچھتے ہیں کہاں جا رہے ہو زیادہ دیر سے لڑکی گھر پہنچنے پر تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ اس گھر میں سب کا جینا مشکل کر رکھا ہے، وہی پرانی سوچ لیے بیٹھے ہیں اب زمانہ بدل گیا ہے بچوں سے یوں پوچھ گچھ نہیں کی جاتی، ان کا اپنا لائف سٹائل ہے ان کو آزادی دینی چاہیے وغیرہ، پھر ایسے بوڑھے شخص کا کیا کیا جائے۔ ہے تو میرا باپ نا۔ میں اس کے اخراجات تو برداشت کر سکتا ہوں مگر اس کی روک ٹوک سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں، سول سوسائٹی اس کا حل بتاتی ہے کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں بوڑھے والدین کو جمع کروا دیا جائے ان کی صحت کا خوب خیال رکھا جائے گا اور تم روک ٹوک سے بھی چھٹکارا حاصل کر لو گے۔

ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں کہ معاشرہ سفر کرنے والوں کو نہ کھانا دے گا اور نہ ہی رہائش کے لیے ٹھکانہ جیسا کہ قدیم معاشروں میں ہوا کرتا تھا۔ الغرض جب بھی کوئی معاشرتی خرابی سامنے آتی ہے اس کا حل اخلاقی اقدار کی بلندی پیدا کرنے کی بجائے یہ کیا جاتا ہے کہ اس کے لیے ادارہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی قدیم روایتی اور اخلاقی معاشروں میں مردوں کو دفنانے کا کام خود محلے والے علاقے میں بسنے والے سرانجام دیتے تھے مگر یہ کس قسم کا معاشرہ ہے کہ جس میں مردے دفنانے کا بھی وقت نہیں ہے نہ مردے کو غسل دینے کی فرصت ہے۔ اس کے لیے بھی سینٹرز قائم ہیں بلکہ پاکستان جیسے ملک میں جس کے قیام کا مقصد ہی اسلامی معاشرت

کا احیاء تھا اس میں بھی ایسے ہی سینٹر قائم کرنا پڑے جن میں مردوں کو غسل دیا جائے اور دفنانے کی ڈیوٹی سر انجام دی جائے۔ اسی طرح قبر کھودنے کے لیے بھی خاصی رقم دینی پڑتی ہے، پڑوسی اور رشتہ دار محلے والے اس کا مکمل خاندان اپنی اس ذمہ داری میں کردار ادا کیوں نہیں کرتے؟ ان سارے سوالوں اور الجھنوں کا جواب ایک ہی ہے کہ ہم اس معاشرت کا احیاء کریں جس میں اخوت اور ہمدردی کی بنیاد پر یہ سارے کام کئے جاتے تھے جس معاشرت کو فرسودہ، قدیم اور غیر مہذب افراد کا مجموعہ بتایا جاتا ہے۔ سول سوسائٹی میں اس طرح کے ادارے جُز ولازم ہیں، جب سول سوسائٹی کے خواب دیکھیں تو یہ بات ضرور مدنظر رکھیں ایسے معاشرے میں تو اپنے آپ کو دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا، چہ جائے کہ والد کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے وقت نکالا جائے، خاندان کے کسی دوسرے فرد کی تجہیز و تکفین تو بہت دور کی بات ہے مردوں کو کفنانے اور دفنانے کا کام بھی ادارہ کرے گا جو اپنے اس کام کے بدلے آپ سے معاوضہ وصول کرے گا۔

خلاصہ کلام:

سول سوسائٹی میں آپس کا تعلق ایک غرض کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے آپ کو غرض ہے کہ مردے کی تکفین کروانی ہے ادارے کو غرض ہے کہ سرمایہ ملے گا۔ اسی طرح شادی ہال کا معاملہ لے لیجئے آپ کی غرض شادی کے انتظامات کروانا ہے جبکہ شادی ہال والوں کی غرض پیسہ لینا ہے۔ انھی اداروں میں ایک اہم ادارہ پارلیمنٹ ہے جس کی حقیقت ان اداروں کے قیام میں سول معاشرہ کا احیاء ہے اور سول سوسائٹی کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش ہے۔ اگر معاشرہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کو پہچانتا تو ان اداروں کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مذہبی معاشروں میں ایسے ادارے نہیں ہوتے ان جیسے اداروں کا وجود اور پیش رفتگی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور ہمارا کلچر، معاشرہ، روایات کس طرف سفر کر رہی ہیں اس سفر کے نتیجے میں ہم اپنا خاندانی سسٹم بھی کھو دیں گے اور مذہبی لگاؤ بھی ختم ہو جائے گا۔ معاشرہ جوں جوں سول سوسائٹی کی شکل اپنائے گا دین کا احیاء اسی قدر مشکل بلکہ ناممکن بن جائے گا۔

مقصد کلام:

اس بحث کی روشنی میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ادارے ایک خاص قسم کی ذہنیت کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں اس طرح کی ذہنیت اسلام میں قطعاً برداشت نہیں ہے۔ان اداروں کے وجود کو اسلامی تعلیمات سے ثابت کرنا سنگین غلطی ہے یہ تو پودے کفر کے لگائے ہوئے ہیں اسلامی معاشرت میں ان کی ضرورت نہیں ہوتی مجھے قلم اٹھانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ عصر حاضر میں، مغرب اور اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی شدید جدو جہد ہو رہی ہے اس جدو جہد کے نتیجے میں مغرب سے آنے والے ہر نعرے کو اسلامی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اہلِ مغرب کے دیئے ہوئے سسٹم اور اداروں کو بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جو کہ عصرِ حاضر کی سنگین غلطی ہے طلباء اور علماء اُمت سے نہایت ادب سے گزارش ہے کہ جدید سسٹم اور اداروں کی حقیقت جانے بغیر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کی جائے، اسلام کی تعلیمات سے نظام کفر کے جواز پر دلیل قائم کرنے سے پہلے اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ ان سول اداروں کے قیام سے دفاع کس قسم کی معاشرت کو ملتا ہے اور کس معاشرت میں ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سول معاشرے کی قانون سازی:

عالم کفر ان اداروں کے وجود کے لیے علمی اور فکری بنیادیں رکھتا ہے انھوں نے خاص نظریہ حیات کے پیش نظر ان اداروں کو قائم کیا ہے ان اداروں کے قیام کے خاص مقاصد ہوتے ہیں۔جبکہ عالم اسلام نے ان اداروں کو کسی علمی مباحثے یا فکری کاوش کے نتیجے میں قائم نہیں کیا بلکہ بعض ادارے تو امت مسلمہ پر .Post colen society یعنی انگریزی استعمار کے تسلط کی وجہ سے مسلط کر دیئے گئے مثلاً پارلیمنٹ وغیرہ۔اور بعض اداروں کو دیکھا دیکھی قائم کر لیا گیا، کوئی علمی اور فکری بنیاد ادارہ قائم کرنے سے قبل موجود نہ تھی، جب ادارے قائم ہو چکے تو پھر اہلِ اسلام نے ان اداروں کو فکری و علمی جواز مہیا کرنے کی کوشش

شروع کی ہے ان اداروں کا علمی اور فکری جواز اسلام سے پیش کرنا کس حد تک صحیح ہے اور کس حد تک غلط یہ تو مستند علماء کی شوریٰ ہی طے کر سکتی ہے، بندہ ناچیز موجودہ صورت حال کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہے کہ ادارہ قائم کرنے والے نے ادارہ قائم کیوں کیا مثلاً پارلیمنٹ کا نظام پیش کرنے والوں نے نظام کیوں پیش کیا اور سمجھنے والوں نے کیا سمجھا اور مدا حین کی صف میں شامل ہو گئے۔

پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنے وزیروں سے کہا کہ تم میرے پاس سب سے عقل مند انسان لے کر آؤ میں اس سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں اگر وہ جواب دے دے تو میں بہت انعام واکرام سے نوازوں گا۔سینکڑوں لوگ دربارِ شاہی میں آئے اور ناکام واپس چلے گئے ایک دن ایک چرواہے کو بھی انعام کی سوجھی وہ بھی دربار شاہی میں آیا اور عرض کی جناب عالی! ناچیز سے پوچھیں جو پوچھنا چاہتے ہیں، تو بادشاہ نے اپنے ہاتھ کی ایک انگلی سے اشارہ کیا۔سارا مجمع پریشان ہے کہ آخر سوال کیا ہے تو چرواہے نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ کیا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کو اپنے ساتھ تخت شاہی پر بیٹھنے کی دعوت دی اب چرواہا بادشاہ کے برابر بیٹھا ہے، بادشاہ نے دوسرا سوال کیا، اپنے دونوں بازوؤں سے سامنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا، اس سوال کی بھی اہلِ مجلس کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ بادشاہ نے کیا پوچھا ہے لوگ اسی تجسس میں تھے کہ چرواہے نے بادشاہ کو تخت سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا، بادشاہ اس حرکت پر برہم ہونے کی بجائے اور زیادہ خوش ہوا اور کہا کہ یہ ہی آدمی تخت کا حق دار ہے۔اس کو اعزاز واکرام کے ساتھ محلاتِ شاہی میں ٹھہرایا گیا۔

بعض وزراء نے سوال کیا حضرت سوال کیا اور جواب کیا ہمیں تو کچھ نہیں پتہ چلا تو بادشاہ نے کہا اوّل میں نے انگلی سے اشارہ کیا تھا کہ اس کائنات کی اہم ہستی ایک ہی ہے وہ ہے خدا تو اس نے جواب دیا اپنے ہاتھ کے اشارے سے کہ نہیں دو ہیں خدا اور اس کا رسول۔اس کی بات زیادہ صحیح ہے کہ ہمیں تو خدا کے بارے میں پتہ ہی نہ تھا محمد عربی ﷺ نے ہی تو ہم کو خدا کا تعارف کروایا ہے اس لیے دونوں اہم ہستیاں ہیں۔

دوسرا یہ تھا کہ میں نے سامنے والی چیزوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میری بادشاہت ان سب پر چلتی ہے، میں ان پر حکمرانی کرتا ہوں تو اس نے غصہ میں آ کر میری توہین کی کہ پہلے تو خدا کی حاکمیت تسلیم کرتا ہے اور اب یہ کہتا ہے کہ حاکم میں ہوں۔ تو اور یہ تیری رعایا سب خالق کے غلام ہیں اس کے عبد ہیں۔ وزیروں نے سوچا کہ موقع پا کر اس چرواہے سے بھی پوچھیں گے کہ اس نے ان سوالوں سے کیا سمجھا تھا بظاہر تو نہیں لگتا کہ وہ اتنا ذہین ہو۔

چرواہے سے پوچھا گیا کہ بادشاہ نے پہلا سوال کیا کیا تھا، تو اس نے کہا کہ اول بادشاہ نے ایک انگلی سے اشارہ کیا میں سمجھا کہ وہ مجھ سے ایک بکری مانگ رہا ہے میں نے جواب دیا کہ محترم ایک بکری نہیں آپ کی خدمت میں دو بکریاں پیش کرتا ہوں۔ اس نے خوش ہو کر مجھے تخت پر بٹھا لیا پھر اس نے سامنے کھڑی ساری بکریوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہ سب میری ہیں تو میں نے اٹھا کر نیچے پھینک دیا کہ دو بکریاں تو دے سکتا ہوں ساری بکریاں میں نہیں دوں گا۔ تھا تو یہ محض ایک لطیفہ مگر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کہنے والے کی مراد کچھ اور تھی اور سُننے والے نے کچھ اور سمجھا۔ اسی طرح کی صورت حال ہے ان مکالموں کی جو مغرب اور اسلام کے حوالے سے کیے جاتے ہیں، مغرب اور اسلام کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے۔ گفتگو اور مکالمے کیے جاتے ہیں تو اکثر کی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے، جیسی چرواہے اور بادشاہ کی تھی۔

کوئی کہتا ہے، مغربی تہذیب اسلام ہی کی شکل جدید ہے۔

کوئی کہتا ہے، انسانی حقوق کا عالمی منشور خطبہ حجۃ الوداع سے لیا گیا ہے۔

کوئی کہتا ہے، جمہوریت ہی عین اسلام ہے (اب تو جمہوریت کے نام پر مرنے والے شہادت کا لقب پاتے ہیں)۔ انہوں نے ہر شے اسلام سے اخذ کی ہے بس صرف کلمہ نہیں پڑھا۔

جس معاشرے کی بنیاد ہی Equal Freedom for all پر ہو کہ تمام لوگ آزاد ہیں کوئی کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے، صحیح کیا ہے غلط کیا ہے ہر ایک اپنی رائے قائم کر کے اس پر عمل پیرا ہو، ہر آدمی اپنی انفرادی زندگی میں مطلق العنان آزاد ہے ہر قسم کے معاشرتی دباؤ

سے انسان آزاد ہے تو اس معاشرے میں حقوق کون لے کر دے گا؟ اور یہ لازمی بات ہے کہ جب انسان ایک جگہ مل کر اکٹھے رہتے ہیں تو ہر ایک کے دوسرے پر کچھ نہ کچھ حقوق لازم ہوتے ہیں، جن کی ادائیگی پر معاشرہ مجبور کرتا ہے مثلاً ہمسایوں کے حقوق اگر کوئی ادا نہیں کرتا تو روایتی یا مذہبی معاشروں میں اس شخص کو برا کہا جاتا ہے، اس کی ملامت کی جاتی ہے، لوگ اس سے بے رخی سے پیش آتے ہیں اس عمل کی بدولت وہ حقوق کی ادائیگی پر راضی ہو جاتا ہے۔ سول معاشرت میں ایسا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا ہر ایک اپنی مستی میں مست ہوتا ہے تو اس معاشرے میں حقوق کیسے مِلیں گے؟

سول معاشروں نے اس کا حل یہ نکالا کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ جو ایک دوسرے کے ذمہ لازم حقوق ہیں وہ لے کر دے حقوق کی بنیاد پر قانون سازی کی جائے جب حقوق کی بنیاد پر قانون سازی ہوتی ہے تو قوانین مستقل اور مسلسل بنتے رہے ہیں۔ اس غلطی کی بنیاد پر بے شمار قوانین وجود میں آتے ہیں لازمی بات ہے کہ جب قانون زیادہ ہوں گے تو ان کی پامالی بھی زیادہ ہوگی اور معاشرے میں مجرم بھی زیادہ بنیں گے۔

<u>مذہبی اور سول معاشرے کی قانون سازی میں فرق:</u>

1)۔ ہر معاشرے میں کچھ کاموں کو بہت اہم اور لازمی و اہم سمجھا جاتا ہے کہ ان کو انجام دیئے بغیر معاشرہ تباہی کا شکار ہو جائے گا۔ ان امور کو قانون کا درجہ دیا جاتا ہے۔

2)۔ کچھ کام ہوتے تو لازمی اور ضروری ہیں مگر ان کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی جو قانون کو حاصل ہوتی ہے۔ ایسے امور قانون کی شقوں میں داخل نہیں کیے جاتے یعنی ان پر عمل حکومت نہیں کرواتی بلکہ وہ معاشرہ کرواتا ہے جس میں فرد زندگی گزار رہا ہوتا ہے معاشرے کے افراد اخلاقی طور پر مجبور کرتے ہیں کہ ان حقوق کی ادائیگی کی جائے وگرنہ ملامت کرتے ہیں۔

3)۔ تیسری قسم کے کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے کرنے پر نہ حکومت مجبور کرتی ہے

کہ جسے ہم قانون کہہ سکیں اور نہ معاشرہ مجبور کرتا ہے جسے ہم اخلاقیات کا نام دے سکیں، بلکہ ایک فرد کا مطالبہ ہوتا ہے اگر کام نہ کیا جائے تو صرف ایک فرد برہم ہوگا ناراض ہوگا۔ اس کو ہم نام دیں گے آداب کا، الغرض معاشرے میں یہی تین طرح کے حقوق ہوتے ہیں جن کا نقشہ یوں بنے گا۔

o۔ قانون　　o۔ اخلاقیات　　o۔ آداب

مذہبی اور روایتی معاشروں میں حقوق کا ایک چھوٹا سا حصہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد ایک بہت بڑا حصہ محض معاشرتی اخلاقیات خاندانی دباؤ اور مذہبی ترغیب وترہیب سے ادا کیا جاتا ہے۔ حکومت اس میں مداخلت نہیں کرتی، کوئی قانون نہیں بنایا جاتا بلکہ ترغیب وترہیب سے کام لیا جاتا ہے یا روایتی معاشروں میں خاندان ملامت کرتا ہے جس سے فرد حقوق کی ادائیگی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کچھ حصہ حقوق کا تعلق رکھتا ہے ادب وآداب سے اس کا مطالبہ تنہا فرد کرتا ہے مثلاً میرے آنے پر دروازہ کیوں نہ پکڑ کر کھڑے ہوئے اس کی آسان مثال یہ ہے کہ Waiter جس طرح اپنے کسٹمر سے ہوٹل میں پیش آتا ہے اسی طرح ٹیکسی ڈرائیور اپنے کسٹمر سے جس انداز سے پیش آتا ہے تو یہ اس کا ادب سے گفتگو کرنا، ہر بات پر yes sir کہہ کر سر ہلانا یہ آداب کے ضمن میں آئیں گے۔ ایسے انداز سے پیش آنا اس کی ڈیوٹی کا حصہ ہے اگر ایسے پیش نہ آئے گا تو کسٹمر ناراض ہو جائے گا وہ کسی اور ہوٹل میں چلا جائے گا۔

روایتی یا مذہبی معاشروں میں تین درجہ بندیاں یوں ہیں:

قانون	پر عمل کروائے گی	حکومت
اخلاقیات	پر عمل کرواتا ہے	معاشرہ
آداب	پر عمل کرواتا ہے	فرد

جبکہ سول سوسائٹی میں خاندان اور مذہب دونوں غیر اہم تصور کیے جاتے ہیں خاندانی سسٹم اتنا مضبوط نہیں ہوتا کہ خاندان کی بنیاد پر کسی پر طعن وتشنیع کر کے حقوق کی

ادائیگی پر مجبور کیا جا سکے۔ اور نہ ہی مذہبی لگاؤ اس قدر رہوتا ہے کہ فرد مذہب کی بات ماننے پر آمادہ ہو جائے اور اپنے نفس پر مذہب کو ترجیح دے اور صرف مذہب کے کہنے پر اپنی خواہشات کا خون کر دے۔ جب ایسی چیزیں ہی غیر اہم ہو گئیں تو اخلاقیات کی ادائیگی ناممکن سی بات ہو گی۔ اس کا حل سول سوسائٹی نے پیش کیا کہ جو کام پہلے معاشرہ کرتا تھا جو حقوق پہلے معاشرہ لے کر دیا کرتا تھا چونکہ سول معاشرہ اپنے اندر یہ خاصیت نہیں رکھتا لہٰذا ریاست ہی باہمی حقوق لے کر دے گی اس عمل کے لیے قانون سازی کرنی پڑے گی جس آدمی کا حق دبایا جا رہا ہو وہ عدالت سے رجوع کر لے عدالت حق لے کر دے گی بلکہ اس کو آئندہ کے لیے قانونی شکل دی جائے گی تاکہ کوئی دوسرا حق نہ دبا سکے۔ جب حقوق کی ادائیگی معاشرتی اخلاقیات، دینی ترغیب وترہب پر نہیں ہوتی تو حقوق کی درجہ بندی یوں ہوتی ہے۔

o۔قانون　　　o۔اخلاقیات　　　o۔آداب

اس وجہ سے سول سوسائٹی میں مستقل اور مسلسل قانون سازی کا عمل جاری رہتا ہے اور نت نئے قوانین وجود میں آتے ہیں مغربی مفکرین اس صورت حال سے پریشان ہیں۔ سول سوسائٹی میں اسلامی اقدار باقی نہیں رہ سکتیں، سول سوسائٹی میں مذہب باقی نہیں رہ سکتا۔

سول سوسائٹی کے جب قصیدے پڑھے جاتے ہیں تو مذہبی افراد کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بات بھی دہرائی جاتی ہے کہ سول معاشرت میں ہر فرد آزاد ہوتا ہے کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی جو چاہے جس قدر چاہے عبادت کرے، روزے رکھے، تلاوت کرے، آپ کی آزادی کو مکمل تحفظ دیا جاتا ہے آپ کی ہر رکاوٹ کو دور کیا جاتا ہے جو بھی دین دار بننا چاہے اس کے لیے دین اختیار کرنے کے زیادہ مواقع موجود ہوتے ہیں الفاظ کا ایسا تانا بانا بنا جاتا ہے کہ عام انسان محسوس کرتا ہے کہ سول سوسائٹی شاید اسلامی معاشرت کی ہی شکل ثانی ہے جس میں تو اسلام پر عمل کرنے سے بالکل روکا نہیں جاتا۔ یہ تو بندے کا اپنا قصور ہے اگر عمل نہ کرے۔

بھائیو! تناظر کے بدل جانے سے فکر بدل جاتی ہے اور فکری تبدیلی سے عمل میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ چیزوں کو جس تناظر میں دیکھا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس کی درجہ بندی کی جاتی ہے اعلیٰ کیا ہے، ادنیٰ کیا ہے، اہم کیا ہے، غیر اہم کیا ہے، تناظر کے بدل جانے سے اہم امور غیر اہم نظر آنے لگتے ہیں اور غیر اہم کام نہایت ضروری معلوم ہوتے ہیں تناظر کے بدلنے سے فکر وسوچ بدل جاتی ہے، قدر یعنی ایک زمانہ تک جس بات کو علم تصور کیا جاتا ہے تناظر کے بدل جانے میں وہ علمی بات جہالت معلوم ہوتی ہے۔

برصغیر کے مذہبی وروایتی معاشروں میں تبدیلیاں:

سول سوسائٹی ہمارے معاشرے کا ایک خواب ہے جو ابھی تک مکمل طور پر پورا نہیں ہوا مگر کچھ تبدیلیاں ضرور رونما ہوئی ہیں جس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا مثلاً عورتوں کے حجاب کے متعلق ہی دیکھ لیں کہ حجاب پر مذہبی معاشروں میں تو زور اس لیے دیا جاتا ہے کہ مذہب بے حیائی اور عریانی سے منع کرتا ہے، یہ صرف مذہب ہی نہیں بلکہ جو لوگ مذہبی نہیں تھے وہ بھی حجاب پر زور دیتے تھے اس لیے کہ شریف خاندان اور عزت ووقار والے لوگوں کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ ان کی عورتیں بے حجاب بازاروں میں نکلیں۔ بہر حال آج سے تیس یا چالیس سال قبل کی صورت حال سامنے رکھیں اور آج کل صورت حال سامنے رکھیں تو نمایاں تبدیلیاں نظر آئے گی۔ اس وقت غیر مذہبی آدمی بھی عورت کو ہاف بازو پہنا کر برنہ آنے دیتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے اور آج ٹیلی ویژن پر بیٹھ کر برملا کہہ دیا جاتا ہے قرآن سمجھا ہے، قرآنی حجاب کی آیات بھی سمجھی ہیں مگر یہ حکم خاص تھا ازواج مطہرات کے لیے مسلمان عام عورتوں کے لیے نہیں ہے۔

اسی طرح آدمی جب اپنا ماحول بدل لیتا ہے اور تناظر تبدیل کر لیتا ہے تو پھر اس کو پہلے تو وہ باتیں جو ایمان کو تازہ کر دیا کرتی تھیں نامانوس سی معلوم ہوتی ہیں پھر اس کی آنے والی نسلیں کہتی ہیں ناممکن سی بات ہے شاید ایسے ہو گیا ہو۔ اس سے جو اگلی نسل آئے گی آدھی تو کہہ دے گی یہ صرف مولویوں کی باتیں ہیں ہم یقین نہیں کرتے اور بعض اس میں شک کریں گے۔

جدید کلچر کو اختیار کیا جائے گا تو فکری اور عملی تبدیلی کا نتیجہ لازمی نکلے گا صرف اس بات

سے خوش نہیں ہو جانا چاہیے کہ اس معاشرت میں اسلام پر عمل کرنے سے کوئی منع بھی نہیں کرتا، اس معاشرت میں اگر اسلام سے منع نہیں کیا جارہا تو اس میں کسی کو آپ برائی سے بھی نہیں روک سکتے، جب دونوں جانبیں برابر ہیں اور سرمائے کے تحفظ کی خاطر خواہشات کو بڑھانے میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں تو وہاں نفس پرستی اور شر کا تناسب بڑھتا ہے خیر کبھی بھی پھل پھول نہیں سکتی۔

لبرل ازم اور سیکولرازم کی عملی شکل سول سوسائٹی میں ہی ظاہر ہوتی ہے یوں کہیں کہ سول سوسائٹی میں ہی لبرل سوچ، سیکولر فکر یا (Humanity) نفس انسانیت کی بنا پر بننے والے نظریات جڑ پکڑ سکتے ہیں۔

علوم وحی اور سائنس

جس طرح ہر معاشرے میں اپنے اقدار ہوتے ہیں یعنی چیزوں کو ناپنے کے پیمانے ہوتے ہیں مثلاً عیسائیت جس معاشرت پر زور دے گی اس میں قدر بائبل ہوگی مسلمان جس معاشرت پر زور دیں گے اس معاشرے میں کیا صحیح ہے کیا غلط ہے کیا اعلیٰ ہے کیا ادنیٰ، اس کے بارے میں جانیں گے وہ قرآن وسنت سے یعنی قدر قرآن وسنت ہوں گے۔ ہندوازم میں اقدار اسی نوعیت کی ہوں گی اسی طرح سول سوسائٹی میں اقدار مختلف نوعیت کی ہیں۔ اقدار سے ہی طے کیا جاتا ہے کیا چیز ادنیٰ ہے اور کیا چیز اعلیٰ ہے، کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم، معاشرہ جس چیز کو بھی اعلیٰ قرار دے اس چیز کے بارے میں جاننے کو علم کہا جاتا ہے اور وہی لوگ تعلیم یافتہ اور علم والے شمار ہوتے ہیں اس لیے جو شخص معاشرے میں طے شدہ اعلیٰ چیز کے بارے میں معلومات نہیں رکھتا وہ فرد تعلیم یافتہ شخص نہیں سمجھا جاتا، اس کو علم سے ناآشنا قرار دیا جاتا ہے۔

معاشرت کے بدلنے سے ''اہم کیا ہے اور غیر اہم کیا ہے''؟ ان تصورات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہی اہم اور غیر اہم کا نظریہ طے کرتا ہے کہ علم کیا ہے۔ مسلمان معاشرت میں علماء ان کو کہا جائے گا جو قرآن وسنت کا علم رکھتے ہیں۔ عیسائی معاشرت میں علماء ان لوگوں کو کہا جائے گا جو بائبل کے بارے میں آگاہی رکھتے ہیں اور مذہبی لٹریچر سے واقف ہیں۔

ہندو معاشرے میں علم والے ان کو کہا جاتا ہے جو ان کے مذہبی لٹریچر کو جانتے ہونگے۔

مسلمانوں کے نزدیک اہم قرآن وسنت تھے تو ان کے جاننے کو علم قرار دیا گیا۔ عیسائیوں نے بائبل کے جاننے کو علم قرار دیا اسی طرح سول سوسائٹی میں (قدر) چیزوں کو ناپنے کا پیمانہ قرآن وسنت نہیں ہے۔ بائبل یا گرنتھ نہیں ہے بلکہ مطلق العنان آزادی اصل قدر ہے۔ آزادی میں اضافہ کیسے ممکن ہے ماقبل میں "(Freedom) آزادی" کے عنوان کا مطالعہ کرلیں۔

آزادی میں اضافہ کرتی ہے سائنس یا آزادی میں اضافہ ہوتا ہے سرمائے کے ذریعے سے۔ جو بھی سائنس کے بارے میں جانتا ہے یا وہ سرمائے کی بڑھوتری کے عمل سے واقف ہے تو وہی فرد علم والا سمجھا جاتا ہے اور جو معلومات فرد کی آزادی (سرمایہ) میں اضافے کا باعث نہ ہو وہ علم نہیں کہلائیں گی۔ چونکہ ہمارا معاشرہ بھی نیم سول لائنزڈ ہو چکا ہے ہمارے ہاں بھی سائنس اور سرمائے کا ارتقاء ایک انتہائی اہم چیز ہے۔ اس لیے اس معاشرے میں بھی پڑھے لکھے، علم والے جاننے والے، ان افراد کو سمجھا جاتا ہے جو سائنسی علوم کو جانتے ہوں یا جن کا علم سرمائے کے ارتقاء میں کام آتا ہو، اس کے علاوہ جہالت کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ قرآن وسنت سے واقفیت رکھنے والے کو جاہل مولوی یا جاہل ملا کہہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کے علم کو زمانے کی ضرورت کے ہم آہنگ نہیں سمجھا جاتا اس لیے باوجود علم کے بھی انکو جاہل ہی سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ اور سول معاشرت عصر حاضر میں جس چیز کا تقاضا کرتے ہیں اور جس چیز کو اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں، قرآن وسنت اس مقصد کو پورا نہیں کرتے اس لیے قرآن وسنت کے جاننے والوں کو جاہل ہی سمجھا جاتا ہے۔ مختلف معاشروں کے مختلف اہداف ہیں جو علم اس ہدف کو پورا کرتا ہے۔ اسی کے جاننے والے لوگوں کو اہل علم سمجھا جاتا ہے ۔ پڑھے لکھے اور علماء کہلاتے ہیں، تو علم فی نفسہ کیا ہے اس کا تعین معاشرے کے اہداف معاشرے کی ضروریات کرتی ہیں۔

جب تک مسلم معاشروں کا ہدف اوّل خدا کی رضا حاصل کرنا تھا تو اہل علم صرف وہی افراد کہلاتے تھے جو یہ بتاتے کہ اس کام سے خدا راضی ہوتا ہے اور اس سے ناراض ہوتا ہے یعنی شریعت کا علم۔ خدا کے ارادے اور رضاء کے بارے میں علم صرف شریعت ہی دے سکتی ہے، اس

لیے اہل علم یا جاننے والے، عالم صرف ان کو کہا جاتا تھا جو شریعت کو جانتے ہوں۔ باقی علوم کو علوم کی تلچھٹ سمجھا جاتا تھا اصل قدر ومنزلت مفسرین، محدثین، فقہاء کرام کی ہوتی تھی، علوم عقلیہ کے ماہرین کو اس قدر اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ اب صورت حال کچھ تبدیل ہوگئی ہے کسی کا ہدفِ اوّل دنیاوی شہرت ہے، کسی کا ہدف اوّل سرمایہ جمع کرنا ہے، کسی کا ہدف اوّل سائنس میں ترقی کرنا ہے، جیسے اہداف ہوں گے اسی تقاضے کو پورا کرنے والی معلومات کو علم سمجھا جائے گا۔ آج ہدف بدل جائے تو علم کیا ہے؟ اس سوال کا جواب خود بخود بدل جائے گا۔

سیکولرازم یا لبرل ازم جب وار کرتا ہے تو اس کا نشانہ سب سے پہلے اس بات پر آ کر لگتا ہے کہ اہداف کی ترتیب بدل جاتی ہے جس سے علوم کی ترتیب بھی بدل جاتی ہے۔ اسکا عملی اظہار ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جس اہمیت کی نظر سے ایک سائنس دان، بنک مینیجر، انجینیئر کو دیکھا جاتا ہے، مولوی صاحب کو نہیں دیکھا جاتا۔ بعض لوگوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ عصر حاضر کے انسان چونکہ بہت ترقی کر چکے ہیں ان کے اہداف ومقاصدِ زندگی بدل گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں علم کے پیمانے بھی تبدیل ہو گئے ہیں لوگ سائنس کو ایک مسلمہ اصول کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ سائنسی طریقے سے دی گئی دلیل آفاقی دلیل سمجھی جاتی ہے تو ہم بھی ثابت کر کے دکھائیں گے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے لہٰذا ہم اس کے جواز کی دلیل بھی آفاقی نوعیت کی دیتے ہیں۔

اس آفاقی دلیل کے چکر میں اسلام اور سائنس کے عنوان پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس قسم کی آفاقی دلیل کے دھوکے میں کئی مذہبی افراد اپنا وقت صرف کر رہے ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سائنس اور اسلام قدم بقدم ہیں تم سائنس کو تو جانتے ہو اسلام کو بھی مان لو۔ ایک مسلمہ اور محکم اصول کے طور پر سائنسی علوم کو معیار بنایا جاتا ہے اور جزئیات اسلام کی ان کے ساتھ ہم آہنگی دکھا کر اسلام کے جواز پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔

اسلام اور سائنس

کمزور دلیل مضبوط ترین موقف کو بھی کمزور ترین کر دیتی ہے، اسی تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس مذہب یا مذہبی مسائل کے لئے دلیل بن سکتی ہے یا نہیں۔اس بات کو جاننے سے قبل ہم سائنس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ علم سائنس کیا ہے۔سائنس کس چیز کو ذریعہ علم تسلیم کرتی ہے، قدیم اور جدید سائنس میں کیا فرق ہے۔صرف ان دوسو سالوں میں ہی سائنس نے ایجادات کا انقلاب برپا کیوں کیا اس سے قبل سائنس دان اپنے فن میں امام ہونے کے باوجود ایجادات میں انقلاب نہ لا سکے۔قدیم سائنس اور ٹیکنو سائنس میں مابعد الطبعیاتی کیا فرق ہے، اور اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے اپنے مذہب کو اپنے زمانے کے سائنسی نظریات سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا تھا تو انہوں نے کس قدر خسارہ اٹھایا اور مذہبی عقائد و نظریات اس حرکت کی بدولت کیسے تضحیک کا نشانہ بنے، سائنسی نظریات بدل جانے کے بعد مذہب بے حیثیت ہو کر رہ گیا۔

ہمارے دور میں چونکہ علم سائنس اور ٹیکنالوجی کو بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے۔(نعوذ باللہ)

قرآن و حدیث پر یا مسائل شرعیہ پر سائنسی، منطقی عقلی دلائل دینے سے پہلے ایک نظر ہم ان معاشروں پر ڈالتے ہیں جنہوں نے صدیوں پہلے یہ تجربہ کیا تھا پھر ان کا کیا حال ہوا 280 ق،م (280 B.C) سے لے کر پندرہویں صدی تک فلسفہ وسائنس اور عیسوی مذہب کا آپس میں اجماع تھا کہ زمین ساکن ہے، اور دیگر نظریات میں بھی یہ تینوں ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہو کر چل رہے تھے۔

عیسائیت نے اپنے استحکام کے لیے کچھ دیر عارضی فائدہ حاصل کر لیا کہ اپنے اثبات اور جواز کی دلیل فلسفیانہ منہاج علم اور سائنسی طرز استدلال سے قائم کی اس نے مذہبی منہاج العلم کو فلسفیانہ، سائنسی اور منطقی یونانی علوم کے منہاج سے مخلوط کر لیا۔حالانکہ دینی علم کا منہاج فلسفیانہ یونانی علوم کے منہاج سے یکسر مختلف تھا۔عیسائیوں کی اس مخالطت کے بعد مذہبی طرز

استدلال دینی منہاج علم، کی بجائے سائنسی و یونانی منہاج علم مقبول ہوا فلسفہ یونان اور قدیم سائنس مذہب میں مکمل طور پر داخل ہو گئے۔

مثلاً زمین ساکن ہے یہ اس وقت کا مقبول ترین نظریہ تھا جس پر فلسفہ یونان اور قدیم سائنس کا اجماع تھا۔تو عیسائیوں نے اس مسلمہ نظریے کی توثیق یوں پیش کی کہ ضرور ایسا ہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہی سکون ارض پر کافی دلیل ہے کیونکہ جس جگہ اللہ کا بیٹا جلوہ گر ہو تو تمام کائنات کو چاہیے کہ اس کا طواف کرے۔اسی طرح قدیم فلسفہ اور سائنس کا نظریہ تھا کہ مخالف سمت میں کوئی خطہ زمین نہیں ہے اگر ہے بھی تو انسان آباد نہیں ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ وہاں تشریف نہیں لے گئے۔ایک طویل عرصہ قدیم سائنس، یونانی فلسفہ اور عیسائیت آپس میں ہم آہنگ ہو کر چلتے رہے۔

سترہویں صدی میں جب جدید فلسفہ اور جدید سائنس نے جنم لیا تو اصل جنگ یونانی فلسفہ اور جدید فلسفہ کی تھی اصل مدمقابل تو قدیم سائنس اور سوشل سائنس، جدید سائنس تھی۔کچھ نظریے جو صدیوں سے چلے آرہے تھے اس وقت کے لوگوں نے اپنی استعداد اور علم کے مطابق نظریہ قائم کیا تھا بعد میں آنے والے لوگوں نے کچھ اور طرح کے نظریات پیش کیے،نئی سائنسی تحقیقات سامنے آئیں چونکہ عیسائیت قدیم سائنسی نظریات کا جواز بائبل سے دے چکی تھی اس وجہ سے انحراف ممکن نہیں تھا اس لیے جو بھی کوئی ایسا نظریہ پیش کرتا جو قدیم سائنسی نظریے کے خلاف ہوتا اسے عبرت ناک سزا دی جاتی اور طاقت کے زور پر نئے نظریات کو دبانے کی کوشش کی جاتی، سائنس دانوں کو نشان عبرت بنایا جاتا جس وجہ سے عیسائیت پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ نئے علوم سائنس کے مخالف تھی اس لیے مذہب عیسائیت شکست و ریخت کا نشانہ بنا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت کی شکست کا سبب سائنس اور فلسفہ کو اپنے اندر داخل کرنا تھا اگر عیسائیت دینی منہاج علم کو ہی اس کی مابعد الطبعیات کے ساتھ برقرار رکھتی سائنسی منہاج علم اختیار نہ کیا جاتا تو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔مذہب تو حقیقت بیان کرتا ہے حقیقت تو وہ ہوتی ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی اور اپنے ہونے کے لیے کسی دوسرے جواز کی محتاج نہیں ہوتی۔

مذہب اپنے اثبات کے لیے اپنے اندر جواز رکھتا ہے سائنس سے اس کی توثیق یا تردید کرنا خود غیر سائنسی، غیر منطقی طریقہ کار ہے، سائنس کا کوئی نظریہ حتمی نہیں ہوتا ہر وقت تبدیلی کا امکان رکھتا ہے اس لیے دونوں کے منہاج الگ الگ ہے ں۔

ہر تعقل اپنے منہاج میں درست نظر آتا ہے، منہاج بدل جائے تو عقلی دلائل غیر عقلی معلوم ہوتے ہیں جس طرح دو ہزار سال تک سورج متحرک اور زمین ساکن رہی لیکن دو ہزار سال بعد منہاج علم بدل گیا تو قدیم مذہبی علم و عقلی دلائل مسترد کر دیئے گئے۔

عیسائیت کی شکست کی سب بڑی وجہ فلسفہ یونان کا ختم ہونا اور قدیم سائنسی نظریات کا باطل ہونا واضح بنی کیونکہ اسی شاخ نازک پر عیسائیت اپنا آشیانہ تعمیر کر چکی تھی جب یہ دونوں چیزیں جدید فلسفہ اور سوشل سائنس کا مقابلہ نہ کر سکیں اور نئی فکر کے سامنے مات کھا گئیں تو عیسائی نظریات بھی بے بنیاد ہو کر رہ گئے، اپنی اس حماقت پر چرچ نے 350 سال بعد معذرت بھی کی مگر اس وقت معذرت طلب کرنے والا کوئی نہیں تھا اس غیر دانش مندانہ اور غیر دینی رویے کے باعث مغرب میں کلیساء غیر اہم ادارے بن کر رہ گئے اور یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ دنیاوی امور میں مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک الگ دنیا ہے۔ کیا سائنسی علوم دینی مسائل کے اثبات یا رد کے لیے دلیل بن سکتے ہیں؟ اس بات پر بحث سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ سائنس کس چیز کو علم مانتی ہے، یعنی سائنسی منہاج میں علم کی تعریف کیا ہے۔

سائنسی منہاج میں علم کی تعریف:

اِس میں تین چیزیں داخل ہیں:

1)۔ اس علم پر شک کیا جا سکتا ہو،

2)۔ اس میں غلطی کے امکان کو تسلیم کیا جاتا ہو اور اسے درست بھی کیا جا سکتا ہو۔

3)۔ اس پر تجربہ کیا جا سکتا ہو۔

فلسفہ سائنس کی کوئی کتاب پڑھ لی جائے ہر کتاب میں یہی تصور اور نظریہ اور اصول ملے گا کہ حواس خمسہ کی بنیاد پر حاصل کردہ علم اخذ کردہ نتائج، مشاہدات اور تجربات

سے صرف امکانی سچ (Probable Truth) تک رسائی ممکن ہے نہ کہ ٹھوس قطعی، اصلی، واقعی، اور ابدی سچائی تک۔

سائنس میں علم اسکو کہتے ہیں جس میں کذب اور تردید کا مکان ہر وقت موجود رہتا ہے جس نظریے میں رد ہونے کے زیادہ امکان ہوں گے وہ نظریہ زیادہ ترقی کرے گا، ارتقا کی منازل کا سفر کامیابی سے طے کرے گا۔

سائنس کا کوئی بھی نظریہ حتمی و قطعی نہیں ہوسکتا ہر وقت اس میں تبدیلی کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اگر کوئی نظریہ اس حد تک یقینی ہو جائے کہ اس میں شک اور تردد کا امکان بھی موجود نہ رہے تو وہ نظریہ علم کی تعریف سے خارج ہو جائے گا بلکہ اس کو تو عقیدہ کہا جائے گا۔

لہٰذا سائنس کا کوئی نظریہ مسلمہ و قطعی اور نا قابل تبدیل نہیں ہوسکتا، ہر نظریہ اپنے اندر تبدیلی کا امکان رکھتا ہے جبکہ مذہب کا منہاج اس سے بالکل جدا ہے اس کے نظریے قطعی اور نا قابل تغیر ہوتے ہیں اس میں علم قطعی اور شک سے پاک ہوتا ہے۔

ہر عقل مند انسان سمجھ سکتا ہے کہ قطعی اور حتمی چیز کے اثبات یا تردید کے لئے غیر قطعی اور غیر حتمی بات کو دلیل بنانا احمقانہ عمل ہے۔ عصرِ حاضر میں سائنٹیفک میتھڈ کے مطالبے کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے عوام کے اس مطالبے پر اسلام کو بھی سائنٹیفک میتھڈ پر بیان کرنے کی غیر سنجیدہ کوشش کی جاتی ہے۔ جو آدمی سائنٹیفک میتھڈ سے بات کرے اسے پڑھا لکھا، سمجھا جاتا ہے۔ جو آدمی قرآن وسنت سے اثبات کی دلیل سننے کے بعد پھر بھی سائنٹیفک میتھڈ سے دلیل طلب کرے تو علماء کی ذمہ داری ہے کہ اس کو سائنٹیفک میتھڈ سے سمجھانے کی بجائے اس کے ایمان کا جائزہ لیں اور اس کے ایمان کے گراف پر محنت کریں ہو سکے تو اس کو وحی کی قطعیت اور سائنٹیفک میتھڈ کا غیر حتمی اور قابل تردید ہونا سمجھا دیں۔

سائنٹیفک میتھڈ کیا ہے؟

انسانی ذہن کے استعمال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کوششوں کو جاننے کا طریقہ سائنٹیفک میتھڈ کہلاتا ہے۔ یعنی حصول علم کا ہر وہ طریقہ جس کا ذریعہ نفس انسانی مثلا

تجربہ، مشاہدہ، احساسات، یا قوت سمعہ وبصرہ بنے۔

جبکہ مذہب انسانی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ربِ ذوالجلال کا کرم ہے محض اس کی طرف سے رہنمائی وعطا ہے لٰہذا علم وحی یعنی دین کا موازنہ یا تجربہ یا اس کی تصدیق ،تائید وتوثیق کے لئے انسانی ظنی، قیاسی، حسی، تجرباتی، غیر قطعی، عقلی، وجدانی یا سائنسی طریقے سے مدد لینا غیر دینی اور غیر سائنسی رویہ ہے خود سائنس کے منہاج علم میں بھی یہ طریقہ قابل قابل نہیں اور مذہب کے منہاج میں بھی یہ غیر معتبر طریقہ کار ہے۔

عصرِ حاضر میں ایجادات کا سیلاب کیوں

قدیم سائنس اور جدید سائنس کا آپس میں مابعد الطبعیاتی فرق ہے دونوں کے الگ الگ منہاج ہیں۔

قدیم سائنس کا مقصد حقائق الاشیاء تھا کہ کائنات کے مطالعہ سے حقیقت فی نفسہ کا ادراک کیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے ادراک کے بعد بڑی حقیقت (حقیقت اعلی) تک انسان کی رسائی ممکن ہو سکے، مقصد تو ٹھیک تھا مگر طریقہ کار غلط تھا اس لیے کہ حقیقت اعلیٰ تک رسائی اور اس کی کما حقہ ادراک محض عقل سے ممکن نہیں اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے تک رسائی کے لیے طریقہ ہی دوسرا متعین کیا ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اللہ کے مقرب ترین بندے جن کو اللہ نے نبوت سے سرفراز کیا وہ ہی صحیح طریقہ سے بتا سکتے ہیں حقیقت اعلیٰ کون ہے اور اس کا انسانوں سے کیا مطالبہ ہے، حقیقتوں کے ادراک کا سفر سینکڑوں صدیاں چلتا رہا، 17 صدی میں جدید فلسفہ جب پروان چڑھا اس کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ حقیقت اعلیٰ کا ادراک ممکن ہی نہیں ہے، سب سے بڑی حقیقت خود نفس انسانی ہے، اگر کوئی اس سے بڑا ہے بھی تو چونکہ ہم اس پر تجربہ نہیں کر سکتے لٰہذا وہ ہمارے علم کے دائرہ سے باہر ہے اس لیے ہم ہر اس بالائی حقیقت سے دست بردار ہوتے ہیں جو نفسِ انسانی کے علاوہ ہے۔

جب حقیقت اعلیٰ نفسِ انسانی ہے تو اس کا حق ہے کہ ہر اس ذریعہ علم کو تسلیم کیا جائے جس کا موجد انسان خود ہے انسان اپنے اندر سے ہی علم حاصل کرے مثلاً عقل سے

حواس خمسہ سے وجدان سے یا انسانی جبلتوں سے (سائنٹفک میتھڈ) اس کے علاوہ کسی بھی ذریعہ علم جو انسانی دائرہ کار سے باہر ہو جس پر انسان تجربہ نہ کرسکتا ہو وہ سائنٹفک میتھڈ نہیں اس لیے عصرِ حاضر کے انسان یا جدید فکر کے حامیوں کو وہ علم اور ذریعہ علم قبول نہیں۔

جدید سائنس:

جدید سائنس کا مقصد حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ حقیقت تو تلاش ہو چکی ہے کہ سب سے اعلیٰ حقیقت انسان ہے، لہٰذا اس حقیقت کو پر اثر بنانے کے لیے سائنس انسان کی خدمت کرے گی مختصر یہ کہ عصرِ حاضر کی سائنس کا مقصد تحقیق کائنات نہیں بلکہ تسخیرِ کائنات ہے۔

I will com a superman.

ہر وہ مادی رکاوٹ جو انسان کی آزادی میں رکاوٹ بنے اس کو دور کیا جائے گا سائنس کے ذریعے تاکہ انسان اپنی مطلق العنان آزادی کا برملا اظہار کرسکے، اور عصرِ حاضر کی سائنس کا دعویٰ ہے کہ ہم دنیا کو ایسا بنادیں گے جیسا کہ Human been چاہتا ہے، قدرت کو مسخر کرنا یہ مشن ہے، ایجادات میں انہی 2 سو سالوں میں ترقی اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ مقصدِ سائنس تبدیل ہو گیا۔

ایک منہاج العلم سے دوسرے علم کی توثیق یا تردید

ایک منہاج العلم سے کسی دوسرے منہاج العلم کی کسی جزی کی تردید یا توثیق غیر سائنسی اور غیر دینی طرزِ عمل ہے۔ اس جملہ کو ایک آسان مثال سے یوں سمجھیں، ایک آدمی ایلو پیتھی، ڈاکٹری طریقہ علاج شروع کرواتا ہے مثلاً آپریشن کروا لیتا ہے آپریشن کے بعد وہ ایلو پیتھی طریقہ علاج کو چھوڑ کر ہومیو پیتھک علاج کروانا چاہتا ہے تو کوئی بھی عقل مند ڈاکٹر اس کو ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دے گا۔

حالانکہ دونوں طریقہ علاج ہیں اور دونوں علوم میں بدن انسانی کو ہی مدِ نظر رکھ کر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور دونوں ایک خاص مرض کا ہی علاج کریں گے اتنی ساری مماثلت کے باوجود مریض کو کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ نے آپریشن تو ایلو پیتھی کے ذریعہ کروالیا ہے اور ادویات ہومیو پیتھک کی استعمال کرلیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں کرنے دیا جاتا، حالانکہ دونوں طب ہی ہیں جواب اس کا یہ ہے کہ ایلوپیتھی طریقہ علاج کا اپنا منہاج العلم ہے اپنا طریقہ کار ہے، ایک خاص علمیت کی روشنی میں ہر بات کا جائزہ لیا جاتا ہے اس کا طریقہ کار مختلف ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ہومیو پیتھک اس کا اپنا الگ طریقہ کار ہے اس کا اپنا منہاج العلم ہے وہ ایک دوسرے انداز سے بدن انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس لیے ایک طریقہ علاج کے منہاج کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے سے خطرات پیدا ہوں گے۔

اسی طرح ایک منہاج،طریقہ سے حاصل کیے ہوئے علم کی کوئی جزئی دوسرے منہاج یا طریقہ سے حاصل کردہ علم پر نہ تو دلیلِ توثیق بن سکتی ہے نہ دلیل تردید بن سکتی ہے۔اس سے بھی آسان یوں سمجھیں ایک آدمی طب کے کسی اصول سے ریاضی کے کسی مسئلہ پر اثبات میں یا رد میں دلیل دے تو ظاہر ہے اس طریقہ کار کو غیر سنجیدہ غیر عقلی اور غیر علمی رویہ تصور کیا جاتا ہے۔

آخر پھر کیا وجہ ہے کہ دینی مسائل جو کہ ایک خاص علمیت سے ثابت ہیں جن کا ماخذ نفسِ انسانی کی بجائے وحی الٰہی ہے ان کے اثبات کے لیے دلیل بیان کی جاتی ہے کسی دوسرے منہاج سے دوسرے علم سے جس کا ماخذ نفس انسانی ہے مثلاً سائنٹیفک میتھڈ سے اسلام کی تشریح کرنا۔جس طرح طب کے اصول سے ریاضی کے مسئلہ کو نہ رد کیا جا سکتا ہے نہ ثابت کیا جا سکتا ہے ،بالکل اسی طرح دینی مسائل و معاملات کی حقانیت یا تردید ثابت کرنا سائنس سے سائیکالوجی ، بیالوجی یا فزکس کے کسی اصول سے، ایسا طریقہ کار اختیار کرنا نہ تو دینی طرزِ عمل ہے اور نہ ہی سائنسی فہم و بصیرت اس کو قبول کرتی ہے۔

اس لیے کہ ان دونوں کا منہاج العلم الگ الگ ہے دینی مسائل کا الگ اور سائنٹیفک میتھڈ کا الگ، ایسا طرزِ عمل وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو سائنس کی حقیقت سے نا آشنا ہیں یا پھر حد درجہ کے مرعوب ہیں اس طرز عمل کو سائنسدان بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔بعض لوگ قرآن کی آیات پڑھ پڑھ کر جدید سائنسی علوم کی تشریح شروع کر دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے علم سائیکالوجی علم طبعیات یا فلاں ٹیکنالوجی قرآن سے نکالی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان لوگوں نے تو باوجود کفر کے اور باوجود قرآن پر یقین نہ رکھنے کے پھر بھی اتنے علوم اخذ کر لیے۔ تو مسلمان مفسرین، جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ، علامہ آلوسی، صاحب ابن کثیر اور ہزاروں مفسرین حضرات کیا کرتے رہے؟ ان کو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی کہ اتنے علوم بیان کیے گئے ہیں، یعنی کافروں کو تفہیم قرآن پر اس قدر عبور اور یہ شمع ہدایت کے پروانے، اپنی زندگیوں کو فہم قرآن پر نچھاور کرنے والے قرآن کے ایک ایک لفظ کے بارے میں آ گاہی حاصل کرنے کو دنیا و مافیہا سے بہتر جاننے والے قرآن کی فہم میں پیچھے رہ گئے اور قرآن کے مضامین کافروں پر جس طرح کھلے مسلمان اس سے ناواقف رہے؟

قرآن مبین کی آیات تلاوت کر کے ان کی ہم آہنگی جدید سائنس کے ساتھ پیش کرنے والے حضرات فکری گمراہی میں مبتلا ہیں۔ قرآن اور سائنس کی ہم آہنگی کا چرچہ کرتے ہوئے اسی گمراہی کو پھیلا رہے ہیں وہ مقصدِ قرآن سے ناواقف ہیں۔

یاد رکھیں ہر علم میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔

1)۔ علم knowledge

2)۔ موضوع علم Object of knowledge

3)۔ ذریعہ علم source of knowledgek

ان تینوں میں سے کوئی ایک تبدیل کر لیا جائے تو دوسرا خود بخود تبدیل ہو جاتا ہے۔

موضوع علم: خدا کی رضا معلوم کرنا ہے تو اس کے لیے ذریعہ علم بھی ایسا ہی اختیار کرنا پڑے گا جو ہم کو خدا کے بارے میں بتا سکے۔ جیسا کہ وحی اسی طرح ہر علم کا حال ہے جب موضوع تبدیل ہوگا تو ذریعہ علم بھی بدل جائے گا اور علم بھی بدل جائے گا۔ اگر کسی آدمی کا موضوع علم کپڑا بننا ہے، تو اس کے لیے ذریعے بھی ویسے ہی اختیار کرنا ہوں گے اور اسی کے ہم آہنگ علوم اختیار کیے جائیں گے۔ اسی طرح سائنس کا موضوع ہے تسخیر کائنات، تو اس کے لیے ذرائع علم حواس خمسہ اختیار کئے جائیں اور اس موضوع علم کے بدل جانے سے ذرائع علم اور علم بھی بدل جائے گا۔

اسلام میں موضوع علم (Subject of knowledge) رضاء الٰہی کو معلوم کرنا ہے اور سائنسی علوم کا موضوع subject of knowledge کچھ اور ہے۔

تو ان کے ذرائع علم بھی مختلف ہوں گے اور علم بھی الگ الگ ہوں گے ایک کو دوسرے کے منہاج پر پرکھنا غلطی ہے۔اگر آپ اسلام کا مقصد بھی دنیا کی ترقی بتاتے ہیں اس کا بھی subject of knowledge وہی قرار دیں جو مغرب بتاتا ہے تو پھر لڑائی کس بات پر۔

جب آپ Subject تبدیل کرلیں گے تو آپ کبھی بھی ان کا مقابلہ نہ کرسکیں گے ان کی اس Subject پر چار سو سال کی محنت ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم مختلف علمیتوں کو برابر اہمیت دیں گے اور ایک ہی سطح پر مختلف تصورات علم رکھیں گے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے جب ایک علمیت آتی ہے تو وہ علمیت کے دوسرے پیمانوں کو رد کر دیتی ہے دوسروں کو شکست دیئے بغیر ایک ہی سطح پر دو علمیتیں سفر کر لیں ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہوگا ،صرف ایک تصور علمیت غالب رہ سکتا ہے۔کیونکہ ایک (Satckchar of knowladge) یعنی منہاج علم میں وہ علم معقول نظر آتا ہے اور اسی منہاج علم (Satckchar of knowladge) کو بنیاد بنا کر کسی بھی دوسرے علم کی جزوی معلومات کو چیک کریں گے تو وہ اس کو نا معقول بتائے گا۔

ایک معقول بات اپنے (satchare) منہاج وطریقہ کار میں ہی معقول ہوتی ہے !اسی کے جاننے والے کو عالم قرار دیا جاتا ہے جب منہاج بدل جائے satcher تبدیل ہو جائے پہلا طریقہ کار رد کر کے کوئی دوسرا طریقہ رائج ہو جائے تو پہلے والی علمیت بھی غیر معقول نظر آتی ہے۔

دنیاوی جتنے بھی علوم ہیں ان کے موضوعات کیا ہو سکتے ہیں خلاصہ یہ کہ سب کا موضوع مادہ ہے یا مادے کی مختلف شکلیں ہیں۔اس مادے کے بارے میں جاننے والے کو ہی عالم تصور کیا جاتا ہے جب تک وہ مادہ کارآمد ہوتا ہے اس کے جاننے والے کو بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے جب معاشرے سے اس مادے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو اس مادے کے بارے میں جو

علم تھا وہ بھی بے وقعت ہو جاتا ہے اور اس علم کو جاننے والے بھی صفِ جہالت میں شمار کیے جاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی مادے کو بقا نہیں ہے وہ حالات و ضرورت کے مطابق بدلتا رہتا ہے تو لازماً اس کے بارے میں جاننے والے بھی بے وقعت قرار پاتے ہیں۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی بھی علم ابدی نہیں ہے سوائے علوم وحی کے کیونکہ وہ خدا کا ارادہ ہے اور خدا کبھی نہیں مرتا جبکہ مادہ اور اس کی مختلف شکلیں ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتیں اس وجہ سے جب مادہ فنا ہوگا تو اس کے بارے میں علم کی بھی کوئی حیثیت نہ رہے گی۔ جبکہ وحی کا علم ابدی ہے اور اس کے بارے میں جاننے والا ابدی علوم جاننے والا ہے۔

مثال:

دو آدمیوں کو حکومت نے اپنے خرچ پر آکسفورڈ پڑھنے کے لیے بھیجا ایک نے معاشیات میں پی ایچ ڈی کی دوسرے نے چیونٹیوں پر ریسرچ پیپر لکھا اسے بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی، اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن آئے اور دونوں نے نوکری کی تلاش شروع کی، پہلے والے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا بہت سے انڈسٹری ہولڈرز نے خواہش ظاہر کی کہ آپ ہمارے پاس ملازمت کر لیں اس کا اچھا معاوضہ دیں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کی تعلیمی قابلیت سے انڈسٹری کی انکم میں اضافہ ہوگا، اس کا علم ہمارے مقصد کے حصول میں معاون بنے گا۔

جبکہ دوسرا آدمی جو اسی یونیورسٹی سے P.H.D کر کے آیا ہے اس کو اس طرح کی کوئی آفر نہیں کی گئی بلکہ دوستوں عزیزوں کے طعنے بھی سننے پڑیں گے کہ تم کو کیا سوجھی جو تم نے چیونٹیوں کے بارے میں تحقیق شروع کی تھی۔ تم نے حکومت کا پیسہ بھی برباد کیا، باوجود معلومات کے اس کے علم کے دام نہیں لگائے گئے۔ کیونکہ موجودہ حالات میں اس کی معلومات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کچھ عرصے بعد چند ملکوں میں یہ خبر پھیلنا شروع ہوئی کہ ان کے افرادرات کو بالکل صحیح ہشاش بشاش سوتے ہیں مگر صبح کو وہ وہاں نہیں ہوتے صرف بستر پر خون ہوتا ہے۔

ایسی ہی چند خبریں دیگر ممالک میں بھی پھیلنا شروع ہو گئیں چند ہی دنوں میں یہ

ایک عالمی مسئلہ بن گیا، رات سوتے سوتے افراد غائب ہو جاتے ہیں اوران کے بستر پر صرف خون رہ جاتا ہےان کا بدن پگھل جاتا ہے جیسا کہ برف پگھل جاتی ہے، انسان اس طرح پگھل جاتے ہیں کہ صرف خون رہ جاتا ہے۔سارے ڈاکٹر حضرات سر جوڑ کر بیٹھے مگر بات کچھ سمجھ نہیں آئی تو ماہرین حیوانات نے ایک مقالہ پیش کیا کہ انسانوں کی ایسی حالت اوراس خاص بیماری کے بارے میں اس بندے نے پیشین گوئی کی تھی جس نے چیونٹیوں کے بارے میں مقالہ لکھا تھا۔

تو ایک دم وہ نا معلوم شہری ہیرو بن کرا بھرے گا اوراس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا حالانکہ اس نے کئی اخباروں اوررسالوں میں اس طرح کی پیشن گوئی کی تھی کہ جس طرح دنیا کے ماحول میں آلودگی بڑھ رہی ہے اس آلودگی سے چیونٹیوں کی ایک خاص قسم (active) متحرک ہورہی ہے، ہوسکتا ہے آئندہ چند سالوں میں وہ اتنی فعال ہو جائے کہ جب وہ کسی انسان کو کاٹے گی تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ انسان پگھلنا شروع ہو جائے گا۔اس بیماری کے اسباب و وجوہات یہ ہیں، اس کے روکنے کے اقدام اس نوعیت کے ہونے چاہئیں اس بیماری سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے ۔الغرض اس بیماری کے متعلق تفصیل جاننے والا یہی شخص ہےتو ایسے حالات میں چیونٹیوں پر ریسرچ کرنے والے کی قدر واہمیت ہوگی اس کے مقابلے میں دیگر علوم کے حامل افراد کواس کے برابر درجہ نہ دیا جائے گا۔ یادرہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کو پہلے طعنے دیئے جاتے تھے کہ تم نے حکومت کا پیسہ بھی خرچ کیا مگر حاصل بھی کچھ نہ کر کے آئے۔

اس مثال کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کومختلف حالات میں مختلف مادوں سے واسطہ پڑتا ہےایک حالت میں وہ کسی مادی چیز کواہم سمجھتا ہےمثلاً دولت کواہم سمجھتا ہےتو دوسری حالت میں دولت بھی اس کے لیے بے معنی حیثیت رکھتی ہے وہ سب سے اہم اپنے وجود کی صحت و بقاء کوخیال کرتا ہے۔

الغرض جب ایک مادے سے واسطہ تھا تو اس مادے کے متعلق جاننے والے علم

والے متصور ہوئے ان کی قدر کی گئی پھر دوسرے مادے کو اہم سمجھا گیا تو اس کے بارے میں جاننے والے کی قدر ہوئی۔ پہلے والے غیر اہم ہو گئے ان کا علم بھی غیر اہم ہو گیا اس طرح مادے بدلتے رہتے ہیں تو ان کے بارے میں علم والوں کی حیثیت میں بھی فرق آئے گا کوئی بھی علم ازلی وابدی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کوئی بھی مادہ ازلی وابدی نہیں ہوتا لیکن خدا ازل سے ہے ابد تک رہے گا اس لیے اس کے ارادے کا علم بھی ازل سے ابد تک علم رہے گا۔ خدا پر موت نہیں آسکتی تو اس کے بارے میں علم، اس کی رضا و ناراضگی کا علم بھی کبھی بے معنی نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ علوم شریعت کا موازنہ کسی بھی دوسرے علم سے کرے کیونکہ علوم وحی کے علاوہ اس کائنات کا کوئی بھی علم نہ ازلی ہے نہ ابدی ہے اور نہ ہی حقیقی ہے۔ نہ سائنس نہ لاء آف فزکس نہ کوئی اور شے۔

اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کیا ہے، اس کے احکام و مسائل کیا ہیں، کیوں ہیں۔ اور دین کے بارے میں مکمل علم قرآن وسنت سے ہی اخذ کریں گے اور اس کا حسن وقبح اسی سے جانیں گے اس کی علتیں بھی اسی سے نکالیں گے کسی دوسرے علم کی یہ شان نہیں کہ اپنے منہاج میں رہتے ہوئے اسلام کے کسی مسئلے کے بارے میں حسن یا قبح کی رائے قائم کرے۔

اسلامی علمیت یا احکام ومسائل کی آفاقی دلیل:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام ہی سے بتایا جائے کہ یہ کیا ہے؟ اس میں کیا خوبیاں ہیں کیا فوائد ہیں اس کے حق ہونے پر کیا دلیل ہے۔ قرآن وسنت سے ہی اپنے موقف کی وضاحت کی جائے کسی مسئلے پر اگر دلیل طلب کی جائے تو اس کا جواب بھی صرف قرآن وسنت سے ہی دیا جائے۔ دیگر علوم کا سہارا نہ لیا جائے دیگر علوم کے منہاج پر اسلام کو نہ پرکھا جائے، قرآن وسنت کے علاوہ کسی دوسری چیز کو اسلام کے لیے بیساکھی نہ بنایا جائے یہ اپنے جواز کی دلیل اپنے اندر خود رکھتا ہے۔

تو اس مؤقف پر عوام وخواص کی طرف سے بڑی شدت کے ساتھ ایک سوال اٹھایا جاتا

ہے کہ ہم یہ طرزِ عمل مسلمانوں کے لیے اختیار کر سکتے ہیں کہ ان کو دلیل قرآن وسنت کے منہاج پر دیں لیکن جو آدمی نہ قرآن کو مانتا ہے نہ سنت کے حق ہونے پر یقین رکھتا ہے تو اس کو منوانے کے لیے دلیل ایسی ہونی چاہیے جس کو وہ خود مانتا ہو جب ہم اس طریقہ اور منہاج پر اتر کر دلیل دیں گے تو عالمِ کفر اس کو تسلیم کر لے گا۔ چونکہ عصرِ حاضر میں سائنس ایک ایسا منہاج ہے جس کے مبینہ اصولوں سے کوئی بھی قوم یا اہلِ مذہب روگردانی نہیں کرتے بلکہ اس کے اصولوں کو مسلمہ اصول کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ جب کسی بھی چیز پر دلیل سائنس کے اصولوں کے مطابق دی جاتی ہے تو اس شے کو رد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ سائنسی علم ایک آفاقی علم ہے اس کا منہاج آفاقی سطح پر تسلیم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسلام کے حق ہونے پر جب آفاقی نوعیت کی دلیل دی جائے گی یعنی سائنس کی روشنی میں اس کی حقانیت ثابت کی جائے گی تو عالم کفر اسلام کی حقانیت سے منہ نہ موڑ سکے گا۔ اس لیے اسلام اور سائنس کو ہم آہنگ کر کے پیش کرنا دین اسلام کی بہت بڑی خدمت سمجھا جاتا ہے۔

اس سوال کے جواب سے قبل یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ ہم سے پہلے عیسائیت اس طرح کا تجربہ کر چکی ہے مذہب عیسائیت جس کی بنیاد وحی پر تھی اس کو فلسفہ یونان اور قدیم سائنسی مسلمات کے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا تھا جب فلسفہ یونان اور قدیم سائنسی مسلمات مرور زمانہ کی بدولت اپنی حیثیت کھو بیٹھے تو ان کی بنیاد پر کھڑا کیا ہوا دین بھی متزلزل ہو گیا۔

اُس وقت کی آفاقی دلیل فلسفہ یونان اور قدیم سائنس کو تصور کیا جاتا تھا اور آج کے دور میں فلسفہ جدید اور سوشل سائنس کو آفاقی دلیل سمجھا جاتا ہے اور آئندہ آنے والے زمانے میں نامعلوم کس چیز کو آفاقی دلیل سمجھا جائے۔

الغرض اگر سائنٹیفک میتھڈ سے کسی مسئلہ دین کو ثابت بھی کریں تو فائدہ کس کو ہوگا؟ سائنسی منہاج کو یا دین کو؟ جب آپ نے اولاً اپنا منہاج ہی چھوڑ دیا بلکہ مدمقابل کے منہاج کو کسوٹی مان لیا تو جھگڑا باقی کیا رہ جاتا ہے، اسلام اور کفر کا جھگڑا صرف اسی بات کا ہی تو ہے کہ اسلام کہتا ہے، غلط کیا ہے، صحیح کیا ہے، اس کے بارے میں رب فیصلہ کرے گا قرآن

جس کو غلط بتائے ہم اسے غلط سمجھتے ہیں وہ جسے صحیح بتلائے ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں ہمارا منہاج، کسوٹی دینِ اسلام ہے یعنی قرآن وسنت ہے جبکہ عالم کفر وہ اس دین کو یعنی قرآن وسنت کو منہاج ماننے کے لیے تیار نہیں اس لیے اسلام ان کو الگ ملت قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو ایک الگ ملت قرار دیتا ہے۔ کفر کی کئی شکلیں ہیں، ہر شکل اپنا کوئی خاص منہاج اور کسوٹی بتاتی ہے جو قرآن وسنت کے علاوہ ہے۔

مثلاً عیسائی ____ کہتے ہیں کہ ہم صحیح وغلط کے بارے میں، نفع اور نقصان والی چیزوں کے بارے میں بائبل سے جانیں گے۔

ہندو ________ کہتے ہیں کہ ہم صحیح وغلط اور نفع ونقصان والی چیزوں کے بارے میں جانیں گے اپنی مذہبی کتابوں سے۔

سکھ ________ کہتے ہیں کہ ہم گرنتھ سے جانیں گے صحیح کیا ہے غلط کیا ہے نفع ونقصان کس سے ہے۔

سول سوسائٹی ____ کہتی ہے ہم صحیح اور غلط کے بارے میں معلوم کریں گے سائنٹیفک میتھڈ سے یعنی انسانی کوشش کے نتیجے میں سمجھ میں آنے والی بات ہی ہم تسلیم کریں گے۔ حق اور ناحق کے بارے میں جاننے کا منہاج ہمارے پاس بائبل، گرنتھ، یا قرآن نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے کسوٹی اور منہاج سائنس ہے۔

ماقبل سوال کا جواب حاصل کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہوگا اگر کوئی آدمی دین کے کسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے اپنے منہاج، کسوٹی کو ہی ترک کر دیتا ہے اور کفر کے منہاج اور کسوٹی پر اُتر آتا ہے تو کفر کا مقصد تو پورا ہو گیا۔

قرآن وسنت کو معیارِ حق وباطل یا خیر وشر کی کسوٹی ماننے سے جب ایک مسلمان دست بردار ہو گیا تو پھر کس چیز کے ثابت کرنے پر زور لگا رہا ہے۔ ساری اسلامی علمیت مسائل واحکام اسی بنیاد پر تو کھڑے تھے کہ مسلمان معیارِ حق وباطل اور خیر وشر کے بارے میں جاننے کی کسوٹی صرف اور صرف قرآن وسنت کو سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام طریقے جو

کفر نے صحیح و غلط کو جاننے کیلئے بنا رکھے ہیں یا خیر و شر کو پرکھنے کی کسوٹی بنا رکھی ہے یہ سب باطل ہیں وہ بائبل ہو گرنتھ ہو یا وید ہو یا پھر سائنٹیفک میتھڈ۔

اصل جواب یہ ہے کہ اس کائنات میں کسی بھی چیز پر آفاقی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی۔ نہ کفر پر نہ اسلام پر نہ ہی کسی تیسرے نظریے پر۔ انسان اپنے مابعد الطبعیات کے تناظر میں دلیل قائم کرتا ہے زمان اور مکان کے اندر رہ کر سوچتا ہے، دلیل اس جیسی مابعد الطبعیات (عقائد) رکھنے والوں کے لیے یا اس زمان و مکاں (تاریخی تناظر) میں تو کارآمد ہو گی تاریخی تناظر و مابعد الطبعیاتی تناظر کے بدل جانے سے ہر دلیل بے وقعت ہو جاتی ہے اس لئے کوئی بھی دلیل آفاقی نہ ہو سکے گی۔

مغربی یلغار کا ہدف

عصرِ حاضر میں غلبہ اسلام کی تمام تر کوششیں مبارک ہیں اور اس دور کی ہماوقتی اور آفاقی ضرورت بھی ہے۔ غلبہ اسلام کے لئے تبلیغی سرگرمیاں ہوں یا تعلیم و تعلم کے مروجہ ادارے ہوں یا عسکری جدوجہد ہو کسی بھی کوشش کو غیر اہم تصور کرنا غیر دانش مندانہ اندازِ فکر ہے۔ ان تمام کی افادیت کا ایک دائرہ کار ہے اپنے اپنے دائرے میں ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس خاص دائرے سے ماورا ہو کر جب دیکھا جاتا ہے تو ان کاموں کی افادیت غیر تام معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اس مبارک جدوجہد کی افادیت غیر تام نہیں ہوتی بلکہ اس جدوجہد کی حدود نظر سے اوجھل ہوتی ہیں۔

مثلاً ایک یہ تصور کہ احیاء اسلام غلبہ اسلام اور اسلامی اقوام کو منہج نبوت پر گامزن کرنے کے لئے مؤثر طریقہ جہاد ہے یا تبلیغ۔ اگر کوئی یہ بات کہے کہ صرف اور صرف جہاد سے ہی امت اپنے سابقہ منہج پر آ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں تو یہ غلط فکر ہے۔ اسی طرح وہ افراد جو یہ سمجھتے ہیں کہ امت منہج نبوت کے قریب سے قریب تر

صرف اور صرف تبلیغ کے راستہ سے آئے گی کسی عسکری جدو جہد کی ضرورت نہیں ہے یہ بھی غلط اور غیر اسلامی نظر و فکر ہے۔ تبلیغی سرگرمیاں اور عسکری جدو جہد (جہاد) کے دائرے الگ الگ ہیں اور مقصد ایک ہے۔

انسان کی زندگی کے جملہ اعمال چھ قسم کے ہوتے ہیں تین انفرادی نوعیت کے ہیں تین اجتماعی نوعیت کے ہیں۔

انفرادی : 1۔عقائد 2۔عبادات 3۔رسومات

اجتماعی : 4۔معاشرت 5۔معیشت 6 سیاست

انسان کی تمام تر سرگرمیاں انہی چھ اعمال میں سے کسی عمل میں گزرتی ہیں۔ پہلے تین انفرادی ہیں۔ عقائد، عبادت، رسومات (شادی و مرگ پر کیا کرنا ہے)

ایک فرد کیا عقیدہ رکھتا ہے، کیسے عبادت کرتا ہے، شادی کیسے کرتا ہے مندر میں جا کر یا اسلامی طریقہ سے ان تینوں کی اصلاح ہوتی ہے تبلیغ سے۔ اس کی وجہ سے عقائد درست ہوں گے لوگ عبادت کرنے لگیں گے، ایک فرد کی زندگی میں سدھار پیدا ہوگا۔ جب فرداً فرداً اصلاح شروع ہوتی ہے تو معاشرے میں بھی ایک اچھا اثر مرتب ہوتا ہے کہ اس میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو صحیح عقائد والے ہیں۔

<u>دوسرے تین بنیادی کام:</u>

o۔معاشرت o۔معیشت o۔سیاست

<u>1)۔معاشرت:</u>

معاشرتی اقدار اسلامی ہوں لبرل نہ ہوں لوگوں کا اندازِ زندگی اسلامی طرز کا ہو، اس کے علاوہ باقی طرز زندگی کو معاشرے میں چلنے نہ دیا جائے اسلامی اخلاقیات کو ہی پروان چڑھنے دیا جائے۔ غیر اسلامی اخلاقیات (مثلاً کافروں سے محبت و میل جول) کی حوصلہ شکنی کیجائے۔ معاشرے سے فحاشی و عریانی اور تمام غیر اسلامی حرکات کا سدباب کیا جائے۔

2)۔ معیشت:

معیشت اسلامی اصول وضوابط کے مطابق ہو اسلام کے علاوہ کسی اور شخص کی تھیوری قبول نہ کی جائے۔ سود اور جوئے کو مارکیٹ سے ختم کیا جائے۔

3)۔ سیاست:

کفر کی طاقت کو ہیچ کر کے اسلامی حکومت نافذ کرنا۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے تین اعمال معاشرت معیشت و سیاست کی اصلاح اور درستگی جہاد سے ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ انفرادی زندگی کی اصلاح تبلیغ و دعوت سے ہوگی اور اجتماعی معاملات میں اسلامی فکر نافذ کرنے کے لیے اللہ نے اس امت پر جہاد فرض کیا ہے۔

تبلیغ اور جہاد کوئی الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ غلبہ اسلام کی سرگرمیوں کے نام ہیں۔ ایک ابتدائی کوشش ہے جس سے فرد کا عقیدہ، عبادت، رسومات اسلامی ہوتے ہیں دوسری انتہائی سرگرمی ہے جس سے اس علاقے کی معاشرت، سیاست اور معیشت کو اسلام کا پابند کیا جاتا ہے۔

شاید اِسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ذروۃ سنامہ الجھاد '' اسلام کی کوہان جہاد ہے یعنی اجتماعیت پر نفاذ جہاد سے ہوگا اور کفر اسی سے لرزہ براندام ہوگا۔ سیکولرازم، لبرل ازم اور فکر جدید کا مطالعہ کرنے والا طالب علم جانتا ہے کہ سیکولر اور لبرل معاشروں میں کن چیزوں پر وار کیا جاتا ہے۔ انسان کا کوئی بھی مذہب ہو ہندومت ہو یہودی ہو یا عیسائی اسکو عقائد میں مکمل آزادی ہے جیسا بھی عقیدہ رکھیں مسلمان ہوں یا مجوسی عبادت جیسے بھی کریں۔ ائیر پورٹ پر ایک خوبصورت چھوٹی سی مسجد بھی بنائی جاتی ہے اور ساتھ مندر بھی کہ جس میں چاہو عبادت کرلو جیسے چاہو عبادت کرلو۔ اسی طرح رسومات جیسے مرضی ادا کرو کوئی اپنے باپ کی لاش جلانا چاہتا ہے تو حکومتیں اس کو موقع محل فراہم کریں گی اگر دفن کرنا چاہتا ہے تو ان کو قبرستان بنا کر دیئے جائیں گے۔

یعنی انفرادی زندگی میں فرد آزاد ہے، عقیدے کے اعتبار سے بھی عبادت کے لحاظ سے بھی اور رسومات کو بجالانے کے اعتبار سے بھی۔ لیکن اجتماعی زندگی میں سوسائٹی کیسی

ہونی چاہیے، معیشت کیسے کرنی ہے، حکومت قانون سازی کیسے کرے اس میں لبرل ازم، سیکولرازم اپنے تصورعدل کے علاوہ کسی تصورعدل کوتسلیم کرنے کے لئے تیارنہیں ہیں۔سیکولر ولبرل حکومتیں سول سوسائٹی کا قیام چاہتی ہیں اگرکوئی آدمی سول سوسائٹی کے علاوہ کسی اور سوسائٹی کا تصور پیش کرنے کی کوشش کرے مثلاً عورتیں حجاب پہن کر باہرنکلیں شراب کی حرمت، حدود کا نفاذ تو پابندی لگائی جاتی ہے۔ایک خاص طرزِ زندگی جو دیا جارہا ہےاس پر عمل کرواس کی راہ میں جوبھی رکاوٹ بنے گا، اس پر پابندیاں لگائی جائیں گی، اگرپھربھی بازنہ آیاتواس دہشت گرد کے خلاف عسکری کاروائی کی جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ سیکولرازم اورلبرل ازم کا وار ہے انسانوں کی اجتماعی زندگی پر، معاشرت، معیشت، سیاست۔مسلم معاشروں کےعلاوہ باقی معاشروں میں ان کا سکہ بلاکسی رکاوٹ کے چلا بلکہ ایسا عروج ملا کہ صرف ایک صدی میں بہت ساری اقوام نے اپنی ثقافت چھوڑ دی حکومتیں لبرل ہوگئیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے مذاہب میں عقائد، عبادت و رسومات تو تھے مگر احکام معاشرت نظام سیاست اور معاشی اصول نہ تھے ان معاملات میں لوگوں کی رہنمائی مذہب نہیں کرسکتا تھا اورسیکولرازم نے دعویٰ کیا کہ میں مکمل ضابطہ حیات رکھتا ہوں عقائد جو ہیں وہی رکھو۔عبادتیں جیسے مرضی کرو، مردوں کودفناؤ یا جلاؤ اس سے کوئی سروکارنہیں مگرنظام اجتماعی کیسا ہو یہ میں بتاتا ہوں۔اپنی سوسائٹی کوسول سوسائٹی میں تبدیل کردو پھرتم ترقی کی راہ پر چل سکو گے۔اپنی معیشت کوسرمایہ دارانہ روپ دو اپنی حکومت کوجمہوری اقدار پرقائم کرو، پھرمہذب معاشرے بن سکتے ہو۔

دیگراقوام جواجتماعی زندگی کے بارے میں اپنے دین میں کوئی رہنمائی نہ پاتی تھیں اس یلغار میں بہہ گئیں۔صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جوکہ صرف مذہب ہی نہیں بلکہ دین ہے، مکمل ضابطہ حیات کا دعویٰ کرتا ہے۔اس لیے سیکولراورلبرل ازم کا اثر اسلامی معاشرے پر قدرے کم ہوا ہے۔یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ سیکولر ازم اورلبرل ازم کا وار نظام اجتماعی پر ہے۔معاشرت، معیشت اور سیاست کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہیئے؟ اس کے بارے میں سیکولرازم

ایک خاص طرز معاشرت، خاص طرزِ معیشت اور خاص تصور سیاست پیش کرتا ہے۔ جو کہ اپنی اساس و بنیاد کے اعتبار سے اسلامی طرزِ معاشرت، معیشت، سیاست سے بالکل مختلف ہے۔

سیکولرازم، لبرل ازم اپنے ان خاص تصورات کے علاوہ کسی اور تصورِ معاشرت، تصور سیاست، تصور معیشت کو قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہے۔ بلکہ جبراً اقوام عالم پر اپنے خاص ملحدانہ تصورات کو نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور ہر قسم کی ممکنہ رکاوٹ کو کچل دینے کا عزم مصمم رکھتے ہیں۔

ان کی طرف سے مسلم معاشروں میں اپنے خاص تصورات (معیشت، معاشرت، سیاست) کو عروج دینے کے لیے اوران کا جواز پیدا کرنے کے لیے مختلف کوششیں کی گئیں۔

☆۔ مثلاً قانون سازی اس طرح کی جائے جس سے مغربی تصور معاشرت سول سوسائٹی کا ماحول بنے، جیسے حقوق نسواں بل کی منظوری۔

☆۔ اسلامی تعبیرات کی غلط تشریحات کرنا، تعبیر اسلامی ہی رہے مگر اس کو ایسے انداز سے بیان کرنا اور ایسی تشریح پیش کرنا کہ یہ مغربی تصورات کے ہم آہنگ ہو جائے۔ غرضیکہ کہنے کو تو مسلمان ہی رہے مگر جو اجتماعی طرز زندگی مغرب پیش کر رہا ہے فرد اس میں ڈھل جائے اور کوئی علم مخالفت بلند نہ کرے۔

مثلاً شورائی حکومت کی مثال دینا جمہوری حکومت کیلئے اور عوام میں یہ باور کروانا کہ اسلام میں جو شوارئی نظامِ سیاست کا تصور ہے جمہوریت اسی کا ایک عکس ہے۔

☆۔ حقوق انسانی اور حقوق نسواں کے نام پر تحریکیں اٹھانا اوران کی مالی امداد کرنا اور ان کے ذریعے آزادانہ اقدار کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرنا، جس سے روائتی یا اسلامی معاشرہ خود بخود بدل کر سیکولر ہو جائے گا۔ یہ تو اہلِ مغرب کی کوششوں پر ایک اجمالی نظر تھی کہ تمام دنیا انہی تصورات (معاشرت، سیاست، معیشت) کو اپنا لے جو ہم نے ان کے سامنے رکھے ہیں۔ وہ دنیا کی فلاح، ترقی اور بھلائی ان خاص تصورات میں سمجھتے ہیں اور پوری دنیا پر اس کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف امت مسلمہ ہے جو کہ ایک ایسی علمیت کی وارث ہے جس کی مثال پوری کائنات میں نہیں، رب کریم جس علمیت کی برتری کی تصدیق کا اعلان کرتا ہے اور ''ان الدین عند اللہ الاسلام'' کی مہر اس پر ثبت کرتا ہے۔ اسلامی تصورات (سیاست، معیشت، معاشرت) ایک خاص علمیت (وحی الٰہی) سے ثابت ہیں جو کہ اپنی فکر اور اساسی بنیادیں مغربی تصورات سے بالکل جداگانہ رکھتی ہے۔

اسلامی اساس خدا پرستی پر ہے مغربی فکر و فلسفہ کی بنیاد نفس پرستی ہے اسلامی اساس میں علم وحی سے حاصل کیا جاتا ہے جبکہ مغربی فکر و فلسفہ میں حصولِ علم کا ماخذ خود نفسِ انسانی ہے۔ (عقل، وجدان، تجربہ، وغیرہ) جب مغرب کی فکری بنیادیں اور ہیں اور اسلام کی فکری بنیادیں اور تو ان فکری اساسوں اور بنیادوں پر اٹھنے والے مسائل و معاملات بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اگر کسی جگہ مثلاً ایک جیسا معاملہ ہو تو وہ بھی اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ مغربی یلغار سے ہم لوگ کس قدر متاثر ہوئے ہیں اس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں۔

ایک آدمی نماز پڑھنی بھول گیا وہ کسی پادری کے پاس جائے اور کہے کہ مجھے نماز سکھا دو یہ مسئلہ بتا دو، معاشرے میں اس آدمی کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھا جائے گا کہ دین محمد ﷺ پر عمل کرنا چاہتا ہے اور سیکھنے کس سے جا رہا ہے۔ اِسی طرح مسلمان شادی کرنا چاہتا ہے اور مندر میں جا کر ہندوؤں کی طرح چکر لگا کر شادی کی رسم پوری کرتا ہے تو تمام مسلم لوگ اس کو اچھا نہ سمجھیں گے، بلکہ اس کو سختی سے کہا جائے گا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔

انفرادی معاملات میں اس طرح کی ذہنیت اب ایک نظر اجتماعی معاملات میں اسلامی اقدار کی حفاظت پر ڈالتے ہیں۔ کوئی آدمی تجارت کے بارے میں اصول پوچھتا ہے مارکس سے۔ بزنس کن اصولوں پر ہونا چاہیے پوچھتا ہے آدم سمجھ سے۔ کاروبار کیسا کرنا چاہیے یہ پوچھتا ہے اور کسی بے دین سے۔ تو اس میں بالکل بھی عیب یا کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی حالانکہ جس رب نے مسلمان کو نماز کا پابند کیا ہے اسی نے پابند کیا ہے کہ بیع یوں کرنی ہے یوں

نہیں کرنی، سود نہیں لینا وغیرہ۔ اسی طرح نظامِ سیاست ومعاشرت پر نظر ڈالیں تو ہم کسی دوسری قوم کا تیار کردہ نظام بلا کسی تردد کے اختیار کر لیتے ہیں۔ اس بات کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی کہ اسلام میں ایک خاص تصورِ سیاست ہے اس کا نفاذ ہم پر من حیثیت المجموعی فرض ہے، اور یہ اسی رب نے فرض کیا ہے جس نے نماز فرض کی ہے یہ خاص طریقہ سیاست اسی نے سکھایا ہے جس نے مرگ و وفات پر خاص عمل کا پابند کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جب انفرادی معاملات میں مثلاً نماز، روزہ نکاح وغیرہ، میں دینی رہنمائی کسی کافر سے مشرک سے یا بے دین سے لینے کو برا سمجھا جاتا ہے۔ تو اجتماعی معاملات مثلاً معاشرت کے قیام تصورِ سیاست ومعیشت میں غیر مسلم مفکرین کی تھیوری، ملحدانہ افکار کو بلا تردد قبول کیوں کر لیا جاتا ہے؟ بلکہ ان کے لیے اسلام سے دلائل بھی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بلکہ یہ ایک خاص محنت کا اثر ہے کہ عقائد وعبادات ورسومات کو تو لوگ دین سمجھیں مگر سیاست ومعیشت ومعاشرت کو لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیں۔ ان چیزوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ لبرل سیکولر اصولوں سے ان چیزوں کا حل تلاش کر لیا جائے اور لائحہ عمل طے کیا جائے۔ اگر کوئی مسلمان بضد ہو کہ یہ چیزیں اسلامی طریقہ سے ہی ہونی چاہئیں تو ان تصورات اسلام کو اس طرح کر کے پیش کیا جائے کہ مغرب کے ہم آہنگ ہوں۔ صرف اس کے دل کو اطمینان رہے باقی عملاً تمام نظام سیکولرازم اور لبرل ازم کا ہی چلے۔ سیکولرازم اور لبرل ازم کا ہدف نظام اجتماعی ہے یعنی قوموں کی معاشرت ومعیشت اور سیاست انہی کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے، یہ اصول اسی خاص علمیت مغربی فکر وفلسفہ سے اخذ کیے جاتے ہیں۔

عہد جدید کے بعض راسخ العقیدہ اور اکثر جدیدیت پسند مفکرین کے نادر و مضحکہ خیز خیالات

۱۔ اسلام دورِ جدید (modern age) کا خالق ہے مغرب اور اسلام ایک حقیقت کے دو نام ہیں۔

۲۔ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو سائنس کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے کیونکہ اسلام اور سائنس ایک ہی چیز ہیں، ایک تصویر کے دو رُخ، ایک دریا کے دو کنارے، ایک آسمان کے دو ستارے، ایک ہی حقیقت کے دو رنگ ہیں۔ اسی لیے قرآن کی کوئی آیت سائنس کے خلاف نہیں ہوسکتی۔

۳۔ جدید سائنسی ترقی قرآن کی آمد کے بعد ہی ممکن ہوسکی جس نے تجربیت کا سبق دیا، قرآن سے پہلے تاریخ کے تمام معاشرے صرف منطقیت، عقلیت کے پرستار تھے، تجربیت سے دور تھے، قرآن نے تجربی دلائل کے ذریعے علوم کے قافلے کی رفتار کو بڑھا دیا، جدید سائنٹفک میتھڈ کا خالق اسلام ہے۔

۴۔ اسلام ایک سائنٹیفک مذہب ہے اس کا کوئی اصول سائنس سے متصادم نہیں جیسے جیسے سائنس ترقی کررہی ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات کے مفاہیم واضح ہورہے ہیں۔ قرآن قیامت تک کے لیے آیا ہے لہٰذا قیامت تک قرآن کی آیات کے مفاہیم واضح ہوتے رہیں گے۔ رسول اللہ کافۃ للناس ہیں لہٰذا ہر عہد میں قرآن کے مطالب اس

عہد کے اسلوب علمی کے معیار پر پورے اُترتے رہیں گے۔ یہ تصور کرنا کہ قرآن کی آیت کا مطلب وہی ہے جو خیر القرون میں بتایا گیا اس کے سوا دوسرا مطلب ممکن نہیں ٹھیک رویہ نہیں ہے۔ قرآن کے مطالب قیامت تک کھلتے نکھرتے اور بکھرتے رہیں گے۔ عہد حاضر کا مسلمہ متفقہ اسلوب منہاج علمی سائنس ہے لہٰذا قرآن ہر عہد میں سائنس کے ہر معیار پر پُورا اُترے گا۔ سائنس قرآن کو شکست نہیں دے سکتی۔

۵۔ مسلمانوں کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ جیسے ہی کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرے اسے داڑھی رکھوا کر، پگڑی پہنا کر، اونچا پاجامہ بندھوا کر اسے اپنی کمیونٹی کے لیے اجنبی کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی کمیونٹی میں دین کی دعوت پہنچانے کے قابل نہیں رہتا یہ سب کام اچھے ہیں مگر ان کا وقت ٹھیک نہیں ہے۔ مسلمانوں کی قدامت پرستی ہی ان کے دین کی توسیع میں اصل رکاوٹ ہے۔

۶۔ اسلام اور مغرب میں چند چیزوں کے سوا کوئی فرق نہیں، ہماری تمام اخلاقیات، عدل وانصاف، رواداری، دوسروں کا خیال، تحقیق، علم، تدبیر، خدمت خلق وغیرہ جیسی صفات مغرب نے اسلام سے سیکھ لیں اور ہم سے آگے نکل گیا۔ مغرب اگر صرف عریانی اور فحاشی کو ترک کر دے اور کلمہ پڑھ لے تو کافی ہے۔ اسلام اور مغرب میں بس چند ہی اختلافات ہیں۔

۷۔ اسلام کا مقصد تسخیر کائنات تھا۔ مسلمانوں نے یہ کام ترک کر دیا اور وہ تسخیر قلوب انسانی کے چکر میں پڑ گئے۔ سائنسدانوں کی جگہ صوفیا کو عزت دی گئی، سوشل سائنٹسٹوں (social scientist) کی جگہ فقہا کو مقام و مرتبہ دیا گیا لہٰذا اسلام ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اگر ہم ترقی کرتے رہتے تسخیر کائنات پر غلبہ و تسلط حاصل کر کے کائنات کے تمام خزانے مغرب کی طرح اپنے قبضے میں کر لیتے تو مغرب ہمیں کبھی اپنا غلام نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم نے تین براعظموں پر حکومت کی مگر تسخیر کے قرآنی فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہے۔ اس کا صلہ آج پوری امت

بھگت رہی ہے۔

۸۔ مسلمان صدیوں تک تیل کے ذخیروں پر بیٹھے رہے مگر تیل دریافت نہ کر سکے۔ وہ صرف دین پھیلاتے رہے وہ بارہ سو سال تک صرف تلوار چلاتے رہے۔ ایٹم بم نہ بنا سکے ورنہ پوری دنیا ان کی غلام ہوتی۔ جنگ کا اصول یہی ہے کہ اس سے پہلے کہ دشمن تمہیں ختم کر دے تم دشمن کو مٹا دو۔ مٹاتے کیسے تلوار ایٹم بم نہیں بن سکتی۔ وہ تیل دریافت کر لیتے تو دنیا پر ان کی حکومت قائم ہو جاتی، علماء، فقہاء، صوفیاء نے امت کو فقہی شرعی روحانی موشگافیوں میں الجھائے رکھا۔ لہٰذا علوم نقلیہ میں تو زبردست ترقی ہوئی۔ دنیا کی کوئی قوم فقہ احسان تزکیہ نفس احکامات شرعیہ کے سلسلے میں امت مسلمہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر ان علوم کو تمام علوم عقلیہ پر ترجیح دینے کے باعث مسلمانوں کی ترقی رک گئی۔ وہ بچھڑ گئے۔ دنیا کی تمام قوموں سے پیچھے رہ گئے اور اب آگے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔

۹۔ قرآن نے کہا ہے کہ اے ایمان والو تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ یعنی قرآن نعمت ہائے دنیا کو سمیٹ لینے کی اجازت عام دیتا ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کس نے زینت دنیا کی چیزیں تم پر حرام کی ہیں۔ لہٰذا دنیا میں بہترین خوشحال زندگی گزارنا کوئی جرم نہیں بلکہ دین و شریعت کا تقاضا ہے اس معاملے میں امت کو رسالت مآب کی معاشی خانگی زندگی کی پیروی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا مطلب رسالت مآب ﷺ سے انکار یا بغاوت نہیں ہے وہ طرزِ زندگی صرف پیغمبر کے لیے خاص ہے جس طرح پیغمبر کے لیے تہجد فرض ہے، میراث نہیں بنا سکتے۔ ازواج مطہرات کے سوا کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کر سکتے۔ اسی طرح سادگی فقر و فاقہ کی زندگی صرف پیغمبر کے لیے ہے۔ امت کے لیے نہیں ہے کیونکہ قرآن نے عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی اجازت دی ہے۔ قرآن کی نص کے سامنے رسول کا اسوۂ حسنہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا وہ واجب الاتباع نہیں ہے۔ قرآن کی نصوص واجب الاتباع ہیں

لہٰذا بہترین پر تعیش زندگی بسر کرنا قرآن کے فہم دینی کا تقاضا ہے۔ اسلامی ریاست کا کام لوگوں کے معیارِ زندگی میں مسلسل اور مستقل اضافہ ہے۔

۱۰۔ اسلام نے دنیا کو سب سے پہلے جمہوریت کا درس دیا۔ رسول کو حکم دیا گیا کہ آپ صحابہ سے مشورہ کریں۔ یہی جمہوریت کا پہلا سبق تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جمہوری روح کے پیش نظر حضرت ابوبکرؓ کو نامزد نہیں کیا ان کو یقین تھا کہ جمہوریت صحیح طریقے سے کام کرے گی تو جمہور خود ہی حضرت ابوبکرؓ کو منتخب کر لیں گے اور عملاً یہی ہوا اس طرح رسالت مآب دنیا کی پہلی جمہوری ریاست کے بانی ہیں۔ تمام خلفائے راشدین کا انتخاب جمہوریت کے ذریعے ہی ہوا۔ اسلام اور جمہوریت لازم وملزوم ہیں۔ مغرب نے جمہوریت کا سبق اسلام سے لیا ہے مگر وہ آج خود کو جمہوریت کا چمپئن کہتا ہے جو جھوٹ ہے۔ جمہوریت کے اصل بانی رسالت مآب ﷺ ہیں۔ ہم نے دنیا کو سب سے پہلے جمہوریت کی روشنی دکھائی۔ رسالت مآب ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی نامزدگی مسترد کر کے جمہوریت کی شمع روشن کی جو آج تک روشن ہے۔ بلکہ اس کی روشنی عالمگیر ہو گئی ہے اور اقوام متحدہ بھی اسی روشنی میں تمام جمہوری فیصلے کر رہی ہے لیکن کیا رسول اللہ ﷺ جمہوری طریقے سے حکمران منتخب ہوئے تھے۔ کیا ان کے کسی فیصلے سے کوئی اختلاف کر سکتا تھا۔ کیا رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی کو حزب اختلاف بنانے کی، رسول کے فیصلوں، احکامات، ہدایات پر تنقید کرنے، رسول کے خلاف جلسہ کرنے، جلوس نکالنے، کارٹون بنانے، مذاق اُڑانے کی آزادی تھی، کیا خلافت راشدہ میں یہ آزادی حاصل تھی۔ ظاہر ہے نہیں مگر یہ رسالت کا اختصاص ہے رسول کے لیے جمہوریت ضروری نہیں۔ ان کی امت اور اخلاف کے لیے جمہوریت لازم ہے۔ نامزدگی یا خاندان سے خلیفہ کا انتخاب قرآن وسنت اور تعامل امت کے منشاء کے خلاف عمل ہے۔ ماضی میں جو ہوا وہ تدریج کا تقاضا تھا۔ اب صرف جمہوریت سے ہی خلیفہ کا تقرر ہوگا۔ اس پر اجماع امت ہے۔

۱۱۔ اسلام نے پندرہ سو سال پہلے سب سے پہلے عورت کے حقوق دیئے جائیداد کا حق میراث کا حق ذاتی ملکیت کا حق، کاروبار، نوکری کا حق، مہر کا حق، جو مرد اس کی اجازت کے بغیر ہرگز استعمال نہیں کرسکتا۔ عورت کمانے کے لیے گھر سے باہر جاسکتی ہے۔ اسلام اس کے نوکری اور کاروبار کے حق کو تسلیم کرتا ہے جو کچھ وہ کمائے وہ اسی کا ہے۔ کوئی اسے محروم نہیں کرسکتا۔ عورت کی مرضی کے بغیر شادی نہیں ہوسکتی۔ یہ اس کا حق ہے۔ عورت اپنی مرضی سے شادی کرنے میں آزاد ہے۔ منشور بنیادی حقوق تو اٹھارہویں صدی میں لکھا گیا ہے۔ اسلام اس سے پہلے ہی عورت کو وہ بے مثال آزادی دے چکا ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ منشور بنیادی حقوق اصلاً خطبہ حجۃ الوداع کا چربہ ہے۔ یہ تمام حقوق اسی منشور سے لیے گئے ہیں اور اب مغرب اس منشور کا خالق بن کر دنیا بھر سے داد سمیٹ رہا ہے۔ حالانکہ اس منشور کے اصل خالق مسلمان ہیں یعنی خطبہ حجۃ الوداع۔

۱۲۔ اسلام نے دنیا کے انسانوں کو سب سے پہلے آزادی دی۔ اسلام نے انسانوں کو جو آزادی دی ہے وہ دنیا کا کوئی مذہب اور قانون نہیں دے سکتا۔ عورت کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ آزادی اسلام میں دی گئی۔ اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں کرسکتی۔ لہٰذا اسلام ہی عورت و مرد کی آزادی کا سب سے بڑا محافظ اور نگہبان ہے اسلام اور آزادی لازم و ملزوم ہیں۔

۱۳۔ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی امت جو فخر کے قابل ہو، جو دینی تعلیم و تربیت اخلاق فاضلہ سے مزین ہو، جس کے اعمال فخر کے طور پر پیش کیے جاسکیں۔ مگر امت نے اس حدیث کا مطلب صرف یہ لیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچے صبح و شام پیدا کرتے چلے جانا۔ اسی لیے یورپی لوگ مسلمانوں پر پھبتی کستے ہیں کہ یہ قوم چوہوں کی طرح اپنی نسلیں بڑھا رہی ہے تاکہ عددی اعتبار سے یورپی قوموں کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ چوہوں کی طرح نسلیں پیدا کرنے کے باعث نہ ان کی تعلیم و تربیت ممکن ہے۔ نہ

اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، نہ ان کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے، نہ اچھے کپڑے، نہ اچھی رہائش، ان کو پیدا کرنے والی عورتوں کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی۔ اس لیے اکثر مسلمان دہشت گرد تنظیموں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اچھے معیارِ زندگی نوکری کے لیے وہ مجاہد بن جاتے ہین۔ ایسی بیمار، بے کار، غیر تعلیم یافتہ نسلیں پیدا کر کے ہم رسالت مآب ﷺ کی حدیث پر عمل نہیں کر رہے بلکہ حدیث کی روح کا انکار کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو فخر ہے کہ ان کی آبادی دنیا میں تیزی سے بڑھ رہی ہے مگر یہ بڑھتی ہوئی بے کار آبادی کسی کام کی نہیں۔

۱۳۔ مغرب کے پاس جو کچھ بھی اچھائی اور خیر ہے وہ مغرب نے اسلام سے لی ہے۔ مغرب نے قرآن سے علم، تحقیق، تجزیہ اور تجربہ استقراء کا طریقہ سیکھا۔ یہ سائنس اسے اندلس سے ورثے میں ملی۔ راجز بیکن اندلس سے پڑھ کر آیا تھا۔ مغرب کے تمام بڑے لوگ اندلس کی سائنسی ترقی سے متاثر تھے۔ مسلمانوں کی ترقی رک گئی مگر یورپ نے اس ترقی کو بڑھا دیا اور ہم سے آگے نکل گیا۔ اگر اندلس نہ ہوتا تو مغرب آج اس مقام پر نہ ہوتا۔ ہم اپنا سبق بھول گئے۔ مغرب نے ہمارے بھولے ہوئے سبق کو یاد رکھا اور دنیا پر چھا گیا۔ مغرب کی سائنس ٹیکنالوجی اس کی نہیں اسلام کا عطیہ ہے۔ یہ ہماری متاعِ گمشدہ ہے۔ اس کو مغرب سے چھیننا ہے تاکہ مسلمان دوبارہ اس دنیا پر غلبہ حاصل کر سکیں۔ جب تک مسلمان اپنی متاع میراث مغرب سے واپس نہیں لیں گے دین کو غلبہ عطا نہ ہوگا۔ خواہ یہ علم چوری کیا جائے یا باقاعدہ حاصل کیا جائے، خفیہ طریقے سے یا پیسے دے کر خریدا جائے یا رشوت کے ذریعے لیا جائے۔ ہم نے مغرب کو سائنس فراخ دلی سے دی وہ ہمیں ہماری چیز لوٹانے میں بخل سے کام لے رہا ہے۔ لہٰذا اس کا حصول کسی بھی طریقے سے ہمارے لیے جائز ہے۔ حالت اضطرار میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ لہٰذا امت کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس سائنس وٹیکنالوجی کو ہر قیمت پر کسی طرح مغرب سے حاصل کریں۔ اس کے بغیر اس امت کا احیاء تسلط اور غلبہ دنیا پر ممکن ہی نہیں ہے۔

۱۴۔ عیسائیت کو مغرب میں شکست اس لیے ہوئی کہ عیسائیت کا مذہب سائنس کے ساتھ نہیں چل سکا۔ عیسائیت نے سائنس سے دشمنی کی کیوں کہ اس کی تعلیمات سائنس کی عظمت نہ پہچان سکیں۔ انجیل محرف و بے لچک تھی لہٰذا جدید علوم عقلیہ کو قبول نہ کر سکی۔ لہٰذا پوپ اور چرچ سائنس اور سائنسدانوں کے خلاف ہو گئے۔ عیسائی مذہب، عقلیت، تجربیت، فلسفے کے بھی خلاف تھا۔ ان کے پاس کوئی علمی روایت نہ تھی۔ پوپ کا حکم حرفِ آخر ہوتا تھا۔ وہ اپنے سوا کسی کی بات نہ مانتا تھا۔ پوپ نے بڑے بڑے سائنسدانوں کو مذہبی بنیاد پر پھانسی دی۔ سائنس دشمنی کے باعث لوگ پوپ کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے کلیسا کو شکست دے دی۔ اسلام کا تجربہ اس سے مختلف تھا۔ اسلام نے ہمیشہ سائنس سے مطابقت پیدا کی۔ سائنس اور اسلام میں کبھی تصادم نہیں ہوا۔ اس لیے اسلام محفوظ رہا۔

۱۵۔ قرآن نے اصول استخراج واستقراء سے دنیا کو روشناس کرایا تجربیت کے ساتھ اسلام نے عقلیت پر بھی زور دیا۔ یہ کام مغرب میں کانٹ نے کیا۔ اس نے تجربیت وعقلیت کے ملاپ سے جدید فلسفہ ایجاد کیا۔ جس نے عظیم سائنسی ترقی کو ممکن بنا کر سائنس کے علم اور سائنٹیفک میتھڈ کو اصل العلوم قرار دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن کانٹ سے پہلے یہی کام قرآن اور مسلمانوں نے کیا۔ اس طرح دنیا کو ترقی کا راستہ دکھایا۔ مسلمان دنیا کو یہ اسباق دینے کے بعد خود تصوف، فقہ، شریعت کی وادی میں گم ہو گئے اور ان کی ریاست بھی اس لیے ختم ہو گئی۔ فقہی مکاتبِ فکر نے جمود کا راستہ ہموار کیا۔ تقلید نے تباہی پیدا کی کتابوں پر حاشیے اور حاشیوں کے حاشیے لکھنے کا رواج ہوا۔ اپنے سوا سب باطل قرار پائے۔ جمود نے اجتہاد کا دروازہ بند کیا۔ اجتہاد ختم ہونے سے امت کے عروج کے تمام راستے بند ہو گئے۔ جب تک امت تحقیق واجتہاد کرتی رہی۔ علم کی شمع روشن رہی، سائنس و ٹیکنالوجی میں مسلمان آگے رہے کوئی ہمیں شکست نہیں دے سکا۔ علم و تحقیق سائنس اور اجتہاد مترادف اصطلاحات ہیں۔ امت نے اجتہاد کو صرف دینی امور تک محدود کر دیا اور اس میدان میں بھی اجتہاد نہیں کیا۔ اجتہاد کے بارے میں علماء کی تنگ نظری نے انہیں تباہ

کیا اور اس کے باعث ملت تباہ ہوگئی۔

۱۶۔ ہمیں روایتی اسلام کی نہیں پروگریسو، روادار حقیقی اصلی اسلام قرن اول کے معیار والا غیر متعصب وسیع النظر اسلام کی ضرورت ہے جس کی روح قدیم ہو لیکن قالب جدید۔ جس کا جوہر پرانا ہو مگر جس کا ظاہر بالکل نیا ہو۔ جس کے مقاصد قدیم مگر جس کے اظہار کے طریقے نئے ہوں جو جدید و قدیم کا جامع ہو، جو دنیا و دین کا آمیزہ ہو جو دین میں پیغمبروں کے طرزِ عمل کو اختیار کرے اور دنیا کے امور میں فرعون جیسی شان و شوکت کا علمبردار ہو۔ دین کا غلبہ عہدِ حاضر میں اسی ذریعے سے ممکن ہے۔ مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اسلام کو پبلک لاء کی بجائے پرائیویٹ زندگی تک محدود کرلیں تاکہ مذہب کی بندش اور پابندیاں ان کی ترقی میں رکاوٹ نہ ڈالیں جب ریاست کے مذہبی قوانین حلال و حرام، صحیح و غلط کا تعین کرتے ہیں تو سرمایہ کارکارخانے نہیں لگاتے ترقی کی رفتار رک جاتی ہے۔ بیرونی سرمایہ کار سرمایہ نہیں لاتے معیشت سست ہوجاتی ہے کیونکہ پبلک لاء میں مذہب کو لانے سے سرمایہ کاری میں زبردست رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً پاکستان کے شمالی علاقے جو روئے زمین پر وسائل کے لحاظ سے جنت ہیں۔ وہاں سیاحت اس لیے نہیں ہوسکتی کہ لوگ مغرب کے بعد سو جاتے ہیں اپنی عورتوں کو سیاحت کی صنعت میں خدمت کرنے، سیاحوں کا دل لبھا کر پیسہ کمانے کے لیے بھی بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ مذہب آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ پیسہ پیشے سے ملتا ہے۔ عہد حاضر میں ہر پیشہ جائز ہے کیونکہ حدیث کے مطابق سود کا غبار ہر نتھنے تک پہنچ رہا ہے۔ حدیث کے مطابق مسجد میں ساز کی آواز بج رہی ہے۔ لہٰذا ممنوعات سے گریز تو عملاً ممکن نہیں رہا لہٰذا مجبوراً تمام پیشے تقریباً جائز ہو گئے ہیں۔ سیاح سیر و تفریح لطف اُٹھانے کے لیے آتے ہیں۔ عورت کے بغیر سیاحت کیسے چل سکتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں کھیل کے عالمی سالانہ مقابلے ہوئے تو عورتوں کو عصمت فروشی کی اجازت ایک ہفتے کے لیے دی گئی تاکہ ملکی آمدنی میں اضافہ ہو ویسے وہاں

عصمت فروشی جرم ہے۔ قومی ترقی کے لیے استثنا دیا گیا ہے۔ یہ قانون ہر مذہب میں ہوتا ہے۔ حالت اضطرار میں سور بھی تو حلال ہو جاتا ہے۔ دقیانوسی رسوم عورت کی حیاء، مرد کی بالا دستی اور قدامت پرستی کے باعث ان کی معاشی حیثیت کمزور رہتی ہے۔ سب غربت میں گرفتار رہتے ہیں جو کچھ مل گیا اس پر قناعت کرتے ہیں۔ تقدیر پر راضی رہنے کے باعث یہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کے بڑے بڑے خاندان کئی کئی بچے ان کی معاشی ترقی میں اصل رکاوٹ ہیں۔ جتنے کم بچے جتنا چھوٹا خاندان ہوگا اللہ کی رحمت اتنی زیادہ ہوگی زیادہ معاشی ترقی ہوگی۔ زیادہ تمتع کر سکیں گے اچھی تعلیم دلا سکیں گے۔ ترقی نہ ہونے سے GNP،GDP میں اضافہ نہیں ہوسکتا، export نہیں بڑھ سکتی، سیاح نہیں آسکتے، ٹیکس نہیں مل سکتا۔ فارن ایکسچینج نہیں آسکتا یہ سب پابندیاں ہٹ جائیں تو اتنا سرمایہ ملے گا کہ اس خطے کے لوگوں کی معاشی زندگی بالکل بدل جائے گی۔ اسی طرح سوات، بلوچستان وغیرہ کے علاقوں میں اعلیٰ سیب، انگور پیدا ہوتا ہے وہاں غیر ملکی کمپنیوں کو شراب بنانے کی اجازت دے دیں یہ شراب فرانس یا یورپ جائے گی۔ مقامی لوگوں کو ایک قطرہ بھی نہیں ملے گا۔ ملازمین بھی غیر ملکی ہوں گے۔ صرف زمین انگور سیب مقامی ہوں گے۔ ملک کی معاشی ترقی بڑھ جائے گی لیکن مذہب کی قدامت پرستی قدم قدم پر سرمایہ کاری کی راہ میں سرمایے کے اضافے میں صنعتی و معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا کر کے پاکستان کو پیچھے کرتی جا رہی ہے۔ سور، چھپکلی، کتے پاکستانی نہیں کھاتے، لاکھوں کی تعداد میں یہ جانور مارے مارے پھرتے ہیں اور شہروں دیہاتوں کا امن وسکون تباہ کرتے ہیں۔ انہیں مار کر سکون بھی ملے گا اور ہم کھانے والوں کو یہ جانور ایکسپورٹ کر کے فارن ایکسچینج تو کما سکتے ہیں لیکن مسلمان نہ تو خود سور کھاتے، نہ شراب پیتے نہ دوسرے کو کھانے پینے دیتے ہیں۔ ان میں رواداری (Tolerance) نہیں ہے، وہ اپنے سوا، اپنے دین کے سوا، اپنی روایات کے سوا کسی کو درست نہیں سمجھتے، وہ خبط عظمت میں مبتلا ہیں اسلام پرستی میں گرفتار ہیں۔ وہ زمانے کی رفتار کا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔

زمانے کے ساتھ چلنے کی بجائے زمانے کو اپنے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ یہی ان کا دنیا اور آخرت میں تباہی کا اصل سبب ہے۔ دنیا میں بھی نکھٹو رہیں گے اور آخرت میں بھی ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ جو دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا وہ آخرت میں کیا کر سکے گا۔

۱۷۔ امام غزالی وغیرہ نے دین کو صرف پانچ مقاصد شریعہ تک محدود کر کے اس زمانے کے مطابق دین کی تشریح کی۔ یہ تشریح ان کے زمانے کے لیے درست تھی۔ امام غزالی نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں نے جو کہا ہے وہ حتمی قطعی آخری رائے ہے۔ امت نے خواہ مخواہ جمود اختیار کرلیا ہے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ لہٰذا مقاصد شریعہ کی فہرست ناکافی ہے۔ ہمارے زمانے کے مطابق نہیں ہے۔ لہٰذا مقاصد شریعہ میں اضافہ لازمی ہے۔ جدید زندگی جدید تقاضے لا رہی ہے۔ لہٰذا ان تقاضوں کے مطابق دین کے جوہر کو برقرار رکھتے ہوئے دنیا کے حل پیش کرنا اہلِ دین کی ذمہ داری ہے۔

۱۸۔ جو لوگ مقاصد شریعت کی فہرست میں اضافے کو بدعت سمجھتے ہیں اور عصری تقاضوں کو پہچاننے سے قاصر ہیں ایسے ہی لوگ دین کے غلبے وعروج کی راہ میں اصل رکاوٹ ہیں۔ جدید عہد کا تقاضا ہے کہ آزادی، مساوات، جمہوریت، ترقی کو مقاصد شریعت کی فہرست میں شامل کیا جائے تسخیر کائنات کا بھی اضافہ کیا جائے۔ اعلیٰ معیار زندگی، عورت کی تعلیم، عورت کی نوکری، روزگار، کاروبار وغیرہ وغیرہ کو بھی جدید فہرست میں داخل کرنا چاہیے۔

۱۹۔ قرآن کی تفسیر لکھتے ہوئے اور فقہ کی کتابیں مرتب کرتے ہوئے ان میں غلام و لونڈی کے مسائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ غلام لونڈی اب ختم ہو چکے ہیں۔ اسلام نے غلامی کا خاتمہ کر دیا ہے اور وہ دنیا کو آزادی دینے کے لیے آیا تھا۔ لہٰذا آزادی کے بعد غلام لونڈی کا کیا سوال؟ لہٰذا مدارس میں بھی ان موضوعات کو پڑھا کر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب غلامی کا زمانہ واپس نہیں آ سکتا۔ جب زمانہ ہی ختم ہو گیا تو اس کا علم دینے کی کیا ضرورت ہے۔ جدید فقہی

کتب سے ان مسائل کو خارج کر دیا جائے اسی طرح دیگر احکامات جو زمانہ کے بدلنے سے اب بدل گئے ہیں یا جن پر عمل ممکن نہیں رہا۔ ان پر فقہی مباحث پڑھانے اور کتابوں میں شامل کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ وقت کا زیاں ہے اس کے بجائے علماء کو جدید مباحث پڑھنے چاہئیں۔

۲۰۔ یورپ میں کیتھولک ازم اور پروٹسٹنٹ ازم کے مابین لڑائیوں، خانہ جنگیوں، قتل وخون کے باعث مستقل بدامنی تھی، لبرل ازم آیا تو اس نے مذہبی مسائل حل کر دیئے۔ اب یورپ میں کوئی مذہبی بنیادوں پر نہیں لڑتا۔ سب لوگ مستقل مذہب رکھنے کے باوجود روادار ہو گئے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو مساوی سمجھتے ہیں۔ سب اپنے اپنے تصور خیر کو دوسرے کے تصور خیر کے مساوی سمجھتے ہیں۔ اپنے خیر کو دوسرے پر برتر فائق نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اختلافات نہیں پیدا ہوتے۔ سب امن وامان سے رہ رہے ہیں۔ اب پاکستان میں تمام فرقہ وارانہ تنازعات کی اصل وجہ یہ مذہبیت ہے۔ اس کے خاتمے کے بغیر ملک میں امن وامان قائم نہیں ہوسکتا۔ امن نہ ہو تو ترقی نہیں ہوسکتی لہٰذا مذہبی جھگڑے ختم کیے بغیر مذہبی تشدد پسندی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

۲۱۔ اسلام میں لونڈی کے لیے پردے کی کوئی پابندی نہیں مگر آزاد عورت کے لیے حجاب کی پابندی ہے اسلام میں لونڈی زیادہ آزاد ہے اور آزاد عورت بے چاری بالکل پابند۔ لونڈی کے لیے آدھی سزا ہے اور آزاد عورت کے لیے پوری سزا۔ لونڈی کے لیے رجم نہیں ہے۔ آزاد عورت رجم کی جاسکتی ہے۔ اسلام ایک جانب مساوات کی بات کرتا ہے دوسری جانب خود ہی مساوات کے اصول کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے سب برابر ہیں۔ تمام انسان برابر ہیں لیکن شریعت کا گہری نظر سے جائزہ لیجیے تو تمام انسان تو کیا تمام مسلمان بھی برابر نہیں ہیں۔ عشرہ مبشرہ، سابقون الاولون، ان کے درجے الگ ہیں۔ صحابہ میں پہلا درجہ حضرت ابوبکرؓ کا ہے باقی تمام صحابہ کا درجہ ان سے نیچے ہے۔ مرد چار شادی کرسکتا

ہے۔ عورت صرف ایک، مرد طلاق دے سکتا ہے، عورت طلاق نہیں دے سکتی۔ یہ مساوات کی نفی ہے۔ باپ بیٹے کو قتل کر دے تو قصاص میں اسے قتل نہیں کیا جا سکتا، مشرکین منافقین اہل کتاب برابر نہیں ہیں۔ ان میں بھی فرق ہے، اہل کتاب بھی برابر نہیں ہیں۔ ان میں عیسائیوں کو اسلام نے یہودیوں پر فضیلت دی ہے۔ پورا اسلام مساوات کے اصول کے خلاف کھڑا ہے لیکن مولوی یہی کہتا ہے کہ اسلام میں مساوات ہے۔ حالانکہ میراث میں بھی مساوات نہیں ہے عورت حکمران نہیں ہو سکتی۔ امام نہیں ہو سکتی قاضی نہیں ہو سکتی۔ پورا قرآن عدم مساوات پر مبنی احکامات سے پُر ہے لیکن مسلمان جھوٹ کہتے ہیں کہ اسلام نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مساوات مہیا کی۔

۲۲۔ طلاق کا اسلامی قانون دنیا کا سب سے ظالمانہ قانون ہے۔ بس تین مرتبہ طلاق کے الفاظ ادا کر کے ایک عورت کی پوری زندگی کو سیاہ رات میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے بہترین اور عادلانہ نظام ہے۔ یہ کون سا عدل ہے کہ مرد کی زبان کی ایک جنبش عورت کی قسمت کا فیصلے کر دے اور اس کے خلاف کسی عدالت میں اپیل نہ ہو سکے۔ دنیا ابھی تک اندھیرے میں ہے۔ دنیا عورت کے معاملے میں آج بھی تعصب میں مبتلا ہے۔ دنیا کی کوئی عدالت بشمول اسلامی عدالت عورت کو متوقع طلاق کے خلاف حکم امتناع (stay order) جاری نہیں کرتی۔ ہر طلاق مؤثر ہو جاتی ہے۔ بس کچھ جرمانے، کچھ فوائد عورت کو مل جاتے ہیں مگر کوئی قانون اسلامی یا غیر اسلامی مرد کو طلاق کی تلوار استعمال کرنے سے نہیں روک سکتا۔

۲۳۔ اسلام سے پہلے لوگ فطرت کی پرستش کرتے تھے۔ پہاڑ، دریا، ندی نالے، سمندر، طوفان، بجلی، چاند، سورج، انسان ان کی پرستش کرتا تھا، ان کو خدا سمجھتا تھا۔ ان سے اپنی قسمت کے فیصلے وابستہ کرتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے انسان کا رشتہ فطرت کی پرستش سے توڑ کر خالقِ فطرت کی پرستش کی طرف جوڑ دیا۔ اسلام نے تسخیرِ کائنات کا انقلابی تصور دے کر انسان کو فطرت کی غلامی سے نجات دے کر اسے فطرت پر غلبہ و

تسلط قائم کرنے کی غیر معمولی قوت عطا کی۔مغرب کا انقلاب تسخیر کائنات اسلام کے تصورِ تسخیر کے باعث ہی ممکن ہوا۔مغرب اسلام کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔

۲۴۔ اسلام نے وحدت آدمیت، وحدت انسانیت، اخلاقیاتِ عالم، عدل عالمگیری کی بات کی ہے۔ یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر پوری دنیا متحد ہوسکتی ہے۔ان اصولوں پر کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔دعوت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ گفتگو مشترکات سے اختلافات کی طرف جانی چاہیے جو کچھ ہمارے درمیان طے شدہ احکام مشترکہ، عالمگیر، متفقہ اخلاقیات کے اصول ہیں بحث یہاں سے شروع ہونی چاہیے پھر تفردات، تنوعات کی طرف جانا چاہیے۔قوموں کے درمیان جو کچھ مشترک ہے، اس نقطۂ اشتراک سے گفتگو کا آغاز ہونا چاہیے۔تمام ادیان عالم برحق ہیں۔ وہ سب خدا آخرت اور اعمالِ صالحہ کی طرف بلاتے ہیں۔ان میں کوئی فرق نہیں۔فرق صرف طریقہ کار کا ہے اصول کا نہیں ہے۔ وحدت مذاہب عالم ہی اس وقت تمام عالمگیر مذہبی اختلافات کو طے کرنے کا طریقہ ہے سب مذاہب حق ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔الحق کا دعویٰ ہی تمام جھگڑوں کی بنیاد نہیں۔امن ہی دین کا مقصد ہے لیکن اگر دین کے کسی عقیدے نظریے کے باعث امن عالم منتشر ہو رہا ہے تو اس کو ترک کرنا دین اسلام کا تقاضا ہے بین المذاہب مکالمے کے ذریعے ہی تمام مذہبی اختلافات کو حل کیا جا سکتا ہے ورنہ تیسری عالمگیر جنگ مذہبی بنیادوں پر لڑی جائے گی کیونکہ ایران انقلاب کے بعد دنیا بھر میں تمام مذاہب کو نئی قوت ملی ہے اور یہ قوت تیزی سے تصادم کی طرف جا رہی ہے۔

۲۵۔ دنیا میں سب سے پہلے انسان آیا پھر اسلام آیا انسان پہلے ہے مذہب بعد میں ہے۔ انسانیت کو مذہبیت پر ایک درجہ برتری حاصل ہے۔ انسانیت کے سامنے اسلامیت مسلمانیت ثانوی نوعیت کی چیز ہے۔(اگر ان میں سے ایک کو قربان کرنا پڑے تو کس کو قربان کیا جائے گا اسلام کو یا اپنے آپ کو؟)

۲۶۔ عالم اسلام میں قرآن کی پہلی سائنسی تفسیر شیخ طنطاوی جوہری نے ۲۶ جلدوں میں لکھی۔

عالمِ اسلام میں اس نوعیت کا کام آج تک نہیں ہوسکا۔ یہ تفسیر اپنے موضوع پر سند ہے۔ اس میں تصاویر بھی ہیں شیخ کی پیروی میں ترکی میں بدیع الزماں نورسی نے رسائل نورسی کے ذریعے سائنس اور قرآن اور اسلام کے مابین تطبیق پیدا کرنے کے لیے ہزاروں رسائل لکھے لہٰذا ترکی میں آج قرآن اور اسلام کی سائنسی تشریحات اور تفسیر کا کام بہت بلند پایہ طریقے سے ہورہا ہے۔ ترکی کے روشن خیال دانشوروں کا خیال ہے کہ قرآن کی تفسیر ہر بیس سال کے بعد بدل جانی چاہیے۔ کیونکہ ذرائع اور وسائل علم بھی بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا بدلتے ہوئے حالات میں تفسیر کو بدلنا عہد حاضر کے ذہن کو اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک تفسیر جواہر القرآن کے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ مفتی عبدہ، سر سید احمد خان اور جمال الدین افغانی نے سائنس کی عظمت سے اسلام کو روشناس کرایا اب یہ علمی قافلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ عالم مغرب مسلمان ہونے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ مسلمان سائنسی تفسیر و تشریح کے ذریعے مغرب کے منطقی و عقلی اذہان کو قائل کردیں کہ اسلام قرونِ وسطیٰ کا فراموش شدہ سبق نہیں۔ عہد حاضر کا جیتا جاگتا مذہب ہے۔ علمی سطح پر قرآن کی حقانیت جدید علمی سائنسی منطقی، عقلی طریقوں سے ثابت کردی جائے تو مغرب پورے کا پورا اسلام کے دائرے میں آسکتا ہے۔ مغرب کا انسان عقلی و منطقی ہے۔ لہٰذا اس کی عقل کو خطاب کرنا ضروری ہے۔ علماء نقل کے ذریعے خطاب کرتے ہیں اور عقل کو اہمیت نہیں دیتے۔ لہٰذا ان کی بات عقلی مذہب والوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن کا طرزِ استدلال صرف عقلی ہے۔ وہ تعقل تدبر تفکر کے ذریعے عقلی اسلوب کو ترجیح دیتا ہے۔ علماء اس اسلوب کی پیروری نہیں کرتے۔ عقل خود پیغمبر باطن ہے۔ نقل پر اصرار مغرب کے لیے قبول حق میں حجاب اکبر ہے۔ اسے اُٹھانے کی ضرورت ہے۔

۲۷۔ باقی مسلمان اپنی درخشاں تاریخ سے خود واقف نہیں۔ اگر وہ اسلامی تاریخ کی عالیشان ترقیاں، ایجادات، آلات، برتن، کھانوں، محلات، عمارتوں، فنون، علوم عقلیہ کو صحیح

طریقے سے مغرب کے سامنے پیش کردیں تو مغرب یقین کر لے گا کہ اسلام کو قبول کر لینے کے بعد بھی ایک عالیشان مادی تہذیب وتمدن کے امکانات قطعاً معدوم نہیں ہوتے بلکہ اسلام کے آنے سے مادی فتوحات کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ خود قرآن نے اہلِ کتاب سے خطاب میں بار بار کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کو قائم کرتے تو رزق زمین و آسمان سے ابلتا۔ یعنی حضرت سلیمانؑ کی طرح کی عظیم الشان مادی کامیابیوں سے معمور سلطنت قائم ہو جاتی۔ لہٰذا عظیم الشان تہذیب وتمدن والی سلطنت قائم کرنا سنت انبیاء ہے جو حضرت سلیمان کی سلطنت کی طرح ترقی یافتہ ہو۔ قرن اول کو ایک بدویانہ، دہقانی کوہستانی معاشرہ بیان کرنے کے باعث مغرب میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ اسلام اصل شکل میں آئے گا تو۔ قرن اول کے پسماندہ، نہایت سادہ تہذیب وتمدن نبوی معیارات کو اختیار کرے گا۔ یہ تمدن عہد حاضر کے کسی انسان بلکہ ولی اللہ کے لیے بھی قابل قبول نہیں کوئی دل پنکھے، گاڑی، موبائل، اے سی کے بغیر رہ سکتا ہے۔ قرن اول تو خود ترقی یافتہ معاشرہ تھا۔ اسے دہقانی معاشرہ سمجھنا سادہ لوحی ہے۔ ہمارے مؤرخین کی غلطی ہے۔

۲۸۔ حضور ﷺ صحابہ سے مشورے کے لیے انہیں مسجد نبوی میں بلاتے تھے۔ یہ دنیا کی پہلی پارلیمنٹ تھی۔ حضور ﷺ حضرت زبیرؓ اور حضرت امام ابوحنیفہ لوگوں کی امانتیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ یہ دنیا کے پہلے تین بینک تھے۔ سوق عکاظ میں بولیاں لگتی تھیں۔ فتح مکہ کے بعد بھی یہ بازار قائم رہا۔ یہ دنیا کا پہلا اسٹاک ایکسچینج تھا۔ جس کا عالمی اجتماع دنیا کی پہلی انٹرنیشنل کانفرنس تھی، خانہ کعبہ کے طواف کے لیے دوڑنا پہلی میراتھن ریس ہے۔ اذان دنیا کی پہلی ایڈورٹائزنگ انڈسٹری تھی، عاقلہ کا نظام دنیا کی پہلی انشورنس اسکیم تھی، مواخات کا نظام دنیا کا پہلا کوآپریٹو سسٹم تھا، بیعت دنیا کا پہلا بیلیٹنگ نظام تھا، زکوٰۃ، صدقات، رشتہ داروں کی کفالت کا نظام دنیا کا پہلا سوشل سیکورٹی نظام تھا۔ مسجد دنیا کا پہلا کمیونٹی سینٹر کیپٹل ہیڈ آفس تھا، صفہ کی درس گاہ دنیا کی پہلی یونیورسٹی تھی، صفہ کی

درسگاہ میں پڑھنے والے دنیا کے پہلے پی ایچ ڈی اسکالر تھے، ازواج مطہرات دنیا کی پہلی خواتین پروفیسرز تھیں جو امت کے تمام لوگوں کو علم دین مہیا کرتی تھیں اور ان معلّمین کا کسی مرد سے نکاح حرام تھا کیونکہ استاد کی حیثیت باپ و ماں کے برابر ہے۔ استاد کو یہ مرتبہ دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں ملا۔

۲۹۔ مسلمانوں نے علوم عقلیہ میں دلچسپی نہیں لی، وہ فقہ تصوف اور کلام میں الجھے رہے کفار ہم سے آگے نکل گئے۔ ایک جانب مسلمان اسلام کو جمہوریت کے عظیم الشان مظہر کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن مستشرقین کے خیال میں تاریخ ایک دوسری تصویر پیش کرتی ہے۔ دو خلفائے راشدین رسالت مآب ﷺ کے سسر اور دو خلفائے راشدین آپ کے داماد تھے۔ پانچویں خلیفہ آپ کے نواسے، چھٹے خلیفہ آپ ﷺ کے سالے، ساتویں خلیفہ آپ کے سالے کے بیٹے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز حضرت عمر کے نواسے یعنی رسالت مآب کے سسر کے نواسے۔ بظاہر جمہوری نظام زندگی میں تو یہ نظام ممکن نہیں۔ مستشرقین کے اعتراضات کی توجیہ یہ ہے کہ عرب صرف قریش کی اطاعت قبول کرنے کے عادی تھے کہ قریش کو وہ کعبہ کا متولی سمجھتے تھے اور ان کی قیادت میں مجتمع ہونا ان کے لیے فطری طور پر ممکن تھا۔ لہٰذا اس تاریخی سبب کے باعث جمہوریت کے پودے کو پنپنے میں کچھ وقت لگا۔ ورنہ اسلام کا مزاج آغاز سے ہی سراسر جمہوری ہے۔ لہٰذا بظاہر غیر جمہوری رویے لوگوں کو اسلامی تاریخ میں اس لیے نظر آتے ہیں کہ وہ عرب کے تاریخی تناظر کو نظر انداز کر کے اسے امریکہ، برطانیہ پر قیاس کر لیتے ہیں۔ تجزیے کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ جمہوری انقلابات دنیا میں جہاں آئے خواہ وہ لبرل جمہوریت ہو یا روس چین کی طرح سنٹرلائزڈ ڈیموکریسی ہو امریکہ برطانیہ یورپ روس چین کے تمام انقلابات کروڑوں لوگوں کے خون بہانے کے بعد آئے۔ جمہوریت اور خون کا پرانا ساتھ ہے۔ اسلام نے خون بہائے بغیر قبائلی نظام کو اختیار کر کے اس کی بنیاد میں جمہوریت رکھ دی۔ اسی مصلحت عامہ اور وسیع تر حکمتِ عملی کے تحت حضرت ابوبکرؓ کے

سوا امت کسی کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ یہی بات رسالت مآب ﷺ نے کہی۔ اسی لیے ان کو خلیفہ نامزد کرنے سے انکار کیا۔ یہی جمہوریت کا حسن ہے۔ اگر عرب میں قبائلی نظام نہ ہوتا تو جمہوریت کی موجودہ شکل جس کا آغازہ اسلام نے کیا تھا۔ اسی وقت اپنی اصل شکل الیکشن اور پارلیمنٹ میں ظاہر ہو جاتی لیکن جمہوریت کا بیج جو اسلام نے بویا اپنی فطری رفتار سے بڑھتا ہوا اٹھارہویں صدی کے جمہوری انقلاب کے ذریعے اپنی حقیقی ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہوا۔ ایک بیج اپنے اندر درخت بننے کے پورے امکانات رکھتا ہے لیکن اس امکان کے اظہار میں وقت لگتا ہے۔ یہ تدریجی ارتقائی عمل تھا۔ قرآن کا نزول اسی تدریج وارتقاء کے تحت ہوا ہے۔ شراب کا حکم، روزے میں رعایت کا خاتمہ، میراث کے حتمی احکام، زنا کی سزا کی قطعی شکل یہ سب تدریج کے طریقے پر آتے گئے اسی لیے رسالت مآب ﷺ نے حضرت عائشہ کے استفسار پر بناءِ کعبہ کے حوالے سے ان کے سوال پر یہی جواب دیا تھا کہ میری قوم نے ابھی اسلام قبول کیا ہے لہٰذا کعبہ کی بنیاد کو اصل صورت پر قائم کرنا حکمت کے خلاف ہے۔ جمہوریت کی حکمت کا بیج اپنی ارتقاء یافتہ شکل میں اٹھارہویں صدی میں ظاہر ہوا یہ اسلام کا کمال ہے۔

۳۰۔ جدید سائنسی انقلاب نے اسلام کے مذہبی انقلاب کے دنیا بھر میں برپا ہونے کے وسیع امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی انٹرنیٹ، کمپیوٹر، موبائل، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا، پریس کے نتیجے میں مسلمان اپنا پیغام دنیا کے ہر گھر، ہر دروازے اور ہر فرد تک اس کی مرضی کے بغیر بھی کسی وقت پہنچا سکتے ہیں۔ یہ سہولت تاریخ کے کسی دور میں کسی پیغمبر کو میسر نہیں تھی۔ مسلمان ان سہولتوں سے فائدہ نہیں اُٹھا رہے وہ ان عظیم الشان ذرائع کو دین کے فروغ کے لیے استعمال کرنے سے جھجک رہے ہیں۔ پاکستان میں اَسّی (۸۰) ٹی وی چینل ہیں۔ ان چینلوں کے ذریعے ہم پاکستان کے سوفی صد لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں دین کا پیغام ایک ایک فرد تک خود بخود نہایت مؤثر طریقے سے جمالیاتی حسن کے ساتھ پہنچ سکتا ہے مگر پیغام پہنچانے والے نہیں ہیں، اخبار، رسالے،

میڈیا، SMS ہر ذریعہ دین کے پیغام کو پہنچانے کے لیے نہایت مؤثر ترین ذریعہ ہے بشرطیکہ اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ کارٹون، ڈرامے، فائن آرٹس، فلم کے ذریعے بھی ہم دین کی محبت وعظمت ہر شخص کے دل میں بٹھا سکتے ہیں مگر ہم نے ان تمام ذرائع ابلاغ کو حلال وحرام، صحیح، غلط کے چکر میں مشکوک بنا دیا ہے۔ میڈیا کا انقلاب فی الاصل اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مغرب کے ذریعے اسلام کے دنیا میں برپا ہونے کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔

ع پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

۳۱۔ فقہائے کرام نے دارالاسلام اور دارالحرب کی جو تقسیم کر رکھی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ قصہ پارینہ ہے۔ اب دنیا عالمی گاؤں ہے۔ تمام اقوام عالم منشور بنیادی حقوق کی مشترکہ متفقہ دستاویز کے ذریعے ایک ہی مذہب کی پیروی کر رہی ہیں۔ پوری دنیا پر منشور بنیادی حقوق کی علمیت غالب ہے۔ لہٰذا مسلمان خواہ مسلمان ملکوں میں رہیں یا غیر مسلم ملکوں میں (کیونکہ اسلامی ممالک تو نہیں رہے۔ قومی جمہوری یا آمرانہ مسلم ریاستیں ہیں) کوئی فرق نہیں پڑتا دونوں جگہ ایک ہی نظامِ حکومت ہے۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں کے ممالک کا ماحول غیر مسلم ملکوں کے مقابلے میں زیادہ روائتی اسلامی ہے لیکن نظامِ حکومت تو پوری دنیا میں ایک ہی ہے۔ لہٰذا کون کہاں رہتا ہے کہاں رہنا چاہتا ہے، کس ملک کی شہریت اختیار کر رہا ہے یہ سب پرانی بے کار مباحث ہیں۔ ان میں وقت ضائع کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اقوام متحدہ کے قیام کے نتیجے میں پوری دنیا دارالامن دارالقرار میں بدل گئی ہے۔ سب ایک ملک سے دوسرے ملک آ جا سکتے ہیں۔ شہریت قبول کر سکتے ہیں۔ بدل سکتے ہیں۔ لہٰذا دنیا کو اسلامی اور حربی کے دائروں میں تقسیم کرنا عہد حاضر میں کارِ عبث ہے اس کی کوئی علمی عقلی شرعی اور منطقی توجیہ نہیں کی جا سکتی ان ملکوں میں عبادات رسوم ورواج کی مکمل آزادی ہے۔ دین پر عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

۳۲۔ امت اس وقت حالت اضطرار میں ہے مسلمان ملکوں میں بھی اور غیر مسلم مما لک میں بھی۔ مسلم مما لک میں روایتی اقدار باقی ہیں۔ لہٰذا اسلام پر کچھ نہ کچھ عمل ممکن ہے مگر غیر مسلم مما لک میں وہ تمام سانچے ڈھانچے لبرل ازم کے تسلط کے بعد توڑ دیئے گئے ہیں جو غیر لبرل روایتی مذہبی اقدار کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان روزگار کے لیے بیرونِ ملک جائیں۔ تاکہ اپنے ملک کی اور خود اپنے معاشی حالات بہتر سے بہتر کر کے امت کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اسلامی ملکوں سے لاکھوں لوگ کفار کے مما لک میں اسی مقصد کے تحت کثرت سے منتقل ہو رہے ہیں لیکن فقہ اسلامی معاشی ترقی کی اس اہم ترین جدوجہد میں بھی آڑے آ رہی ہے۔ یہ حرام وہ حلال یہ دارالسلام ہے۔ وہ دارالکفر ہے۔ کفار سے موالات ترک موالات کے یہ آداب ہیں، فقہی باریکیوں نے دیارِ غیر میں آباد مسلمانوں کے لیے مشکلات کا کوہِ گراں کھڑا کر دیا ہے۔ مغرب میں گھر گاڑی اشیائے ضرورت سب قسطوں پر ملتی ہیں اور سود پر ملتی ہیں، تمام مالی لین دین بینکوں کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا مغرب میں رہتے ہوئے سود سے بچنا محال ہے۔ اگر سود چھوڑ دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب میں سکونت ترک کر دیں۔ لاکھوں تارکینِ وطن کے لیے عملاً یہ ممکن نہیں لہٰذا لوگوں کی سہولت کے لیے فقہ کو لچک کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ عموماً لوگ مغرب میں حرام میں مبتلا ہونے پر مجبور بھی ہوتے ہیں تو اسے حرام ہی سمجھتے ہیں اور حالت اضطرار کی آیات سے استدلال کر کے بقدرِ ضرورت ہی حرام سے استفادہ کر پاتے ہیں، پھر احساسِ گناہ، آخرت میں ناکامی کی خلش انہیں ترقی سے محروم کر دیتی ہے۔ ساری زندگی کشمکش میں رہ کر ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ زبردست صلاحیتیں رکھنے کے باوجود وہ آگے نہیں بڑھ پاتے، ان کے دین کی عصبیت، دینی احکام، فقہی استنباطات قدم قدم پر ان کی ترقی، خوشحالی، فارغ البالی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے ان کی شخصیت کئی چہرے والی شخصیت بن جاتی ہے وہ احساسِ گناہ میں مبتلا ہو کر اپنی

فطری صلاحیتوں کا غیر معمولی اظہار نہیں کر پاتے۔ بہت سے میدان جو اُن کی فتوحات کے منتظر ہیں ان کے انتظار میں خالی رہتے ہیں اور کفار ان میدانوں میں جا کر معاشی ترقی کر جاتے ہیں اور مسلمانوں سے ہر لحاظ سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ فلم انڈسٹری، انٹرٹینمنٹ انڈسٹری، مالیاتی میدان میں مسلمانوں کے لیے ترقی کے بے پناہ امکانات ہیں مگر حلال و حرام کا مسئلہ ہر جگہ ان کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔

۳۳۔ عہدِ حاضر کا تقاضا وسیع النظری ہے مگر مسلمان ابھی اس معاملے میں بہت پیچھے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی ہے یہ بے چارے ابھی تک حلال و حرام، صحیح غلط، مسنون، مباح، مستحب، واجب، سنت، فرض کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان سب امور کی اہمیت اس وقت ہے جبکہ اسلامی ریاست ہو۔ جب ہم مغرب کے غلبے کے زیرِ اثر ہیں، زندگی خطرے میں ہے، حالتِ اضطرار ہے، عالم کفر میں اس وقت فرض مسنون واجب، احکامات پر اصرار مصلحت عامہ کے خلاف ہے۔ ہم شعب ابی طالب کے دور میں ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید حالات میں۔ کم از کم اس وقت ڈرون حملے تو نہیں ہوتے تھے۔ حالات و زمانہ بدلنے سے احکامات بدل جاتے ہیں مگر ہم ابھی تک بدلے ہوئے حالات میں شریعت کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے احکامات میں تغیر کے لیے تیار نہیں ہیں۔

خاتمہ

ان نادر خیالات میں کیا کیا فکری و نظریاتی غلطیاں ہیں ان کی وضاحت کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ جس نے ماقبل مباحث کو ذہن نشین کر لیا اس کے لیے یہ وضاحت تحصیل حاصل ہو گی۔

یہ نادر خیالات اس وقت جنم لیتے ہیں جب لوگ دین اسلام کے عالی شان قصر کو مغربی نظریات کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ جب اس خاص زاویۂ نظر سے اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو واقعتاً اسلامی تاریخ اور فقہ میں کئی طرح کی خرابیاں نظر آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے

اسلاف کی محنت کا میدان صحیح نہ تھا۔ان کا عمل وفکراور طریقہ کارِعمل ہمارے لیے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہوتا ہے۔بعض حضرات تو اپنی تاریخ پر انتہائی نادم اور اپنے اسلاف کے اقوال اور ان کی کاوشوں پر شرمندہ نظر آتے ہیں جب کفر کے پیمانوں سے اسلام کے اضلاع کو ناپا جائے گا تو اس بات کا لازمی نتیجہ نکلے گا کہ کفر جس چیز کو عالی شان سمجھتا ہے تو دین محمدی ﷺ میں بھی اس چیز کو عالی شان سمجھا جائے۔مثلاً انسانی ترقی ہونی چاہیے اس میں کسی کو اختلاف نہیں، مگر یہ واضح کرنا ہوگا کہ انسان کی ترقی کیا ہے عصرِ حاضر کی ترقی صرف اس میں سمجھی جاتی ہے کہ انسان مادی اعتبار سے مضبوط ہوگا، اس کے پاس مال وزر وافر ہوگا تب یہ ترقی یافتہ ہے۔

جبکہ اسلام انسان کی ترقی، اس کی معراج، اس کی بلندی مادے کے حصول کو نہیں قرار دیتا بلکہ اسلام بتاتا ہے کہ عبد اور معبود کا تعلق جس قدر مضبوط ہوگا انسان اتنا زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جائے گا۔نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ’’خیر القرون قرنی‘‘ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے پھر وہ جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔نبی اکرم ﷺ جس دور کو خیر القرون فرما رہے ہیں اس میں نہ تو ہوائی جہاز ہے نہ ٹرین کی سہولت میسر ہے اور نہ ذرائع ابلاغ کی موجودہ شکلیں مہیا تھیں۔بلکہ سفر کے لیے وہی گھوڑے اور اونٹ استعمال ہوتے، پیغام کے لیے قاصد روانہ کیے جاتے تو یہ زمانہ بہترین زمانہ کیسے بن گیا؟

اس زمانے میں عبد اور خالق کا تعلق انتہائی مضبوط تھا اسی زمانے کے لوگ تھے جن کے بارے میں رب کریم نے ارشاد فرمایا، اس خاص جماعت نے میرے دین پر اس طرح عمل کیا میری ایسی اطاعت وفرمانبرداری کی کہ میں ان سے راضی ہوگیا۔رضی اللہ عنہم

اور انسان جتنا جتنا اپنے رب کا نافرمان ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اپنی ترقی معراج سے دُور ہوتا چلا جاتا ہے۔حتیٰ کہ **بل ھم اضل** کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔

جب اسلام میں ترقی نام ہے، رب کی قربت کے حصول کا تو آپ خود سوچیں مسلمانوں کی محنت کا میدان قرآن وحدیث کی ترویج ہوگا یا ان کی محنت کا میدان علم ریاضی ہوگا۔اگر یہ علوم سیکھے بھی جاتے تھے تو ان علوم کو ثانوی درجہ دیا جاتا تھا، ظاہر ہے جو درجہ امام

بخاری، امام مالک اور امام ابو حنیفہؒ کو دیا جائے گا۔ الفارابی، الخوازی یا جابر بن حیان اور دیگر مسلمان سائنس دانوں کو نہ دیا جائے گا ان علوم کو مسلمان معاشروں میں ثانوی درجہ دیا جاتا تھا۔ علوم شرعیہ کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔

جب اہلِ مغرب کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ تم نے پوری اسلامی تاریخ میں نیوٹن جیسا ایک بھی سائنس دان پیدا نہیں کیا تو اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہم کہیں ہمارے پاس ابن ہیثم ہے جابر بن حیان ہے الفارابی ہے۔ بلکہ اس کا جواب یہ ہے کہ تم نے بھی ابھی تک عبدالقادر جیلانی یا امام غزالی جیسی روحانی شخصیت پیدا نہیں کی۔ مغربی فکر اور اسلام کے اہداف و مقاصد ہی الگ الگ ہیں۔ تمہاری محنت کے میدان اور ہماری محنت کا میدان اور ہے۔ ان کی نظر میں انسانیت کی معراج Freedom (آزادی) میں ہے جبکہ اسلام انسانیت کی معراج عبدیت میں بتایا جاتا ہے۔ جو کہ freedom (آزادی) کی ضد ہے۔

مغرب اپنا طرۂ امتیاز یہ سمجھتا ہے کہ ہم لوگوں کے لیے انسانی مساوات کے قائل ہیں لوگ جب انسانی مساوات کا پرکشش نعرہ سنتے ہیں تو اپنے مذہب سے بھی ایسی جزئیات پیش کی جاتی ہیں جس سے مدمقابل کو جواب دیا جاسکے کہ ہم بھی انسانی مساوات کے قائل ہیں۔

حالانکہ اسلام حفظ مراتب کا درس دیتا ہے انسانی مساوات نہیں سکھاتا اسلام جو مرتبہ والدین کا ٹھہراتا ہے وہ اولاد کا نہیں بیان کرتا۔ جو درجہ ایک نبی کا ہے وہ امتی کا نہیں ہوسکتا، جو درجہ ایک صحابی کا ہے وہ کسی غیر صحابی کا نہیں ہوسکتا، جو درجہ اسلام ایک کلمہ گو مسلمان کے لیے طے کرے گا وہ کسی کافر کو نہیں دیا جاتا، اسی طرح ہر ایک کے فرائض و ذمہ داریاں الگ الگ، ان کے درجات کے حساب سے ہوں گی ان کے حقوق و فرائض میں مساوات ہرگز نہ ہوگی۔

الغرض اسلام حفظِ مراتب کا درس دیتا ہے نہ کہ انسانی مساوات کا۔ باقی قانون کے نفاذ میں سب کے ساتھ برابری ہونی چاہیے، امیر و غریب شاہ و گدا کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے، اس کی تفصیل کی تو ضرورت نہیں ہے ہر ذی شعور شخص اور ہر مذہب و ملت میں گو عملی کوتاہیاں ہوں مگر نظریاتی طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ نفاذ قانون میں برابری

ہونی چاہیے۔

جب انسانی مساوات کو بطور فخر پیش کیا جائے تو اس کا جواب یہ نہیں کہ ہم بھی اسلام سے مساوات والی جزئیات تلاش کرنا شروع کردیں بلکہ شریعت مطہرہ کو مکمل طور پر سامنے رکھ کر جواب دیا جائے کہ اسلام تو حفظِ مراتب سکھاتا ہے، درجات متعین کرتا ہے اور اسی میں کمال ہے۔ حفظِ مراتب کی تعلیم صرف اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب حفظِ مراتب ہی سکھاتے ہیں سوائے مغربی فکر کے کوئی بھی مذہب انسانی مساوات کا قائل نہیں ہے بلکہ نفاذِ قانون میں مساوات کے قائل ہیں۔

نوٹ

میری یہ کاوش نظامِ کفر کی تفہیم کے لیے ہے کہ عصرِ حاضر میں کفر کی کیا کیا شکلیں ہیں اور کن کن نظاموں اور اداروں کے قیام میں کفر کا تخم موجود ہے اور اجتماعی طور پر یہ ادارے اور نظام ہمیں کس طرح دین سے دور کررہے ہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ اسلام کیا ہے اور یہ کس طرح کا نظام پیش کرتا ہے اور اس نظام کے عملی نفاذ کی کیا کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں اس کا جواب تو علماء امت کی جماعت احسن انداز سے دے سکتی ہے۔ بحمد اللہ ہمارے پاس قرآن وسنت کا بیش قیمت خزانہ موجود ہے ہمارا سارا ورثہ معقول ومنقول محفوظ ہے۔ اور ہمارے اسلاف کے شیریں و تلخ تجربات تاریخی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام محض نظریاتی نہیں ہے بلکہ اسلامی علمیت سے جنم لینے والا قانون ایک طویل عرصہ تک نافذ العمل رہا ہے اس کا حسن وقبح واضح ہے۔

قرآن وسنت، تاریخی تجربات، اسلاف کا طرز عمل اور تاریخ اسلامی کا مکمل دور، ہمارے سامنے ہے اسی تناظر کو سامنے رکھ کر علماء کی جماعت اس کا صحیح حل بیان کرسکتی ہے۔ اسلامی نظام کا ڈھانچہ پیش کرسکتے ہیں جو اسلامی اقدار کی حفاظت کا ضامن ہوگا اور لوگوں کو مادیت کی بجائے اللّٰہیت کی طرف لے جائے گا۔ لیکن آج ہماری کوششوں کا محور اسلامی علمیت سے اخذ شدہ نظام کو واضح کرکے پیش کرنا نہیں رہا بلکہ رائج الوقت سسٹم جس کی تخم ریزی کفریہ

نظریات پر ہوتی ہے،اسی شجر کی شاخوں کو تراش کر اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی سر توڑ کوشش کی جاتی ہے ہر عام وخاص نظام کی اسلام سے دلیل تلاش کی جاتی ہے یہ جانے بغیر کہ اصل میں وہ نظام یا ادارہ کیوں بنا تھا اس کی بنیادیں کیا ہیں۔کسی حد تک ان کی قطع و برید کر کے مسلمان مطمئن بھی ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس سسٹم کو اسلامی کر لیا ہے مگر بنیادوں میں موجود کفر یہ تخم اپنا اثر رکھتا ہے۔اس نظام کی ایک شاخ کو درست کرتے ہیں تو کئی اور شاخیں اسلام کے سانچے سے باہر چلی جاتیں ہیں۔اگرچہ ظاہری طور پر اس کی کئی طرح کی اصلاح کر بھی لی جاتی ہے نتیجتاً ایسے نظام سے نہ اسلامی تشخص باقی رہتا ہے اور نہ ہی اسلامی اقدار کی کوئی حیثیت باقی رہتی ہے۔ کیونکہ تخم اپنا اثر رکھتا ہے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم جس طرح انفرادی زندگی میں احکام الٰہی پر عمل کرنے کے پابند ہیں اسی طرح اجتماعی طور پر بھی نظامِ الٰہی کے پابند ہیں کہ اجتماعیت اللہ جل شانہٗ کے تابع ہو کر زندگی گزارے۔اجتماعیت پر دین کے نافذ کی کوشش کرنا ہمارے ذمہ فرض ہے ،اگر کوئی اس کوشش سے پیچھے رہتا ہے تو کل قیامت کے دن عنداللہ مجرم ہوگا۔

کتابیات

☆ ۔ قرآن مجید
☆ ۔ تفسیر روح البیان
☆ ۔ تفسیر جلالین
☆ ۔ مسلم
☆ ۔ ترمذی
☆ ۔ مشکوٰۃ
☆ ۔ سیرت انبیاء کرام
☆ ۔ ابوداؤد
☆ ۔ ابن ماجہ
☆ ۔ البدایہ والنہایہ
☆ ۔ مصباح اللغات
☆ ۔ القاموس الوحید
☆ ۔ المنجد
☆ ۔ لغات سعیدی
☆ ۔ نوراللغات
☆ ۔ المنجد فی الاعلام
☆ ۔ الزائد معجم لغوی عصری
☆ ۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی
☆ ۔ انسانی تہذیب کے ۵ دور

☆ ۔ تہذیبوں کا تصادم
☆ ۔ انسانی تہذیب کا ارتقاء
☆ ۔ روایات تمدنِ قدیم
☆ ۔ قدیم تہذیبیں اور مذہب
☆ ۔ تباہ شدہ تہذیبیں
☆ ۔ مغرب کے ذہنی انحطاط کی تاریخ
☆ ۔ سرسید و حالی کا نظریہ فطرت
☆ ۔ مظاہرِ حق
☆ ۔ محسن انسانیت اور انسانی حقوق
☆ ۔ تکملہ فتح الملھم
☆ ۔ اسد الغابہ
☆ ۔ تہذیب التہذیب (بیروت)
☆ ۔ سیر اعلام النبلاء (بیروت)
☆ ۔ جریدہ نمبر ۳۵۔ جامعہ کراچی یونیورسٹی
☆ ۔ البیان والتبیین
☆ ۔ جواہر الفقہ
☆ ۔ اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب
☆ ۔ فتاوٰی الشامی
☆ ۔ ہماری عظیم تہذیب
☆ ۔ اسلامی بینکاری و جمہوریت
☆ ۔ phillip.1975